بجنگ آمد

کرنل محمد خاں

بجنگ آمد

کرنل محمدؐ خاں

تقسیم کار
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

بار اول ۱۹۷۷ء

تعداد ۵۰۰

قیمت ۱۴/-

پبلشر

علی گڑھ بک ڈپو شمشاد مارکیٹ

علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

انتساب

اُن تمام سیکنڈ لفٹینوں کے نام

جو

کبھی تھے، آج ہیں

یا

آئندہ ہوں گے۔

"جہاں رہو، خوش رہو"

قولِ عارف

ترتیب

حناءِ سرِ ناخن

ضلع جہلم کے سنگلاخ، نیلے بھورے کوہستانوں میں سمٹتی اور پھیلتی ہُوئی وادی، جس میں کرنل محمد خان پیدا ہو کر پروان چڑھے ہیں، ایک خاص وضع و انداز کے "محمد خانوں" کی سرزمین ہے۔ یہ حساب تو مجھے معلوم نہیں کہ محمد خان اوّل نے کس زمانے میں اس دھرتی پر قدم رکھا تھا؛ البتہ گردشِ ایام کی رکاب تھام کر جتنی دُور بھی پیچھے کی طرف دَوڑ سکا ہُوں، ہر پُشت کا پیشہ سپہ گری نظر آتا ہے۔ زراعت میں ملی ہُوئی سپہ گری۔ اپنی مخصوص روایات میں دُھن کا یہ دَھنواں خطہ، جیالے سپاہی، جی دار کاشتکار اور جہانِ گندم و جَو کے تابدار شگوفے پیدا کرنے کے لیے صدیوں سے مشہور و ممتاز چلا آتا ہے۔ آج بھی یہاں کا ہر 'محمد خان' قریب قریب محمد خان اوّل ہی کے سانچے میں ڈھلا ہُوا نظر آتا ہے۔ وہی تندرست و توانا محمد خان جس کا ایک ہاتھ ہَل کی ہتّی پر رہتا ہے اور دُوسرا قبضۂ شمشیر پر۔ جو گبھرو ہونے پر یا علیؓ کا نعرہ لگا کر پہلے عموماً "پڑ کوڈی" کے لمبے چوڑے "پڑوں" اکھاڑوں میں دُھومیں مچاتا ہے اور پھر وردی پہن کر "ڈھول سپاہی" کے رُوپ میں وطنِ عزیز کے مقدّس پرچم کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیتا ہے۔ بانکا، جری، جیالا! ___ سخت جان و سخت کوش! ___ اگر گھروں کی پیشانی پر "ماٹو" لکھنے کا رواج ہوتا تو اس وادی کے اُونچے نیچے، کچّے پکّے ہر گھر کے دروازے

پر نظیری کا یہ مصرع مرقوم ہوتا۔ ع

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست!

مگر یہ شیر دل لوگ "ماٹو" لکھنے کے بجائے اپنے خون سے زندگی کی تاریخ لکھنے کے قائل ہیں۔ شعر و ادب کا اُفق یہاں ہمیشہ ہی سے کچھ دُھندلا دُھندلا سا رہا ہے۔ قبائے علم و ہنر یہ لوگ کم ہی پہنتے ہیں۔ پہنتے بھی ہیں تو جسم کے اُوپر نہیں پہنتے، رُوح کے اندر پہنتے ہیں۔ کرنل محمد خان، انہیں میں سے ایک ہیں۔ ماحول یا وِرثے کے اعتبار سے اِن کے ادیب بننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، مگر وہ جو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے ع

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی! —— تو ہمارے دوست محمد خان کی شخصیت کی تشکیل کو فطرت ہی کی "حنا بندی" کا معجزہ سمجھنا چاہیے۔

چنانچہ اِن کی ذات میں دو الگ الگ، لیکن اپنی اپنی جگہ پر بھرپور شخصیتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہی ہل اور تلوار والا محمد خان! کم سخن و کم آمیز! —— نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ! —— کھیت میں جُٹ جائے، تو چٹانوں سے جُوئے شیر کھینچ لائے۔ تلوار اُٹھالے تو نہنگوں کے نشیمن تہ و بالا کر کے رکھ دے۔ وطن کا مان، مِلّت کی آبرُو!

دُوسرا محمد خان وہ ہے کہ اِس سادہ مُرادے دیہاتی نام سے اُس کے ذہن و فکر کی شادابی اور بُراقی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ادیب اور انشاپرداز محمد خان ہے۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو! چمن مشرب، بہار ایجاد! —— خوش دِل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں!

مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں محمد خان ایک دُوسرے کی نفی نہیں، تائید کرتے ہیں۔ ایک دُوسرے کو کمک پہنچاتے ہیں، کیوں کہ دونوں کی جڑیں ایک ہی مٹی میں پیوستہ ہیں۔ محمد خان سپاہی ہو، کاشتکار ہو، ادیب ہو، دوست داری اور مہر و محبت میں دونوں یکساں گرم جوش ہیں۔ اخلاص و تحمل میں فرد اور انکسار کا تو یہ عالم کہ —— نہ خدا اس کے

پیچھے نہ مُڑ سامنے!

دُوسری جنگِ عالمگیر شروع ہُوئی تو ملاقہ دُمنی کا یہ نیم لفٹین اپنی روایات کے مطابق فوج کی صفوں میں شامل ہوگیا، لیکن یُونیورسٹی کی اپنی تمام تر تعلیم کے باوجود وہ ہنوز بَل اور تلوار والا مُحمّد خان ہی تھا۔ ایک مُدّت تک بصرہ اور شائبہ، بغداد اور مُوصل، قاہرہ اور طبروق میں گھُومنے کے بعد جب وہ اپنے وطن میں واپس آیا تو ایک مُحمّد خان کے جسم پر میدانِ جنگ کے تمغوں کی قطار سجی ہُوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سپاہیانہ صلابت کا وقار اور بانکپن رَوشن تھا۔ یہ وہ مُحمّد خان تھا جو اب کرنیل کی وَردی میں نظر آتا ہے، لیکن اِس عرصے میں اُس کے اندر ادیب مُحمّد خان بھی بیدار ہوکر بالغ ہو چُکا تھا۔ ادیب مُحمّد خاں الف لیلیٰ کی گلیوں اور مصر کے بازاروں اور شام کیارہ کے صحراؤں سے ایک بھرپُور سانولی سلونی اجنبی زندگی کے موتی رول لایا تھا۔ خواب، رنگ، روشنیاں، ستارے اور مُسکراہٹیں! ایک سیلابِ بہار جس میں ؎

رِند جو ظرف اُٹھالیں وُہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وُہی مے خانہ بنے

"بجنگ آمد" میں اِنہیں خوابوں، رنگوں، ستاروں اور مُسکراہٹوں کی بارات فروزاں نظر آتی ہے۔

اِس کتاب کی اِشاعت اُردُو اَدب کے اہم واقعات میں سے ہے جس وُسعت اور دِلی گرمجوشی کے ساتھ اِس کی پذیرائی ہُوئی ہے، وہ اُردُو کی بہت کم کتابوں کے حِصّے میں آئی ہے۔ مشتاق احمد یُوسفی، ابنِ انشا، سیّد عابد علی عابد، صفدر مِیر، مُشفق خواجہ اور صدیق سالک اور کتنے ہی دُوسرے اہلِ نظر اور اہلِ کمال نے جس انداز سے اس تخلیق پر داد و تحسین کے پھُول نچھاور کیے ہیں، وُہ ہر مصنّف کے لیے قابلِ رشک اعزاز ہے، مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی

"بجنگ آمد" نے اُردو ادب کو مزاح کے ایک بالکل نئے اُفق کی تازہ ہوا اور کشادہ فضا سے آشنا کیا ہے۔ یہ کتاب زندگی کے لیے بیش بہا مسرتوں کا خزینہ اپنے دامن میں رکھتی ہے کرنل محمد خان کو ظرافت تک پہنچنے کے لیے کسی "تمہید کا پُل" نہیں باندھنا پڑتا۔ نہ وہ قہقہوں کے "جزیرے" آباد کرتے ہیں۔ واقعات کی گردن میں لطائف کی بجتی ہوئی گھنٹیاں بھی وہ آویزاں نہیں کرتے۔ اُن کا لطیف اور لچکیلا مزاح اُن کے اسلوبِ تحریر کا جزو ہے، اُن کے نقطۂ نظر کی پیداوار ہے۔ ان کی ظرافت کسی دلآویز خیابان میں ہنستی، مسکراتی، گنگناتی ہوئی ندی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے اور اپنے بہاؤ کے طلسم میں کناروں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔

انسانوں کی طرح کتابیں بھی قسما قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً "بزرگ کتابیں" "نادان کتابیں" وغیرہ وغیرہ۔ "بجنگ آمد" ایک "دوست کتاب" ہے یعنی ایسی کتاب جس پر دل ٹوٹ کر آ جائے جس کے ساتھ وقت گزار کر آدمی دلی راحت محسوس کرے۔ جس سے بار بار گفتگو کرنے کو جی چاہے۔ دوست، جو خوش رُو بھی ہے، خوش مذاق بھی۔ شوخ بھی ہے اور دلنواز بھی۔ ذہین بھی اور فطین بھی، اور ہنس مکھ اتنا کہ ع جب دیکھیے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی!

یہ "بجنگ آمد" کی دوسری آمد ہے جس میں مصنف نے اپنے ترکش کے بعض نئے تیر بھی شامل کر دیے ہیں اور اس کی صوری تزئین میں ہمارے مُلک کے نامور اہلِ قلم اور "مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ" کے خوش ذوق مہتمم جناب الطاف حسن قریشی نے آسودگی خیال و نظر کا جو اہتمام کیا ہے وہ بجائے خود داد کا مستحق کارنامہ ہے۔ یہ کتاب اچھی تو تھی ہی، اب پہلے سے زیادہ خوبصورت بھی ہو گئی۔

اور اب دیکھیے کرنل محمد خان کا اندازِ گُل افشانیٔ گفتار!

۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء

سید ضمیر جعفری

۱۳۱۔ ڈی سٹلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

مقدمہ

یہ کوئی ایسی معرکہ آرا یا انقلاب آور قسم کی کتاب نہیں کہ اِس پر مقدمہ دائر کیا جائے اور دراصل مُقدمے کے بغیر ہی چھپنے جا رہی تھی کہ ہمارے ایک ٹیڑھی مزاج دوست یعان مرزا خفقان تشریف لے آئے اور مسوّدہ دیکھ کر کسی قدر طنزاً فرمانے لگے:

"تو یہ کتاب آخر چھپ کر رہے گی؟"

عرض کیا: "کوئی اعتراض؟"

بولے: "دو ہیں۔ ایک تو آپ فوجی ہیں، دوسرے آپ کا نام بھی کاشت کارانہ سا ہے۔ جب کام اور نام کا یہ عالم ہو تو لوگ بجا طور پر پُوچھ سکتے ہیں کہ آپ کو کتاب نویسی کا اشتعال کیسے آ گیا۔ یعنی کیوں نہ اس کی بجائے ایک مورچہ کھود ڈالا یا دو چار بیگھے زمین جوت لی؟"

پھر خود ہی رعایت کا اعلان کرتے ہُوئے کہنے لگے:

"چلو، تمہارا فوجی ہونا تو رَن کچھ کے صدقے معاف کیا جا سکتا ہے، لیکن نام کا کچھ علاج کرنا پڑے گا۔"

عرض کیا: "آپ کی تشخیص ہے۔ آپ ہی علاج تجویز فرمائیں۔"

بولے: "علاج آسان ہے۔ اسی نام کے آگے پیچھے یا درمیان کوئی پیارا سا اپ ٹو ڈیٹ

نام چپکالیں، مثلاً انجم۔ ارم۔ سحاب۔ سرخاب۔ سروش۔ سنتوش وغیرہ وغیرہ۔"

مَیں ابھی دِل ہی دل میں محمد سنتوش خاں کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ خفقان صاحب بولے: "لیکن پُرانے نام کی مرمّت سے بھی کیا فائدہ؟ اسے سرے سے ترک کر کے ایک دَم ماڈرن نام کیوں نہیں رکھ لیتے؟ مثلاً شمشاد عشرت۔ ارشاد شمیم۔ ریاض طلعت۔ فردوس نسیم وغیرہ۔"

خفقان صاحب تو مشورہ دے کر تشریف لے گئے، لیکن ہمیں سوچتا چھوڑ گئے اور سوچا ہم نے یہ کہ خفقان صاحب کے تجویز کردہ نام ماڈرن تو ضرور ہیں، لیکن ہیں ذرا مشکوک سے۔ یعنی اِن سے نَر مادّہ کا ہی پتہ نہیں چلتا اور چل بھی جائے، تو ہر وقت کھٹکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں اُٹھتے بیٹھتے یا انگڑائی لیتے جنس میں ہی خلل نہ آ جائے؛ چنانچہ ہرچند کہ ہمیں صنفِ لطیف کا احترام منظور ہے، بالفعل ہمیں صنفِ غیر لطیف میں ہی رہنے کا شوق ہے اور محض فیشن کی خاطر اپنا مَردانہ مستقبل مخدوش نہیں کرنا چاہتے، لیکن خفقان صاحب کے اِس سوال کا جواب دینا مُناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب لکھنے کا اشتعال کیسے آیا۔

خفقان صاحب قبلہ! وہ یُوں آیا: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میجر مسعود احمد ○ مدیر "ہلال" ◎ نے اپنے اخبار کے ایک خاص شمارے کے لیے کچھ لکھنے کو کہا۔ ہم نے جلدبازی میں نہ صرف وعدہ کر لیا، بلکہ اپنے علم و فضل کی تیز روشنی سے قارئین "ہلال" کی آنکھیں خیرہ کرنے کے لیے اپنے موضوع کا بھی اعلان کر دیا یعنی "تعمیرِ کردار میں اقتضائے بشریت کی بُوقلمونیاں"۔ لیکن بعد میں لکھنے بیٹھے تو عنوان کی تابناکی سے ہماری اپنی آنکھیں چُندھیا گئیں اور کچھ لکھ نہ سکے۔ تاریخ وعدہ قریب آتی نظر آئی، تو ہمیں غیب سے ایک ایسا موضوع سُوجھا جو ہمارے کام اور شاید نام سے بھی مناسبت رکھتا تھا یعنی یہ کہ "ہم لفٹین کیسے بنے۔"

○ اب لفٹننٹ کرنل مسعود احمد ڈائریکٹر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز۔

◎ دفاعی افواج کا ہفتہ وار مجلّہ جو اُس وقت روزنامہ تھا۔

یہ ایک طرح کا اُدبی مورچہ ہی کھودنا تھا؛ چنانچہ ہم نے دماغ اور بیٹھوں کی مشترکہ مدد سے سوچا اور اپنے زورِ قلم اور زورِ بازو کے طفیل ایک مضمون بعنوانِ "لفٹینی" لکھ ڈالا۔ جو "ہلال" میں شائع ہوگیا۔ یہی مضمون اس کتاب کا پہلا باب ہے ـــــ چند ماہ بعد "ہلال" کا ایک اور خاص نمبر چھپنے لگا تو مدیرِ "ہلال" نے پھر یاد فرمایا۔ اب کے ہم نے دیانتداری سے کام لیا اور اقبال کر لیا کہ "ہمارے پاس ایک ہی موضوع تھا جو کام آچکا ہے اور اب ہمارے اندر مزید مضمون نگاری کا مادّہ ختم ہوگیا ہے۔" لیکن جنابِ مدیر ہنس کر کہنے لگے:

"وہ موضوع ختم ہونے والا نہیں، لفٹینی سیکھنے کے بعد اُسے استعمال بھی کیا ہوگا، بس ترکیبِ استعمال پر ہی کچھ لکھ دو۔"

سوچا تو یاد آیا کہ کچھ کیا تو تھا؛ چنانچہ وہی لکھ دیا ـــــ (ملاحظہ ہو باب ۲)

اِس کے بعد نہ "ہلال" کے خاص شماروں میں کمی آئی اور نہ ہماری لفٹینی کے کارناموں میں، حتیٰ کہ جنگ ختم ہوگئی۔ اب جو دیکھا تو ہمارا اعمال نامہ مرتّب ہو چکا تھا۔ فرشتوں سے تو پہلے ہی کہاں چھپا تھا۔ اب انسانوں کی نظروں میں بھی آگیا۔ سوچا کہ اب یہ حکایت عام ہوئی ہے۔ اب پردہ کیسا؟ اِسے ایک جگہ جمع کر دو۔ آگے چل کر دائیں ہاتھ میں ملے گا یا بائیں ہاتھ میں، کم از کم وزن کا اندازہ تو ہو جائے۔

خفقان صاحب نے دو خاص اعتراضوں کے علاوہ جاتے جاتے ایک عام حکمت کا موتی بھی بکھیرا تھا کہ جس کتاب کا کوئی MESSAGE یعنی پیغام نہ ہو اُس کا چھپنا بیکار ہے۔ اب حقیقت یہ ہے کہ کتاب لکھتے وقت ہم اپنی پیغامبرانہ ذمہ داریوں سے قطعی طور پر بے خبر تھے۔ ہمارے ذہن میں تو ایک ہلکی پھلکی لفٹین بیتی تھی اور ہمیں گمان تک نہ تھا کہ ہم نسلِ انسانی کو کوئی ملکوتی قسم کا پیغام پہنچا رہے ہیں، بلکہ لکھنے کے دوران ہمیں کچھ احساس تھا تو فقط یہ کہ ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں؛ چنانچہ خفقان صاحب کے جواب میں ہمارا

فوری فیصلہ تو یہی تھا کہ ہمارا کوئی پیغام نہیں، لیکن ذرا غور کرنے پر ایک واقعہ یاد آگیا جس سے شُبہ ہونے لگا کہ ہماری کتاب شاید بالکل بے پیغام بھی نہیں۔

ہُوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست اِس کتاب کا ایک باب "ہلال" میں پڑھ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ پڑھنے کے دوران آپ ایک دو مرتبہ مسکرا دیے۔ اِس معمولی سے واقعہ سے ہم نے نیوٹن کی طرح ایک اہم نتیجہ نکالا اور وہ یہ کہ اگر یہی کیفیت ہر قاری پر گزرے تو علم ریاضی کی رُو سے لازم آتا ہے کہ مُلک میں مُسکراہٹوں کی پیداوار میں اضافہ ہو گا اور مُسکراہٹوں کا جو توڑا ہمارے مُلک میں ہے اُس کا تدارک لازم ہی ہو گا —— بیورلی نکلز (BEVERLY NICHOLS) نے اپنی کتاب VERDICT ON INDIA میں لکھا ہے کہ برِّصغیر پاک و ہند میں فی مربع میل ناخوشی دُوسرے مُلکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے؛ چنانچہ سوچتا ہوں کہ اگر اکثر خواتین و حضرات کی توجّہ دُوسرے مشاغل سے ہماری کتاب کی طرف بٹ جائے تو نہ صرف فی مربع میل ناخوشی میں کمی کا اِمکان ہے، بلکہ شاید فی مربع میل آبادی بھی گھٹنے لگے۔ بہرحال آبادی بڑھے یا گھٹے۔ کتاب کا پیغام ضرور ہے اور یہ وہی مشہور پیغام ہے جو ایک عارف افیونی نے ایک کم عارف افیونی کو صرف چار لفظوں میں دیا تھا۔ دونوں دوست ترنگ میں جا رہے تھے کہ کم عارف افیونی کنوئیں میں لڑھک گیا۔ عارف نے دوست کو غائب پایا تو چلّایا:

"کہاں ہو دوست؟"

کنوئیں سے فریاد اُٹھی: "یہاں ہُوں"

عارف نے فی البدیہہ پیغام دیا:

"اچھّا دوست، جہاں رہو خوش رہو"۔ اور آگے چل نکلا۔

یہ کتاب ایک لفٹین کی جنگ بیتی ہے۔ اِس میں تصوّف، فقہ یا علم الکلام پر دیدہ دانستہ

کوئی بحث نہیں کی گئی ۔ اِس میں صرف اُن باتوں کا ذکر ہے جو سیکنڈ لفٹیننٹوں کو اپنی زندگی، خصُوصاً جنگی زندگی میں پیش آتی ہیں ۔ سیکنڈ لفٹننٹ اکثر جوان ہوتے ہیں اور جوانوں کے پہلو میں دل ہوتا ہے ۔ وُہی دِل جو کئی بزرگوں کے پہلو میں پہنچ کر سنگ و خشت بن جاتا ہے نتیجہ یہ کہ نوجوانوں کی زندگی کے کئی زاویے بزرگوں کو چُبھتے ہیں، حالانکہ خود اِن بزرگوں نے بھی جوانی میں اِنہی زاویوں پر زخم کھایا ہوتا ہے ۔ بہرحال اُن محترمین کی خِدمت میں پیشگی گزارش ہے کہ اِس کتاب میں جہاں جنگ و جدل کا قصّہ ہے، وہاں عیش و سرور کی باتیں بھی ہیں ۔ جہاں زہد و تقویٰ کا ذکر ہے، وہاں ناؤ نوش کے قِصّے بھی ہیں ۔ جہاں رکوع و سجُود کا بیان ہے، وہاں رقص و سرود کی داستان بھی ہے اور جہاں مردانِ اصیل کے کارنامے ہیں، وہاں زنانِ جمیل کے سرنامے بھی ہیں ——— اس تمام این و آں کے باوجُود اگرچہ بظاہر اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کو غلط راہ پر ڈال دے ؛ تاہم قارئین گرامی، اگر آپ نے پچپن (۵۵) سال مکمل کر کے سرکاری طور پر بزرگی حاصل کر لی ہے، تو مُناسب ہے کہ مُطالعہ میں اِحتیاط برتیں یعنی پڑھتے پڑھتے اگر آپ کی بزرگی پر کسی قِسم کا دباؤ پڑھنے لگے، تو لازم نہیں کہ کتاب ختم کر کے ہی دم لیں، کتاب فوراً بند کر دیں ۔ خود اِس خاکسار نے بزرگوں کی لکھّی ہوئی کئی کتابیں شروع کیں، مگر دیباچے سے آگے نہ گزُر سکا اور کتاب کو اَدب سے طاق پر رکھ کر دیوانِ غالبؔ کھول لیا ——— آپ اس کی جگہ بہشتی زیور یا پکّی روٹی کا مطالعہ کر سکتے ہیں ——— یُوں بھی زندگی کی ایک منزل پر پہنچ کر غیر آزمودہ کتابیں پڑھنا ٹھیک نہیں ۔ کل کلاں اِن کتابوں سے نکیرین نے کوئی ایسا سوال پُوچھ لیا جس کا آپ سے جواب بن نہ پڑا، تو بخشش میں ناحق پیچیدگی پیدا ہو جائے گی ۔ یہ جواب سیکنڈ لفٹننٹ نسبتاً آسانی سے دے سکتے ہیں، سو اگر آپ کسی وقت فوج میں رہ چکے ہوں یا کسی فوجی سے محبّت کی ہے یا فقط صحبت ہی رہی ہے تو آپ کے لیے عُمر کی کوئی قید نہیں ۔ آپ جب چاہیں یہ کتاب بے کھٹکے پڑھ سکتے ہیں ۔ اِنشاء اللہ آپ نکیرین کے اِمتحان میں

کوئی سوال ایسا نہ پائیں گے جو سلیبس سے باہر ہو۔

اگر دیباچوں پر یقین کیا جائے تو شاذ ہی کوئی کتاب ایسی ہو گی جسے مصنف نے برضا و رغبت چھپوایا ہو۔ کتاب لکھی تو کسی نہ کسی طور جاتی ہے لیکن جب تک مصنف کے دوست رشتہ دار اور جملہ تاجرانِ کتب اُس کے پاؤں نہ پڑیں، کتاب چھپنے میں نہیں آتی بلکہ مشتاقانِ کتاب کا اصرار سال ہا سال جاری رہتا ہے، تا آنکہ مصنف آخر مروّت میں آکر ایک دن کڑوا گھونٹ پی کر کتاب چھپوانے پر راضی ہو جاتا ہے۔ قاعدے کی رُو سے 'بجنگ آمد' کی طباعت کی داستان بھی کچھ یُوں ہونا چاہیے تھی کہ جونہی کتاب کا آخری باب لکھا گیا، دوست احباب اپنا کام چھوڑ کر ہمارے آگے دست بستہ آ کھڑے ہوئے کہ خدارا اب قوم پر احسان کرو اور اسے زیورِ طبع سے آراستہ کر ڈالو۔ جواب میں ہم نے پس و پیش کیا، تو وہ ایک وفد کی صُورت مقامی ایم۔ این۔ اے کی سرکردگی میں ہمیں محضر نامہ پیش کرنے آئے۔ ایک تیز طبع دوست نے بھوک ہڑتال کر دی۔ دُوسرے نے بہر چھوڑ لیا؛ چنانچہ آخر اس ڈر سے کہ ان آبگینوں کو کہیں ایسی ٹھیس نہ لگ جائے جو قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہو، ہم نے جی کڑا کر کے کتاب چھپوانے کی حامی بھر لی —— لیکن حضرات حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایسی واردات پیش نہیں آئی۔ کتاب چھپوانے کا فیصلہ ہم نے تنِ تنہا کیا ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ اس کے چھپنے میں کسی کے چوٹ نہیں آئی۔

دیباچوں کے آخر میں ایک سکّہ بند جملہ ہوتا ہے کہ اگر قارئین نے اس حقیر کی تصنیف کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا تو فقیر کو اطمینان ہو گا کہ پُر تقصیر کی محنت رائیگاں نہیں گئی —— میرے خیال میں یہ فقیر کی چالاکی ہے، بلکہ انکسار میں لپٹی ہوئی دہشت انگیزی ہے۔ دراصل فقیر جو کچھ کہنا چاہتا ہے، یہ ہے کہ خبردار جو کتاب پسند نہ کی ورنہ انجام بخیر نہ ہو گا۔ قاریِ عالی مقام! آپ پر اس کتاب کو پسند کرنے کی کوئی پابندی نہیں۔ اگر آپ کو پسند آ گئی تو ظاہر ہے کہ آپ

معقول آدمی ہیں اور اگر پسند نہ آئی، تو بھی آپ کا قصور نہیں۔ صرف ایک بات واضح ہو جائے گی کہ آپ نہ کبھی لفٹین تھے، نہ اب ہیں اور نہ آئندہ ہوں گے۔ اور لفٹین نہ ہونا بھی کوئی بنیادی عیب نہیں۔ آپ ماشاء اللہ ٹھیکے دار ہو سکتے ہیں، جاگیردار ہو سکتے ہیں، کارخانہ دار ہو سکتے ہیں اور اگر واقعی ہیں تو ــــ اللہ آپ کی بکری زیادہ کرے ــــ آپ کتابیں پڑھیں ہی کیوں؟ کتابیں پڑھیں آپ کے منشی!

آخر میں ہمیں چند احباب کا ذکر کر لینے دیں جو اس کتاب کے محاذ پر ہمارے دوش بدوش شریکِ جنگ رہے اور ذکر کرنا ہے ہمیں:

- محمد اکرم کا جنھوں نے مسوّدہ ٹائپ کر کے ثابت کر دیا کہ بدخطی لاعلاج مرض نہیں۔
- ماجد صدیقی اور مونس زبیری کا جنھوں نے ٹائپ شدہ مسوّدے کی نہ صرف تصیح کی بلکہ تزئین بھی کر دی۔
- کرنل شفیق الرحمٰن اور میجر سیّد ضمیر جعفری کا جو فوجی ادیبوں کے سالاروں میں سے ہیں اور جنھوں نے بکمال سپاہی پروری اس ریکروٹ کی بھی رہنمائی کی اور نہ صرف فون پر کتاب کی مزاج پُرسی کرتے رہے، بلکہ ایک دو مرتبہ بہ نفسِ نفیس اس کی نبض پر ہاتھ بھی رکھا اور ازراہِ اشک شوئی فرمایا کہ صحت بُری نہیں۔
- کرنل مسعود احمد کا جنھوں نے ابتدائی اشتعال کا کفارہ اس طرح ادا کیا کہ ان بے وضع اوراق کو اپنے حُسنِ تدوین سے کتاب بنا دیا اور آپ کو پیش کرنے کی جُرأت اور رخصت بخشی۔
- مخدومی و مکرّمی ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا جن کے قدموں میں بیٹھ کر اُردو لکھنا سیکھا۔ اگر سکول میں ہمیں ایسا شفیق اور صاحبِ ذوق اُستاد نہ ملتا تو ہم دیسی صاحب بہادروں کی طرح ٹیڑھے مُنہ سے نیم غلط انگریزی بولنا تو شاید سیکھ لیتے،

لیکن اپنے قومی ادب کے ذوق سے محروم رہتے اور خدایا! کتنی بڑی نعمت سے محروم رہتے۔

○ اور عزیز قاری، آپ کا جو پڑھتے پڑھتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ اِس بات کی علامت ہے کہ آپ کے پہلو میں ایک زندہ اور جوان دل ہے۔ میں نجومی تو نہیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے لیے یہ سال اچھا ہے۔

محمد خاں

جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی
۵ ستمبر ۱۹۶۵ء

مقدمہ ثانی

جناب ناشر کا ارشاد ہے کہ "بجنگ آمد" کے چھٹے ایڈیشن کی طباعت کے موقع پر کچھ لکھوں۔

عرض ہے کہ بحیثیتِ مصنّف مجھے خوشی ہے کہ کتاب کو چھٹا ایڈیشن نصیب ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ قارئین نے اسے شرفِ قبول بخشا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی کتاب کی مقبولیت لازماً اس کی معقولیت کی سند نہیں ـــــ کئی اچھی کتابیں پہلے ایڈیشن سے آگے نہیں بڑھتیں ـــــ لیکن قبولِ عام بہرحال قدرت کا عطیہ ہے اور اس کی تحقیر کفرانِ نعمت ہے۔

سب سے بڑی نعمت جو یہ کتاب میرے لیے اپنے ساتھ لائی ہے وہ بیشمار اور بے بہا نئے دوست ہیں۔ ان میں سے کئی تو اِس قدر قریب آگئے ہیں کہ سوچتا ہُوں یہ نہ ہوتے تو زندگی کس قدر بے رنگ ہوتی۔ لیکن ہزاروں اَن دیکھے دوست بھی ہیں: وہ جو کبھی دو پیار کے لفظ لکھ بھیجتے ہیں لیکن بیشتر وہ جو کچھ کہے بغیر دل ہی دل میں یاد کر لیتے ہیں ـــــ مُجھ جیسے بے مایہ شخص کے لیے اِس سے بہتر کیا انعام ہو سکتا ہے؟ کسی غنی کے لیے بھی اِس سے بڑھ کر کیا دولت ہو سکتی ہے؟

ویسے جہاں تک کتاب کی اصل قدر و قیمت کا سوال ہے، وہ کچھ ہمارا دل ہی جانتا ہے اور یا محترمہ بیگم بھٹی کا جنہوں نے ہمیں ذیل کا خط لکھا ہے :

"محترم کرنل صاحب

آپ نے بجنگ آمد لکھ کر بڑا احسان کیا ہے۔ میرا بیٹا جاوید جو کسی کتاب کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا، اب ہر وقت بجنگ آمد میں محو رہتا ہے۔ جاوید ماشاءاللہ بڑا قابل بچّہ ہے۔ اِس سال چوتھی جماعت کا امتحان دے رہا ہے!

کیا ہی اچھا ہو اگر آپ دو چار اور ایسی ہی کتابیں لکھ ڈالیں۔ اُردو میں بچّوں کے لٹریچر کی سخت کمی ہے۔

آپ کی ممنون

بیگم بھٹی۔"

اب دوسری ماؤں سے بھی درخواست ہے کہ اپنے ہونہار بچّوں سے مشورہ کر کے اِس خاکسار کے حق میں دُعائے خیر کریں اور مناسب ہدایات جاری فرمائیں کہ اگلی کتاب لکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

محمد خاں

بُلکسر — ضلع جہلم

۱۵، نومبر ۱۹۷۲ء

۱

عشق لفٹینی و مشکلہا

ہمیں ہٹلر سے ہمیشہ شکایت رہے گی کہ اُس نے دُوسری جنگِ عظیم شروع کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ نہ کیا۔ یہ نہیں کہ ہم موصوف کو اِس کارِ خیر سے روکنے کی کوشش کرتے۔ ہم فقط اعلانِ جنگ میں دو مہینے کا التواء چاہتے تاکہ اپنی تعلیم پُوری کر لیتے؛ لیکن ہم بمشکل گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر کالج پہنچے ہی تھے کہ آپ نے ہم سے بالا بالا پولینڈ پر چڑھائی کر دی جس کا بعد میں ہمارے ذاتی پروگرام پر خاصا گہرا اثر پڑا۔

جنوری ۱۹۴۰ء میں ہر چند کہ پولینڈ اور ہٹلر کے دُوسرے ہمسائے جرمن بمباروں اور ٹینکوں کے درمیان ایسی پُرسکون زندگی بسر نہیں کر رہے تھے؛ تاہم باقی دُنیا بفضلِ خُدا خیریت سے تھی اور ہمارے اپنے مُلک، ہندوستان[1] میں تو انگریز کی برکت سے اس شدت سے اَمن برپا تھا کہ شیر بکری مع جُملہ ہندوستانیوں کے ایک گھاٹ پانی پی رہے تھے؛ چنانچہ صُلح و آشتی کے اِس خوشگوار ماحول میں کسی کو گمان تک نہ تھا کہ عین اس وقت مُلک کے ایک گوشے میں ایک اہم جنگی واقعہ کی ابتداء ہو رہی ہے، یعنی لاہور میں ایک نوجوان کالج چھوڑ کر جنگ میں کُود پڑنے پر تُل گیا ہے ——— یہ نوجوان مَیں ہی تھا۔

---

[1] اُس وقت پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

لیکن بھرتی ہونے سے نہ تو ہٹلر کی دلآزاری مقصود تھی، نہ انگریز کی دلجوئی۔ ہمارے مراسم دونوں سے دوستانہ تھے۔ ہمیں فقط لفٹین[1] بننے کا شوق تھا اور قدرت اور ہٹلر نے مل کر اس شوق کی تکمیل کا سامان پیدا کر دیا تھا؛ چنانچہ ہم نے فوج میں کمشن کے لیے درخواست دے دی۔

اُن دنوں ابھی وہ مصیبت نازل نہیں ہوئی تھی جسے آج کل سیلیکشن بورڈ کہتے ہیں؟ انٹرویو تو خیر اُن دنوں بھی ہوتے تھے، بلکہ ایک چھوڑ تین تین، لیکن نہایت شریفانہ قسم کے۔ ایک بزرگ سا جرنیل اور کچھ نیم بزرگ سے برگیڈیر اور کرنل بیٹھے ہوتے تھے۔ سامنے کرسی پر اُمیدوار کو بٹھا دیا جاتا تھا اور پھر اُس سے نہایت بے ضرر سے سوال پوچھے جاتے تھے:

آپ کا نام کیا ہے؟

تعلیم کہاں تک ہے؟

فوج میں کوئی رشتہ دار ہے؟ وغیرہ وغیرہ

اور ظاہر ہے کہ اِن سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ہر چند کہ کچھ خاندانی اسرار فاش کرنا پڑتے تھے، لیکن دماغ پر ایسا ناگوار بوجھ نہ پڑتا تھا کہ اُٹھائے نہ اُٹھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہلکا پھلکا اور خاصا مفرحِ قلب سا انٹرویو ہوتا تھا۔ اِن دنوں نہ تو اُمیدواروں کی ذہانت کی پیمائش کی جاتی تھی نہ اُن کے لاشعور کی تلاشی لی جاتی تھی۔ یہ بدعتیں چند سال بعد کی پیداوار ہیں۔

چنانچہ ہمارے دو انٹرویو جہلم اور پنڈی میں ہوئے اور ہم کامیاب رہے۔ آخری انٹرویو کے لیے حکم ملا کہ فلاں تاریخ شملہ حاضر ہو جاؤ۔ یہ سُن کر ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر آخری انٹرویو میں کامیابی نصیب ہو جائے، تو انسان فی الفور لفٹین بن جاتا ہے

---

[1] لفٹننٹ

اور باقاعدہ لفٹینی کرنے لگتا ہے ـــــ اس بات کا علم نہ تھا کہ آخری انٹرویو اور لفٹینی کے درمیان ٹریننگ کا ایک خاصا مُہلک وقفہ بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم ایک نیم لفٹینی کے عالم میں شملہ روانہ ہُوئے اور جب انٹرویو ہو چکا، تو ہمیں محسوس ہُوا کہ اَب کسی لمحے سالم لفٹین ہو گئے۔ کیونکہ انٹرویو تسلّی بخش قسم کا ہُوا تھا۔ ہم میں کوئی ایسی بُنیادی خامی بھی نہ تھی۔ تعلیم کی شرط میٹرک تھی اور ہم نے تو میٹرک کے علاوہ کافی فالتو تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ ہمارے خاندان کی فوجی خدمات کی فہرست بے شک ایسی طویل نہ تھی، لیکن ہم نے شجرۂ نسب کو تھوڑا سا کھینچ تان کر اس قدر صُوبیدار، جموں اور کپتان چچا زادوں کا اِحاطہ کر لیا تھا کہ جرنیل صاحب کو مطمئن کرنے کے بعد کُچھ بچ بھی گئے تھے۔ بہرحال یہ راز ہمارے اور خُدا کے درمیان ہی تھا۔ پولیس کی طرف سے صفائی کی بھی شرط تھی، تو ہم یُوں بھی کبھی امنِ عامہ میں مُخل نہیں ہُوئے تھے، لیکن چونکہ پولیس والے بھی آخر انسان ہوتے ہیں، لہٰذا ہم نے احتیاطاً ان کی انسانیت کا تقاضا بھی پُورا کر دیا تھا۔

شِملے سے گھر پہنچے، تو لفٹینی کے حکم کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ اِدھر چند عجلت پسند بزرگوں نے ہماری لفٹینی کے اعزاز میں پیشگی دعوتیں دینا شروع کر دیں۔ جنہیں ہم واجبی برخورداری مگر افسرانہ وقار کے ساتھ قبول کرتے رہے۔ آخر ایک دن ڈاکیہ کُھلا تار لے کر آیا اور دُور ہی سے بولا: "لفٹین صاحب، لفٹینی مبارک ہو۔"

لیکن تار پڑھا تو فقط اِتنا لکھا تھا: "تمہیں او۔ ٹی۔ ایس مھو[1] میں ٹریننگ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ۸ راگست ۱۹۴۰ء کو حاضر ہو جاؤ۔"

یہ پڑھ کر کُچھ مایوسی تو ہُوئی، لیکن پھر سوچا کہ آخر لفٹینی ہے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ یُوں اُٹھا کر بانٹ دی جائے۔ اِس کے کُچھ ادب آداب سکھانے ہوں گے، کُچھ خُفیہ گُر بتانے ہوں

[1] او۔ ٹی۔ ایس سے مُراد آفیسر ٹریننگ سکول ہے جو ابتدائے جنگ میں مھو (وسطِ ہند) میں کھولا گیا تھا۔

گے کہ لفٹینی چلائی کیسے جاتی ہے؛ چنانچہ خوشی خوشی دوستوں سے رُخصت ہوئے۔ ہر طرف سے لفٹین صاحب کہہ کر پُکارا جا رہا تھا جو ہمیں بے حد گوارا محسوس ہونے لگا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری نشست و برخاست اور لب و لہجہ سے بھی لفٹینی ٹپکنے لگی۔

ریل کے سفر کے لیے درجۂ اوّل کا ٹکٹ ملا۔ یہ بھی ہماری عالیجاہی کی علامت تھی ٹکٹ دیکھنے والے ڈِبّے میں داخل ہوتے، تو سَر کہہ کر خطاب کرتے۔ خُدا جانے اُنہیں کیسے محسوس ہو جاتا کہ یہ عام آدمی نہیں، لفٹین ہے۔ بہرحال ہم ان سے وہی سلوک کرتے جو ایک افسر کو درمیانہ درجے کے سرکاری مُلازم سے کرنا چاہیے۔ ہم سفروں میں انگریز بھی تھے۔ یہ لوگ اگر ہم سے بولنا چاہتے تو پہلے کہتے : "معاف کیجیے گا" اور پھر عرض مُدعا کرتے۔ ہمیں نہ صرف اپنی لفٹینی کا یقین ہو گیا، بلکہ اس کی بلندی کا بھی احساس ہونے لگا؛ چنانچہ دِلّی سے آگے جب گاڑی میں ہم ایسے لفٹینوں کی تعداد کافی ہو گئی، تو موضوعِ گفتگو زیادہ تر یہی رہا کہ لفٹینی اور کپتانی میں آخر فرق کیا ہے؟ اور اتفاق رائے اس بات پر ہُوا کہ معمولی فرق ہے؛ چنانچہ رتلام اور مہو کے درمیان ہمارا مزاج عرشِ مُعلّیٰ سے کچھ ہی اِدھر تھا، بلکہ کئی ایک تو دبی زبان سے یہ بھی پُوچھ رہے تھے کہ آخر ان تاریخ دانوں نے نپولین کو کیوں سر چڑھا رکھا ہے!

آخر مہو کا سٹیشن آ گیا۔ توقّع تھی کہ ہمارے استقبال کے لیے فوج کا دستہ آئے گا، بینڈ ہو گا، موٹریں ہوں گی جن کے ڈرائیور ہمارے لیے دروازہ کھولیں گے، اور با ادب باملاحظہ ہمیں اپنے بنگلوں تک پہنچا دیں گے، لیکن دیکھا تو یہاں کا بندوبست کسی قدر مختلف نظر آیا۔ استقبال کے لیے آدمی تو تھے، لیکن ان میں ایسی وافر آدمیت نہ تھی۔ گاڑی رُکی تو ہمارے ڈبّے میں ایک گورا داخل ہُوا جس کے بازو پر تین سفید دھجیاں لگی تھیں۔ آتے ہی بولا :

"اگر اس ڈِبّے میں کوئی کیڈٹ ہے، تو ابھی مت باہر نکلے۔"

ہم بیٹھ تو گئے، لیکن اس گورے کی زبان بے حد کھُردری لگی۔ علاوہ ازیں کیڈٹ کا لفظ

سُن کر کچھ تشویش سی ہُوئی کہ ہم سے کوئی دھوکا تو نہیں ہو رہا۔ لفٹین تو لفٹین ہوا، یہ کیڈٹ کیا جنس ہے؟ چنانچہ ہمیں ذرا پختہ سا شُبہ ہونے لگا کہ اِن انگریزوں نے لفٹیننی سے وصل کی کچھ خُفیہ شرطیں بھی ٹھہرا رکھی ہیں جن سے ہمیں پہلے آگاہ نہیں کیا گیا۔

جب سٹیشن دُوسرے مُسافروں سے خالی ہو گیا، تو گورا پھر آیا اور ہم سب کو گاڑی سے باہر نکلنے کا گُستاخانہ سا حکم دیا۔ باہر نکلے، تو دُوسرے ڈبّوں سے بھی تیس چالیس ہم جنس حضرات نکلتے دکھائی دیے۔ سٹیشن پر تین چار اَور گورے بھی موجود تھے۔ اِن میں سے ایک جو بظاہر سینئر تھا، اچانک چلّایا:

"سب کیڈٹ میرے سامنے قطار میں کھڑے ہو جائیں۔"

ہم نے کسی قدر حیرانی سے ایک دُوسرے کو دیکھا اور کچھ بے دِلی سے قطار بھی بنا لی۔ گورا پھر چیخا:

"دائیں سے ایک دو تین بولو۔"

ہم نے حُکم کی تعمیل تو کی، لیکن محسوس ہُوا کہ یہ سلوک ہماری شان کے شایاں نہیں۔ آخر ہم رنگروٹ تو تھے نہیں جو قطاریں بناتے پھرتے یا گنتی شروع کر دیتے۔ بہرحال ہمیں تین ٹولیوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر وہی گورا بولا:

"باہر تین ٹرک کھڑے ہیں، ہر ٹولی ایک ایک ٹرک میں سوار ہو جائے۔"

ہمیں یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کچھ بھی ہو، ہمیں ٹرکوں میں لے جانا شدید غلطی بلکہ بے اَدبی ہے، موٹر کاریں ہونا چاہیے تھیں، مگر سوچا کہ اِن معمولی ٹامیوں سے اُلجھنا ہمیں زیب نہیں دیتا؛ چنانچہ ہم نے قُلیّوں کو آواز دی کہ ہمارا سامان ٹرکوں میں ہی رکھ دیں۔ ہمارا یہ کہنا تھا کہ گورا گرج کر بولا:

"کیا کہا، قُلی؟ تُم فوجی سکول میں آئے ہو، ہسپتال میں نہیں۔ اپنا سامان خود اُٹھاؤ، ٹرکّوں

میں لا دو اور اُوپر بیٹھ جاؤ یا کھڑے رہو۔ سمجھے؟"

سمجھ تو آ گئی اور ہماری خوش فہمیوں پر کچھ اوس بھی پڑی، لیکن ہم سب نے حتی المقدور جلالی میں آ کر اس بے ادب ٹامی کو گھرے اور متفقہ غضب سے دیکھا اور کھڑے کھڑے فوجی زندگی کا پہلا فیصلہ کر ڈالا کہ جونہی لفٹین ہو گئے اس گستاخ گورے کا کورٹ مارشل کر دیں گے۔ اس دلیرانہ فیصلے پر ہر طرف سے مرحبا کی صدا اُٹھی ــــــ اس وقت ہم کورٹ مارشل کو مارشل لا کا قریبی رشتہ دار سمجھتے تھے ــــــ اور گورے کے مستقبل کو دل ہی دل میں تباہ کر کے ٹرکوں پر سوار ہو گئے۔

منزلِ مقصود کی جھلک توقعات سے بہت غیر مشابہ تھی۔ ہماری جائے قیام کے خدوخال بنگلے کی نسبت جیل سے زیادہ ملتے جلتے تھے۔ ایک سنگین بلکہ سنگدل سی بارک تھی ہنگ و تاریک اور طویل، جس کے اندر دیواروں کے ساتھ آہنی چارپائیاں پڑی تھیں اور چارپائیوں پر ہمارے ناموں کی تختیاں آویزاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہمیں جھٹکا سا لگا۔ گورا جیسے ہمارے خوف کو بھانپ گیا اور کڑک کر بولا:

"یہ تختیاں گلے میں لٹکانے کے لیے نہیں، محض تمہاری نشستوں کے تعین کے لیے ہیں۔ اب اپنی اپنی چارپائیاں ڈھونڈ لو اور اپنا سامان وہاں اُٹھا کر لے جاؤ۔"

ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ سامان اُٹھانے اور چلنے پھرنے میں چُستی دکھاؤ اور شور مت کرو۔

ہمیں یہ آخری حکم خاص طور پر ناگوار گزرا۔ ہم نے پرانے فوجیوں سے سُن رکھا تھا کہ یہ لفٹین لوگ ہر وقت گٹ پٹ گٹ پٹ کرتے رہتے ہیں۔ انہیں زبان بندی کا حکم دینا چھوٹے منہ کی بہت بڑی بدتمیزی ہے۔ ایک حضرت بولے: ان جاہل گوروں کو کیا معلوم کہ ایک لفٹین کرنے پر آئے تو کیا کچھ کر سکتا ہے، لیکن کچھ سوچنے کے بعد ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ کورٹ مارشل تک باوقار خاموشی اختیار کرنا ہی قرینِ مصلحت ہے۔

شام ہُوئی تو کھانے کے لیے MESS میں گئے۔ یہ پہلی جگہ تھی جہاں سے لفٹینی کے آثار نمایاں تھے۔ ہم سب ایک افسرانہ ٹھاٹھ سے ڈرائنگ رُوم میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مؤدب اور باوردی بیروں نے ہماری خواہش کے مطابق مشروبات پیش کیے۔ اس خوشگوار ماحول میں ہم نے سٹیشن اور بارک کے اُن ناخوشگوار واقعات کو بُھلا دیا جو اُن گھٹیا خاندان کے گوروں سے سرزد ہُوئے تھے اور ایک سرور کے عالم میں باہم گٹ پٹ گٹ پٹ کرنے لگے۔ اتنے میں دو خوش لباس انگریز اندر داخل ہُوئے۔ یہ بھی فوجی وردیاں پہنے ہُوئے تھے، لیکن ان کے بازوؤں پر تین دھجیاں نہ تھیں، بلکہ کندھوں پر پیتل کے تین تین چمکتے ستارے تھے۔ یہ افسر تھے اور وہ سارجنٹ۔ اِن کی وضع قطع، بات چیت اور طور طریقوں میں شائستگی اور وقار تھا۔ اُنہیں دیکھا تو فخر سا محسوس ہُوا کہ اصولاً ہم اور یہ افسر ایک ہی لڑی کے موتی تھے۔ آج نہیں تو کل ہمارے کندھوں پر بھی وہی جگ مگ کرتے ستارے اُبھرنے والے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ساتھ کے کمرے میں کھانے کے لیے گئے۔ انگریزی کھانے اور دیسی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے جو انگریزی اور اُردو بولنے میں ہے۔ جس طرح ایک نوآموز کی زبان سے انگریزی الفاظ یا محاورے پھسل پھسل جاتے ہیں، اُسی طرح ہمارا انگریزی "مٹر گوشت" بھی ہمارے اناڑی چھری کانٹوں کی زد میں نہ آتا تھا۔ اِدھر ہاتھوں سے کھانا خلافِ شان تھا، لیکن برضا و رغبت فاقہ کرنا بھی ممکن نہ تھا؛ لہٰذا جس طرح بولتے بولتے انگریزی جواب دے جائے تو اُردو پر ہاتھ یا زبان صاف کر لی جاتی ہے۔ اِسی طرح جہاں انگریزی چھری کانٹے سے کام نہ چلتا، ہم آنکھ بچا کر اُنگلیوں سے ہی بوٹی اُچک لیتے۔ گویا انگریزی کھانا اُردو میں کھا لیتے۔ بعض حضرات البتہ ایسے بھی تھے جو لفٹینی کے احترام میں اوزاروں کی وساطت کے بغیر کوئی چیز حلق سے اُتارتے ہی نہ تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو دیکھا کہ چھری کانٹا لیے پلیٹ میں مٹروں کا تعاقب کر رہے ہیں اور مٹر ہیں کہ

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے! قصّہ مختصر پیشتر اس کے کہ ان مومن مَردوں کو کوئی گزند پہنچتا، بیرے پلیٹیں اُٹھا کر چل دیے اور نفٹین صاحبان اپنا سا مُنہ اور چھری کانٹا لے کر رہ گئے ـــــ بعض اوقات یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ بیرا جو کچھ سامنے رکھ گیا ہے، اس کے ساتھ سلوک کیا کرنا ہے؛ چنانچہ کانی آنکھ سے اُن انگریزوں کو دیکھتے اور پیچھے اُن اماموں کے پیچھے اور کانٹے اُٹھا کر رکوع و سجود میں جاتے۔

کھانا ختم ہُوا تو اینٹی رُوم میں آئے اور کافی کا دَور چلا، لیکن تھوڑی دیر بعد دونوں انگریز کپتان اُٹھ کھڑے ہُوئے اور یہ خوشگوار مجلس برخاست ہوگئی۔ یُوں محسوس ہُوا جیسے درچشم زدن صُحبتِ یار آخر شُد۔ وہاں سے اُٹھ کر بارک میں واپس آئے، تو وہی بدزبان گورا پہلے سے موجود تھا۔ سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

"کل صبح سات سو بجے پی۔ ٹی ○ کے میدان میں حاضر ہونا ہے۔ لباس، بنیان، نکّر اور ربڑ کے جُوتے۔"

اور اتنا کہہ کر اکڑتا ہُوا چل دیا۔ گویا یہ گورا باز نہیں آرہا تھا۔ وہی حرکتیں کرتا تھا جو لفٹینی کے منافی تھیں۔

کسی نے پُوچھا: "ارے یار، یہ سات سو بجے کس بلا کا نام ہے؟"

ایک صاحب بولے: "بے معنی بات ہے۔ گورا انگریزی غلط بولتا ہے۔"

ایک فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا: "اس کے معنی ہیں صُبح سات بجے۔"

دِن بھر کے تھکے تھے۔ صُبح تیار ہوتے ہوتے ہم سے کئی ایک پی ٹی کے لیے سات بجے سے ایک دو منٹ بعد پہنچے۔ کالج میں ہم گھنٹوں دیر سے پہنچا کرتے تھے اور اگر پروفیسر صاحب کے ماتھے پر ایک آدھ ہلکی سی شکن آجاتی، تو لمحے بھر میں بغیر استری کے ہموار بھی ہوجاتی،

○ فزیکل ٹریننگ یعنی ورزش

تھی، لیکن اس گورے نے جو ہمیں ذرا دیر سے آتے دیکھا، تو کچھ اس انداز سے چلایا، گویا بھونچال آ گیا۔ رہیں اُس کی پیشانی کی شکنیں، تو ان کی اصلاح کے لیے استری کی بجائے روڈ رولر درکار تھا۔ معلوم ہوا کہ گورا محض پھٹ ہی نہیں گیا، کچھ بول بھی رہا ہے، لیکن اس کی انگریزی اُس انگریزی سے بہت مختلف تھی جو ہم نے کتابوں میں پڑھی تھی۔ گورے کے الفاظ تو خیر ہماری سمجھ میں نہ آئے، لیکن ان کی تاثیر ہمارے دلوں میں آناً فاناً سرایت کر گئی کیونکہ اس کے ہر لفظ کے ساتھ ہماری رہی سہی لفٹیننی بتدریج زائل ہو رہی تھی۔

ہم خاموشی سے قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور پی ٹی شروع ہوئی پہلے تو ہمیں میدان کے اردگرد دوڑایا گیا یعنی ڈبل کرایا گیا۔ ڈبل کے یہ معنی ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوئے) بعد ازاں چند ایسے زاویوں پر جھکنے کا حکم ملا جو فطرت کی منشاء کے سراسر خلاف تھے۔ کوئی اُدھ پَون گھنٹے کی پی ٹی کے بعد ہم تسخیرِ فطرت میں تو کسی قدر کامیاب ہو گئے، لیکن ہماری اپنی ترکیبِ عناصر میں خاصا خلل آ گیا۔

آخر پی ٹی ختم ہوئی اور حکم ہوا کہ ناشتہ کے بعد پھر یہیں حاضر ہونا ہے اور وقت نو سو تیس بجے کا ملا۔ فوجی کیڈٹ سے معنی پوچھے تو معلوم ہوا کہ صبح کے ساڑھے نو بجے مراد ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کھلا کہ یہ گورا کمپنی سارجنٹ میجر ہے جس کی نافرمانی ایک کیڈٹ کی عاقبت کے لیے سخت مضر ثابت ہوتی ہے۔

ناشتہ کے بعد جب میدان میں پہنچے، تو سارجنٹ میجر کو غیر حاضر پایا۔ گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ غیر حاضر نہیں، ہم ہی وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں۔ گویا فوجی ضبط کی پہلی خوراک ہی اس قدر زود اثر نکلی۔ صحیح وقت پر سارجنٹ میجر نمودار ہوا، تو اپنی فتح پر ذرا مسکرایا لیکن فوراً منجمد ہو گیا اور ہمیں حکم دیا کہ کوارٹر ماسٹر سٹور میں جا کر اپنے اپنے سائز کے بوٹ لے آؤ۔

بوٹ دیکھے تو محسوس ہوا کہ ہمیں پہننے کو وہ چیز دی جا رہی ہے جو گینڈوں کے پاؤں

کے لیے زیادہ موزوں ہے اور جب پہن کر دو چار قدم چلنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے نانگا پربت گھسیٹ رہے ہیں۔ فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا کہ اِن بُوٹوں کے ساتھ تو ڈرل بھی کرنا پڑے گا۔ یہ سُنا تو تمام سلسلۂ فراقِ غم سر پر آپڑا۔

دو تین دن خاکی کپڑوں کی تیاری میں صرف ہو گئے اور ٹریننگ کے سلسلے میں فقط پی ٹی ہوئی، لیکن جب خاکی یونیفارم تیار ہو گئی اور ہم نے بُوٹ پٹی پہننا سیکھ لیا، تو باقاعدہ ڈرل شروع ہوئی۔

ڈرل کے آغاز سے پہلے کپتان صاحب نے ہماری TURN-OUT یعنی یونیفارم وغیرہ کا معائنہ کیا اور معائنہ کیا کیا، گویا ہمیں خُردبین کے نیچے رکھ دیا۔ وہ عیب بھی ڈھونڈ نکالے جو درمیانہ قابلیت کا فرشتہ بھی نہ دیکھ پاتا، یا دیکھ بھی لیتا، تو نظرانداز کر دیتا۔ ہم نے ڈرل میں شرکت سے پہلے فوجی کیڈٹ کو بُوٹ، پٹی، نمبر، بٹن، بیلٹی، فلیش وغیرہ دکھائی تھی، لیکن کمپنی کمانڈر صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی جیسے پہچان لیا اور فرمایا:

"کیڈٹ نمبر ۱۵، کالر پر ایک سفید ذرّہ INCORRECTLY DRESSED

سزا: تین ○ ایکسٹرا ڈرل۔"

سارجنٹ میجر نے جو کاپی پنسل لیے کمپنی کمانڈر کے ارشادات قلمبند کر رہا تھا فوراً ہمارے اعمال نامے میں ہماری سزا کا اندراج کیا۔ کم و بیش ایسا ہی حشر ہر کیڈٹ کا ہوا۔ حتّٰی کہ بیچارے فوجی کیڈٹ بھی نہ بچ سکے جو بظاہر پیدا ہی یونیفارم میں ہوئے تھے۔

اِس کے بعد ڈرل شروع ہوئی اور خُوب تیزی اور تندی سے حکم ملنے لگے:

"سیدھے دیکھو۔ چھاتی باہر۔ ٹھوڑی اُوپر۔ بازو ہلاؤ۔ ہالٹ۔ ہلو مت۔ بکو مت

○ ایکسٹرا ڈرل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، معمولی لغزشوں کی سزا کے طور پر تپتی دوپہر کرائی جاتی تھی یعنی جب دُوسرے لوگ تفریح میں مشغول ہوتے تھے۔ خاصی عذاب ناک چیز تھی۔

اڑاؤ۔ ہنسو مت" وغیرہ وغیرہ۔

اِن سب میں "ہلومت" کے حکم پر عمل کرنا عذابِ عظیم تھا۔ سیدھے بُت بنے کھڑے ہیں کہ کان پر کھجلی محسوس ہوتی ہے۔ اَب ہاتھ کو جنبش دینا جُرم ہے۔ کندھا کان تک نہیں پہنچ سکتا۔ کان کا خود ہلنا منشائے فطرت نہیں اور وہاں تک ہاتھ لے جانا منشائے سارجنٹ نہیں۔ عین اس وقت ایک مکھّی ناک پر نازل ہوتی ہے۔ مکھّی کو فنا کرنے کی بے پناہ خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے، لیکن سارجنٹ سے آنکھ بچانا کراما کاتبین سے آنکھ بچانا ہے۔ مکھّی پر دست درازی کا خیال آتا ہے، تو سارجنٹ گویا ہاتھ ہلانے کے خیال ہی کو دیکھ لیتا ہے اور اپنی کاکنی○ انگریزی میں چلا اُٹھتا ہے: "DON'T KILL NO FLY" یعنی مکھّی مت مارو۔ ہاتھ وہیں کا وہیں رُوکھ جاتا ہے اور مکھّی نہایت اطمینان سے ناک کے نشیب و فراز کا معائنہ کرتی ہے —— ایسے اِشتعال انگیز حالات میں بے حرکت کھڑے رہنا صحیح معنوں میں نفس کُشی تھی۔ اِس وقت زندگی کی واحد خواہش صِرف اتنی ہوتی کہ کب ڈرِل ختم ہو اور جی بھر کر ناک اور کان کھجائیں اور بالآخر جب ڈرِل ختم ہوتی اور ہم بلاخوفِ تعزیر کانوں کو چھو سکتے اور مکھیوں کو اُڑا سکتے، تو ہمیں محسوس ہوتا کہ کان کھجانا اور مکھّی اُڑانا بھی کس قدر عظیم عیاشی ہے، بلکہ اِسی خوشی میں وہ آبلے بھی بھول جاتے جو اِن آہنی بُوٹوں کے اندر ہی بنتے اور پھوٹتے تھے۔

لیکن اِس بے دریغ ڈرل کا ایک پہلو ضرور تھا جس نے اِس کی درشتی کو گوارا کر دیا تھا اور وہ تھیں سارجنٹوں کی لامتناہی پھبتیاں جو وہ بے بس کیڈٹوں کی حرکات پر کَستے تھے۔ سارجنٹوں نے نسلاً بعد نسل اِس موضوع پر ایک بسیط و دلپذیر لٹریچر چھوڑا ہے جو اپنی نابکاری کی وجہ سے زیورِ طبع سے تو شاید کبھی آراستہ نہ ہو گا، لیکن اِس ادبِ عالیہ کے تلف ہونے کا

○ لندن کے غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان۔

بھی ایسا خطرہ نہیں، کیونکہ یہ شہ پارے بےشمار سپاہیوں کے توانا سینوں میں محفوظ ہیں۔ ایک دن ڈرل کرتے ہوئے میرے ساتھ کے کیڈٹ نے پھرتی سے دو تین غلطیاں کر دیں۔ تیسری غلطی پر سارجنٹ کا رنگ پہلے لال، پھر پیلا اور بالآخر نیلا ہوا۔ ایک لمحہ کے لیے جہاں کھڑا تھا، وہیں رُک گیا۔ پھر باقی دُنیا و مافیہا سے قطع نظر کرتے ہوئے خطاکار کیڈٹ کی طرف بڑھا۔ جب سارجنٹ اور کیڈٹ کا درمیانی فاصلہ صفر تھا۔ یعنی دونوں کی ناکیں چھُو رہی تھیں، تو سارجنٹ الفاظ پیس پیس کر اپنے شکار سے یُوں مخاطب ہُوا :

"مَیں جب بھی تمہیں دیکھتا ہُوں، ضبطِ تولید سراسر جائز معلوم ہونے لگتا ہے۔"

ہنسی کے بے پناہ ریلے سے ہمارے مُنہ کھُلنے ہی والے تھے کہ سارجنٹ کے مُنہ سے "ہنسو مت" کا ایٹمی دھماکہ برآمد ہوا۔ ہم نے دانت تو بھینچ لیے، لیکن ہماری اندرونی کیفیت وہ ٹائر ہی سمجھ سکتا تھا جس کے پھٹنے میں تھوڑی سی مزید ہوا کی ضرورت ہو۔

بدقسمتی سے ہم میں سے ایک کیڈٹ ضبط نہ کر سکا اور بے اِختیار کھِلکھلانے لگا۔ یہ سارجنٹ کے لیے دُوسرا چیلنج تھا۔ اَب کے ذرا بلند آواز سے مُجرم سے مخاطب ہُوا اور اُسی پُرانے مضمون کو نئے جامے میں پیش کیا :

"ذرا آپ ہی بتائیں کہ آپ نے پیدائش کی زحمت کیوں گوارا کی ؟"

کیڈٹ ذرا کھسیانا ہو کر نیچے دیکھنے لگا، تو سارجنٹ گرجا :

"اُوپر دیکھو، زمین کا معائنہ بھنگی صبح سویرے کر چُکا ہے۔"

کیڈٹ سارجنٹ کی یورش سے لڑکھڑایا اور اضطراب میں آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اِس پر سارجنٹ دُوسرے کیڈٹوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا :

"ذرا دیکھنا، اَب یہ حضرت براہِ راست خُدا سے آرڈر لینا چاہتے ہیں۔"

پھر کیڈٹ کی طرف مُڑ کر چلایا :

"میری ناک کی سیدھ میں دیکھو، خدا بست 'بلند' لیول' پر ہے۔"
پریڈ کے بعد اس کیڈٹ کا وزن خاصا ہلکا ہو چکا تھا۔

ڈرل کے بعد تمام پیریڈ پڑھائی یا پستول اور مشین گن وغیرہ کی سکھلائی کے تھے۔ اگرچہ لیکچروں کے کمروں تک جانا بھی چپ راست یا ڈبل کے تابع تھا؛ تاہم کمروں کے اندر دست و پا کی حرکات پر پابندی نہ تھی۔ مثلاً مکھی یا مچھر سے تحفظ ہمارے بس کی بات تھی۔ اِن کی ناجائز پرواز پر ہم حسبِ ضرورت ہاتھ پاؤں ہلا سکتے تھے اور فقط اِتنی سی آزادی سے زندگی میں کیف باقی تھا۔

رات کو ڈِنر پر گئے تو ذکر اس موضوع پر نہ تھا کہ ہماری لفٹینی کس مرحلے پر ہے بلکہ یہ کہ ڈرل میں کبھی ناغہ بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ فوجی کیڈٹ کے اس اِنکشاف پر کہ اِتوار کو مکمل چھٹی ہوتی ہے، بے اختیار اِس کا مُنہ چُومنے کو جی چاہا۔ جبینِ نیاز میں تشکّر کے سجدے تڑپنے لگے اور اللہ تعالیٰ کی بیکراں نعمتوں میں سے اتوار کی تعطیل کا خصُوصیت سے احساس ہونے لگا۔ اتوار کا انتظار ہم سے زیادہ کسی نے نہ کیا ہوگا۔ اب ہماری تمام تر دُعائیں چھٹیوں اور بارش کے لیے وقف ہو گئیں اور لفٹینی کی عنایت کے لیے ہم نے اللہ تعالیٰ کو کبھی مزید زحمت نہ دی۔

الغرض لفٹینی کا وہ حسین و جمیل قصر جسے ہم نے تصوّرات کے مُوقلم سے بنایا اور سجایا تھا، پہلے روز ہی منہدم ہو گیا اور یہ ابھی ابتداء تھی جو کچھ آگے ہُوا، اس کی رُوداد طویل بھی ہے اور جانگسل بھی۔ مختصر یہ کہ پہلی ڈرل میں پاؤں فگار ہُوئے تھے۔ چند روز میں رائفل ملی تو سلوپ (SLOPE) کرتے کرتے ہاتھ بھی خونچکاں ہو گئے۔ رائفل پر سنگین کا اضافہ ہُوا اور مصنوعی دُشمن کو مارنے کی مشق کرائی جانے لگی، تو تقریباً خودکشی ہو کر رہ گئی۔ میلوں بے آب و دانہ مگر پٹھو○ مارچ کیا۔ حتیٰ کہ اِن کا فرپُٹّوں کے دِل بھی موم ہو گئے لیکن کسی

○ پٹھو سازوسامان کا وہ وزنی تھیلا ہے جو مارچ کرتے وقت پُشت پر اُٹھایا جاتا ہے۔

سارجنٹ کو رِقّت نہ ہُوئی۔ مُسلسل کھدائی سے ارضِ جہلم کا سینہ شق ہو گیا، لیکن کمپنی کمانڈر کا دِل نہ پگھلا۔ کمانڈنٹ صاحب نے ہمارے کھودے ہُوئے مورچوں کے ہر خط اور زاویے کا جائزہ لیا، لیکن ہمارے زخمِ جگر کی خبر نہ لی۔ نیچ روڈ○ کے چپے چپے پر ہم نے رنجور قدموں کے نقوش چھوڑے۔ ہیما○ پہاڑی کے ہر سنگریزے پر ہم نے آبلے پھوڑے۔ ہماری ہر صبح چوبی گھوڑے پر سے کُودنے اور رسّے پر چڑھنے میں صَرف ہوئی اور ہماری ہر شام بے مرچ اور بد ذائقہ انگریزی ڈِنر کی وجہ سے حرام ہو گئی۔ ایکسٹرا ڈرل سے بچنے کے لیے ہسپتال میں داخل ہونے کی بارہا کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ دیسی کھانے کے لیے باورچی کی ہزار منّتیں کیں، لیکن بدبخت سارجنٹ کے ڈر سے راضی نہ ہُوا۔ جی چاہتا کہ اگر سارجنٹ کو نہیں تو کم از کم باورچی ہی کو قتل کر ڈالیں، لیکن اگر اس کی ہمّت بھی ہوتی، تو فرصت کہاں تھی؟

اور آخر ایک روز فرصت ملی، تو معلوم ہُوا کہ لفٹین ہو گئے ہیں!

لیکن یہ لفٹینی ہم پر دُوسرے جیسے ہی نازل نہیں ہو گئی تھی، بلکہ اس کی پیدائش کے لیے ہمیں بے چاری نرگس کی طرح پُورے نو مہینے اپنی بے نُوری پر رونا پڑا۔ چنانچہ ہم ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

○ جہلم کے نواح میں ایک سڑک ہے جس پر اکثر مارچ کیا جاتا تھا۔

○ ہیما ایک مشہور پہاڑی کا نام ہے جو جہلم سے چند میل دُور ہے اور جہاں اکثر فوجی مشقیں کی جاتی تھیں۔

۲

نزولِ لفٹینی

ٹریننگ کا چھٹا مہینہ تھا کہ سگنل کی تربیت کے لیے دس کیڈٹوں کا اِنتخاب ہُوا۔ منتخب اُمیدواروں کو ایک علیحدہ ادارے یعنی سگنل ٹریننگ سنٹر میں جانا تھا۔ شاید یہ ایکسٹرا ڈرل کا خوف تھا کہ ہر کیڈٹ نے او ٹی ایس سے جان چھڑانے کے لیے عرضی دے دی، کیونکہ اُڑتی سی خبر تھی کہ سگنل ٹریننگ سنٹر میں کیڈٹ بھی اِنسانوں میں شمار ہوتا ہے اور جب ہمارا نام دس منتخب کیڈٹوں کی فہرست میں آگیا تو باقی کیڈٹ ہمیں اِس طرح مبارکباد دینے آئے جیسے جشنِ اِستقلال کی خوشی میں قبل از وقت رہا ہونے والوں کو پس ماندہ قیدی رُخصت کرتے ہیں۔

سگنل ٹریننگ سنٹر بھی مہو میں تھا اور او ٹی ایس سے بہت دُور نہ تھا۔ جس روز ہم او ٹی ایس سے رُخصت ہُوئے ہمارے ذمّے دو چار ایکسٹرا ڈرل باقی تھیں اور ہمیں خوف تھا کہ کہیں سگنل سنٹر میں پہنچنے کے بعد بھی او ٹی ایس والے اِس اُدھار کی ادائیگی کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔ اِتفاق سے دو دن بعد او ٹی ایس کا سارجنٹ میجر سگنل سنٹر میں آنکلا اور ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہ ایکسٹرا ڈرل کا حساب چکانے آیا ہے، لیکن جب اُس نے عام اِنسانوں کی طرح ہم سے ہاتھ مِلایا اور اُسی طرح مُسکرانے بھی لگا جس طرح ہم آپ مُسکراتے ہیں، تو باور نہ

آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو قسم کھا کر کہا کرتا تھا کہ کیڈٹ خدا کی اسفل ترین مخلوق ہے لیکن ابھی ہمارے لیے آخری حیرت باقی تھی۔ جب پیار محبت کی باتوں کے بعد ہم سے رخصت ہونے لگا تو ہمیں سر کہہ کر خطاب کیا، پھرتی سے سیلوٹ کیا اور جانے کی باقاعدہ اجازت مانگی۔ یہ واقعات ہمارے لیے اس قدر غیر متوقع تھے کہ اگر اسی لمحے کوئی شہزادی ہمارے گلے میں ہار ڈال کر ہمیں خاوند منتخب کر لیتی تو ہمیں بالکل تعجب نہ ہوتا اور ہم بلاتکلف ولیعہدی شروع کر دیتے۔

بنگل سنٹر میں پہنچے تو وہ جو احترام انسانیت کی افواہیں تھیں، سچ مچ درست نظر آنے لگیں۔ تمام اُستاد ادب سے پیش آئے، لیکن چھ ماہ کی متواتر بے ادبی کے بعد ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ ہم بھی قابلِ ادب قسم کے آدمی ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ساری تعظیم ہمیں جعلی سی لگتی تھی۔ ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی جیسی نظام سقے کی اپنی مختصر سی جلالت مآبی کے دور میں ہوئی ہوگی۔ شاید ہماری حالتِ زار نظام سے بھی کچھ پتلی تھی، کیونکہ اُسے اپنا انجام معلوم تھا اور ہمیں اعتبار نہ آتا تھا کہ یہ فالتو احترام واقعی کوئی دیرپا چیز ہے یا کسی وقت یہی مؤدب انسٹرکٹر ایک ہلاکوانہ قہقہہ لگا کر ہمیں ثریا سے کھینچ کر زمین پر دے ماریں گے اور پھر ہم ہوں گے اور ایکسٹرا ڈرل! لیکن رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ اس احترام میں ملاوٹ نہ تھی اور یہ کہ ہمیں مرتبے کا احساس قصداً دلایا جا رہا تھا۔ وہی احساس جو او ٹی ایس میں ہمارے دماغ سے نچوڑ لیا گیا تھا۔ اُس وقت کہ ہم تازہ تازہ شہری زندگی سے فوج میں آئے تھے وہی صحیح تھا اور اَب کہ افسری کے دروازے پر دستک دے رہے تھے ہمیں افسرانہ انداز سکھائے جا رہے تھے۔

لیکن ہم اپنے اُستادوں کی نسبت اپنے انگریز ہم جماعتوں سے وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو زندگی بھر نہ سیکھا تھا۔ جماعت میں ہم بیس کیڈٹ تھے، دس دیسی اور دس انگریز۔ یہ

انگریز ہندوستان میں انگریزی فرموں کے مُلازم تھے اور جبری بھرتی کے قانون کے تحت تربیت کے لیے آئے ہُوئے تھے۔ یُوں تو ہم سب برابر تھے، لیکن جماعت میں اِن انگریز طلباء کا کاروبار ہم دیسیوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ جماعت میں اُستادوں کے ساتھ یوں ہمکلام ہوتے، جیسے چائے پیتے ہُوئے دوستوں کے ساتھ گفتگو کر رہے ہوں۔ اَدب ضرور کرتے لیکن خوف نہ کھاتے۔ ان سے کوئی انسٹرکٹر سوال پُوچھتا تو جواب دینے سے پہلے آرام سے پائپ کا کش لگاتے، پھر اُسے ڈیسک پر رکھتے اور پھر کُرسی پر ذرا نیم دراز ہو کر جواب دیتے اور اس انداز سے کہ اگر درست ہے تو خیر، اگر نہیں بھی تو کوئی حرج نہیں کہ یہی ہمارا نقطۂ نگاہ ہے۔

برخلاف اِس کے ہم دیسیوں کے دِل میں ہر وقت چور سا رہتا۔ جواب آتا تو جواب دینے میں بیتابی۔ اگر نہ آتا تو احساسِ جرم اور چھپنے کی کوشش۔ اُن لوگوں کی خود اعتمادی اور پختگی اُن کے کردار کا حِصّہ تھی اَور یہ غالباً اُن کی اِبتدائی تعلیم کا فیض تھا۔ ہمارا احساسِ کمتری ہماری اپنی اِبتدائی تعلیم کا عطیہ تھا۔ وہی تعلیم جس میں شاگردوں کو مُرغا بنانا اُستاد کی بہترین TEACHING AID یعنی درسی اِمداد ہے ——— یہ کہنا بجا ہے کہ ہمارے لیے نئی چیزیں سیکھنا اِتنا ضروری نہ تھا جتنا پُرانی عادتیں بُھلا دینا۔ اَور ہم میں سے وہ جو ایسا نہ کر سکے، سینئر عہدوں پر پہنچ کر بھی نابالغ ہی رہے۔ یہ نہیں کہ انگریزوں میں نالائق یا نکمّے نہیں ہوتے۔ کئی ایک کا ذکر آگے آئے گا بھی۔ نکتہ یہ ہے کہ صرف ذہین ہونا ہی کافی نہیں، کُچھ شخصیت ہونا چاہیے، کُچھ کردار ہونا چاہیے اَور وہ جو اِقبال نے کہا ہے کُچھ محفل میں بات کرنے کا شعور ہونا چاہیے۔ سچ یہ ہے کہ اِن معاملات میں ہم اِن انگریز دوستوں کو بتائے بغیر اُن کی شاگردی کر رہے تھے اَور مُرغا بنے بغیر وہ کُچھ سیکھ رہے تھے جو مکتب کی خاکبازی میں نہ سیکھ پائے تھے۔

ذکر سگنل سنٹر کی زندگی کا تھا۔ اس زندگی میں آسائش تھی لیکن خدا جانے کیا وجہ تھی کہ وہ لُطف نہ آ رہا تھا جو درشتی اَور مشقّت کے باوجود او ٹی ایس کی زندگی میں تھا۔ جب

اِس مسئلے کو اندر سے جھانک کر دیکھا تو ہم پر روشن ہُوا کہ درشتی اور مشقت ہی تو لُطف کا منبع تھے ع

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لیکن ٹریننگ سنٹر کی زندگی فقط اللہ ہُو کے گرد ہی نہیں گھُومتی تھی۔ جہاں ارجن سنگھ ایسے ہم جماعت ہوں وہاں کئی ایسے واقعات ناگزیر تھے جو دِلِ یزداں میں بھی کھٹکنے لگیں۔ ارجن سنگھ ایک قوی ہیکل اور خوش مزاج سکھ کیڈٹ تھا۔ پینا اُس کی کمزوری تھی۔ ایک شام ارجن سنگھ کو معمُول سے زیادہ بدمست پایا گیا۔ حالانکہ اُس روز میس میں ارجن سنگھ نے شراب کو چھُوا تک نہ تھا۔ دُوسرے روز کلاس میں بھی ارجن سنگھ معمُول سے زیادہ مَوج میں تھا اور کلاس کے رستے میں کوئی میخانہ بھی نہ پڑتا تھا۔ ہمارے ایک انگریز ساتھی مارٹن نے شرارتاً کہہ دیا کہ ارجن سنگھ نمبو پانی پر ہی ٹائٹ ہو گیا ہے۔ ارجن سنگھ اِس تہمت پر بزرگانہ انداز میں مُسکرا دیا۔ شام ہُوئی تو ارجن سنگھ کی مستی عروج پر تھی۔ دفعتاً اپنے کمرے سے نکلا اور ایک دُوسرے کیڈٹ کی کمر میں بازو ڈال کر ناچنے لگا۔ معمّا یہ تھا کہ ارجن سنگھ آخر کیا پی رہا ہے جو دو روز سے ہوش میں نہیں آتا؟ رقص جاری تھا کہ ہمارے کمان افسر یعنی کرنل صاحب اِدھر آ نکلے۔ دراصل وہ بھی ارجن سنگھ کی مستی کا عقدہ حل کرنے کی فکر میں تھے۔ ارجن سنگھ نے انہیں دیکھا تو اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں، بڑھا اور کرنل صاحب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچنے کی ابتدا کرنے لگا۔ لیکن کرنل صاحب نے مُسکرا کر کہا:

"ارجن سنگھ، ناچیں گے بعد میں، آؤ ذرا تمہارے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔"

ارجن سنگھ بخوشی راضی ہو گیا۔ بدستور کرنل صاحب کی کمر میں بازو ڈالے انہیں کمرے میں لے گیا اور حسبِ دستور پُوچھا کہ کچھ پئیں گے؟ کرنل صاحب یہی تو معلوم کرنا چاہتے تھے؛ چنانچہ انگریزوں کا وہ روایتی فقرہ بولے: "I WOULD LOVE IT" اِس پر ارجن سنگھ

اُٹھا، اپنا پلنگ اُلٹایا۔ نیچے دو کنستر دیسی شراب کے پڑے تھے۔ارجن سنگھ نے ایک پر سے ڈھکنا اُٹھایا اور ایک لمبا گلاس لبالب بھر کر کرنل صاحب کو پیش کیا۔کرنل صاحب ذرا جھجکے، تو ارجن سنگھ بولا:

"جھک جاؤ موتیاں والیو۔آہ وِسکی اے۔آپاں گھر بنا دنے ہاں۔"

کرنل صاحب کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا؛ البتہ اُنھوں نے ارجن سنگھ کی خوشنودی کے لیے گلاس مُنہ سے لگا لیا۔خُدا جانے ارجن سنگھ کی خانہ ساز میں کیا تاثیر تھی کہ کرنل صاحب ایک دفعہ گلاس کو ہونٹوں سے لگانے کے بعد جُدا نہ کر سکے اور پُورا گلاس حلق میں اُنڈیل لیا۔راوی یعنی ارجن سنگھ کے بیرے کا کہنا ہے کہ کرنل صاحب نے دُوسرا گلاس اپنے ہاتھوں سے بھرا اور چڑھا گئے۔کوئی آدھا گھنٹہ بعد جو نظارہ ہم باہر کھڑے ہُوئے تماشائیوں نے دیکھا، یہ تھا: کیڈٹ ارجن سنگھ اور کرنل صاحب اپنے ہاتھوں میں جامِ شراب تھامے اور بازو ایک دُوسرے کے گلے میں حمائل کیے تھرکتے تھرکتے کمرے سے باہر آتے ہیں اور ہم سے قطع نظر کیے ہوئے چل نِکلتے ہیں۔اگر کسی سے ذرا آنکھ لڑ جاتی ہے، تو نہایت چابکدستی سے جوابی آنکھ مارتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ارجن سنگھ کا بیرا سر پر کنستر اُٹھائے اُن کے پیچھے پیچھے رواں ہے۔بیرے سے پُوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کنستر کی منزل کرنل صاحب کا بنگلہ ہے۔

یہ سگنل سنٹر کی زندگی کا ایک پہلو تھا۔کام کی بھی کمی نہ تھی؛ تاہم ظاہر تھا کہ اِس ماحول میں وہ او ٹی ایس کے دنوں کے خودکشی کے منصوبے قطعاً بے جا ہیں، بلکہ یہاں کچھ اِس تیزی سے دِن کٹے کہ ایک دن لفٹیننی کا حکم آگیا اور آناً فاناً ہمارے شانے پھولوں سے جگمگا اُٹھے۔اگرچہ اِن کی تعداد بالفعل ایک پھول فی شانہ ہی تھی۔

اَب ہمیں آنے والی زندگی سے عجیب کیف محسوس ہو رہا تھا۔کورس کے خاتمے سے

چند روز پیشتر پوسٹنگ کے سلسلے میں ہم سے اپنے مرغوب سٹیشن پوچھے گئے۔ ہمارا انتخاب بالترتیب لاہور اور پشاور تھا۔ لاہور آنے کا ہمیں خاص شوق تھا کہ جس دیار کے کوچوں کی ہم نے ایک گمنام طالب علم کی حیثیت سے خاک چھانی تھی، اب اُسی خاک کو افسرانہ شان سے روندنا چاہتے تھے۔ جب پوسٹنگ کا حکم شائع ہوا تو ہمارا تقرر پشاور ڈسٹرکٹ سگنلز میں ہوا۔ لاہور نہ ملنے پر مایوسی تو ہوئی، لیکن قابلِ برداشت سی۔ پشاور کی ایک خوبی تو ظاہر تھی کہ ہمارے لیے نئی جگہ تھی۔ علاوہ ازیں جب اپنے پٹھان دوستوں سے پشاور چھاؤنی کی دلچسپیوں اور پشاور کلب کی رنگینیوں کے چرچے سُنے تو نہایت بیتابی سے رختِ سفر باندھا۔

۳

نیم لفٹین پشاور میں

اپریل ۱۹۴۱ء کی وہ صبح بھولنے کی نہیں، جب وہ چھوٹی ریل گاڑی ہم نیم لفٹینوں کی ہنستی گاتی ٹولی کو لیے مہو کے سٹیشن سے نکلی۔ معاً ہمیں وہ دِن یاد آیا جب نو ماہ پیشتر ہم اسی سٹیشن پر پہلی مرتبہ اُترے تھے اور گورے سارجنٹوں نے ہمارے پندار کی گُربہ کا روزِ اوّل ہی کام تمام کر دیا تھا، لیکن وہی گورے آج ہمیں سلیوٹوں سے رُخصت کر رہے تھے۔ ہمارا مورال ○ اس بلندی پر کبھی نہ پہنچا تھا۔ اب ہمیں کسی سے گلہ تھا نہ شکوہ۔ دُنیا کی ہر چیز حسین معلوم ہوتی تھی حتّٰی کہ مہو کے وہ مضافات بھی چلتی گاڑی سے دلفریب نظر آ رہے تھے جن سے چند مُہلک قسم کی فوجی مشقوں کی یاد وابستہ تھی۔ ہتیا پہاڑی تو ہمیں وادیٔ گنگا کی طرح محبّت کے اشارے کر رہی تھی۔

درازیٔ سفر میں ہم نے افسرانہ مستقبل کے لیے جو منصُوبے بنائے وہ زیادہ تر میس، کلب، برِج، سواری اور یُونیفارم وغیرہ کے متعلق تھے۔ یہ سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ عین اُس وقت ایک عالمگیر جنگ بھی جاری تھی جو ہمارے وطن تک اگرچہ نہیں پہنچی تھی؛ تاہم ہمارے ہزاروں ہم وطن اس تک پہنچ چکے تھے اور کئی سر دھڑ کی بازی بھی لگا چکے تھے اور یہ کہ خود ہمیں

○ MORALE حوصلے اور خود اعتمادی کے لیے فوج کا سکّہ بند لفظ

بھی کچھ اِسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا تھا، لیکن فی الحال ہم لڑائی سے مختلف سمت میں جا رہے تھے اور جنگ کا خیال قطعاً بے جا تھا: البتہ ہمارے ایک پشاوری ساتھی محاذِ جنگ پر نہ بھیجے جانے کی وجہ سے خاصے افسردہ تھے، بلکہ ٹریننگ کے دِنوں میں ہی جب ایک دن کسی مضمون میں فیل ہونے پر اُن سے باز پرس ہوئی، تو اُنہوں نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا:

"ہم فیل میل کچھ نہیں جانتا۔ ہم بنیا نہیں جو سوال نکالے۔ ہم کو لڑائی میں بھیجو، ہم بادشاہ کی خدمت کرنے آیا ہے۔"

دراصل ہمارے دوست کو تکلیف یہ تھی کہ اِن کے گھر میں ایک ڈھال اور ایک تلوار رکھی تھی اور یہ تاریخی اسلحہ اُن کی خاندان کی روایات کے مطابق بانیٔ خاندان کے استعمال میں آیا تھا۔ اگرچہ اِس بات کا تعین نہیں ہو سکا تھا کہ یہ واقعہ سکندر کے حملے سے پہلے ظہور میں آیا تھا یا بعد میں لیکن بہرحال یہ اِس امر کی صریح علامت تھی کہ آپ ایک مارشل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چنانچہ آبائی سپہ گری کے اِس تابناک پس منظر میں آپ کو یہ کسی صُورت گوارا نہ تھا کہ حُسنِ اتفاق سے جنگ جاری ہو (یعنی خُدا نے ان کے لیے دادِ شجاعت دینے کے تمام اسباب پیدا کر رکھے ہوں) اور وہ راولپنڈی جیسے دارالامان کو بھیج دیے جائیں۔ چنانچہ تمام راستے ان کا مارشل خُون کھولتا رہا اور ہم سے الگ غُصّے میں WARLIKE STORE ○ بنے بیٹھے رہے جہلم سے پشاور تک سب ساتھی درمیانی سٹیشنوں پر اُتر گئے اور گاڑی سرِ شام پشاور پہنچی۔ ہمارے استقبال کے لیے دو افسر موجود تھے۔ دونوں انگریز۔ اُن دِنوں دیسی افسر ابھی گنتی کے تھے ـــــ دیسی افسروں کی تھوک بھرتی کسی قدر بعد میں شروع ہوئی۔ جب جاپان نے جنگ میں کُود کر آگ سی لگا دی اور وہی لفٹینی جو ہم نے خونِ جگر سے حاصل کی تھی، سرِ راہ بٹنے لگی ـــــ اَب اِستقبال کو تو یہ دو انگریز آ گئے تھے، لیکن اُن کا طرزِ تپاک

○ سامانِ جنگ کے لیے فوجی اِصطلاح

کچھ ایسا تھا جسے دیکھ کر دل جل تو نہ گیا، لیکن جھلس ضرور گیا۔ پھیکی سی مزاج پرسی اور بس —— پھر کار میں بٹھا کر ہمیں خارج از بحث سمجھ کر گپیں ہانکنے لگے۔ گویا پچھلی سیٹ پر انسان نہیں، بستر رکھا ہے۔

سگنل آفیسرز میس میں پہنچے، تو ہمیں اپنا کوارٹر دکھایا گیا۔ ایک اُمیدوار بیرا شیرباز پہلے ہی سے انتظار میں بیٹھا تھا کہ آنے والا صاحب بے بیرا ہو تو شاملِ خدمت ہو جائے۔ ایسا ہی ہُوا، وقت کم تھا ہم نے ڈنر کے لیے کپڑے بدلے۔ چونکہ میس میں جانے کے لیے پہلی شب کا معاملہ تھا، اپنی "ٹرن آؤٹ" کی نوک پلک خاص طور پر سنواری اور اِس سلسلہ میں شیرباز کے ماہرانہ مشوروں سے اِستفادہ کیا کہ وہ مقامی رسوم سے باخبر تھا اور سالہا سال کی بیراتپ○ کے طفیل اِن معاملات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔

مَیس میں پہنچے، تو معلوم ہُوا کہ بدیاتی ہم سب سے پہلے آگئے ہیں۔ انٹی روم کے زیبائشی سامان کو دیکھنا شروع کیا۔ پاس ریڈیو پڑا تھا۔ ایک سگنل افسر کو کہیں ریڈیو نظر آ جائے، تو بقول شخصے اُسے چھیڑنے کا "پنگا"◒ ضرور لیتا ہے۔ ہم نے بھی لیا۔ سُوئی اتفاقاً لاہور کے سٹیشن پر جا رُکی جہاں سے کوئی غیرتِ ناہید ڈھولک کا گیت گا رہی تھی "ٹاہلی دے تھلّے بہہ کے" ہم اِس کے شعلے کی لپک میں آ گئے اور مَیس و مافیہا سے غافل ہو کر پاس کے صوفے پر بیٹھ کر سُننے لگے تا آنکہ باہر سے بیک وقت دو چار انگریزی آوازیں بلند ہوئیں اور متفقہ طور پر اِس گستاخ کے نام اور سَر کا مطالبہ کیا جو یہ وحشیانہ موسیقی سُننے کا ارتکاب کر رہا تھا۔

یہ چند انگریز افسر تھے جو ابھی مَیس کے بیرونی دروازے تک ہی پہنچے تھے اور اس انگریز کدے میں دیسی گانا ایک باغیانہ فعل سمجھتے تھے۔ وہ ابھی باہر ہی شور مچا رہے تھے کہ ہم

○ یہ لفظ بیرا کا پشتو ماصل مصدر ہے۔

◒ پنجابی لفظ ہے مطلب ہے خواہ مخواہ وہ کام کرنا جو نقصان کا باعث ہو۔

نے سوچا کہ یونٹ میں پہلا دن ہے۔ اپنے متعلق اوّلین تاثرات خراب کرنا قرینِ مصلحت نہیں، لہٰذا ریڈیو بند کر دینا چاہیے، لیکن کسی اندرونی آواز نے مشورہ دیا کہ ریڈیو بند کر کے تُم ان کی خوشنودی تو شاید حاصل کر سکو گے یا نہیں؛ البتّہ اپنی بُزدلی کا خاصا پُختہ ثبوت دو گے۔ چنانچہ ریڈیو کو لگا رہنے دیا، لیکن اَب سحرِ موسیقی کی وجہ سے نہیں، بلکہ تحفّظِ ناموس کی خاطر۔

انگریز افسروں کا خیال تھا کہ کسی نوکر نے مَیس خالی دیکھ کر گانا لگا رکھا ہے لیکن جب اندر داخل ہُوئے اور مُجھے ریڈیو کے پاس بیٹھے دیکھا تو سمجھے کہ سچ مچ غدر کی ابتداء ہو رہی ہے۔ ذرا رُکے اور پھر ان میں جو ایمپائر کا سب سے بڑا فدائی تھا، بڑھا اور مجھ سے کہنے لگا: "خبریں نہ سنو گے؟" اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سُوئی گھما کر بی بی سی پر کر دی۔ اتفاق سے اس وقت خبریں بھی شروع تھیں؛ چنانچہ میں خاموش رہا۔

مَیں اِس مَیس میں نووارد تھا، لیکن کسی نے مجھ سے مصافحہ تک نہ کیا۔ ظاہر تھا کہ نادانستہ سہی، لیکن قصور ہم نے معرکے کا کیا ہے، جسے انگریزوں کی آئندہ نسلیں بھی مُعاف نہ کریں گی۔

بعد میں دوسرے افسر آئے۔ وہ بھی انگریز تھے، لیکن انہیں ہماری بغاوت کا علم نہ تھا۔ ان میں سے ایک جو سٹیشن سے ہمیں ساتھ لایا تھا اور ایڈجوٹنٹ تھا، ہمارے صوفے پر ہی بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ مَیں نے مَیس اور اُس کی آرائش کی تعریف کی۔ اتفاق سے سامنے ایک عورت کی تصویر آویزاں تھی۔ مَیں نے پُوچھا:

"یہ عورت کون ہے؟"

میرا یہ کہنا تھا کہ ایڈجوٹنٹ صاحب کا رنگ بدل گیا اور مُجھے ایک حیرت، ایک قہر کے عالم میں گھُورتے ہُوئے بولے:

"عورت؟ خُدا کے بندے یہ محض عورت نہیں، پرنسس رائل ہے! تمہاری سگنل کور کی کرنل کمانڈانٹ! تم واقعی 'سگنل' ہو؟"

اَب یہ واقعہ ہے کہ مجھے شہزادی موصوف کے کرنل کمانڈانٹ ہونے کا علم اور فخر ضرور تھا، لیکن یہ کہ سامنے والی تصویر اُن ہی کی ہے اِس کا مُجھے علم نہ تھا۔ اَیسے حالات میں انگریزوں میں معذرت کا ایک معروف فقرہ دُہرایا جاتا ہے اور سارا گلہ دُھل جاتا ہے۔ ہم نے بھی یہی عمل کیا، لیکن گلہ دھلنا تو کجا، اِس انگریز کے چہرے پر سیم اور تھور کی نوع کی علامات پیدا ہونے لگیں اور اِن آثار کے زائل کرنے کا طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہُوا تھا۔ ناچار چُپ ہو کر بیٹھ گیا۔

ہمارے لیے یُونٹ کی ابتدا یقیناً اچھّی نہیں ہُوئی تھی، لیکن اَب ہو بھی کیا سکتا تھا دِل کو سمجھایا کہ دیکھو میاں! اِس مُلک میں جب تک ہمارا واسطہ انگریزی اَونٹ سے ہے، کوہان تو ہوگا۔ باقی رہیں مَیس کی پہلی رات کی وارداتیں، تو اِن سے پریشان ہونا لفٹین کی شان نہیں۔ مَیس کے باہر بھی بیسیوں کام ہیں ان میں قابلیت کا سکّہ بٹھایا جا سکتا ہے اور ٹُوٹے ہُوئے دِل جڑ بھی سکتے ہیں ـــ وَیسے اِس شب کھانے کے دوران اُن کے جُڑنے کا کوئی اِمکان نظر نہ آیا، بلکہ ایک پلیٹ ہمارے ہاتھ سے ٹُوٹتے ٹُوٹتے بچی۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریڈیو، تصویروں، پلیٹوں غرض ہر چیز نے ہمارے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ فقط ایک شخص جو بائیں جانب میز پر بیٹھا تھا، ہم سے کسی قدر گرمجوشی سے باتیں کرتا رہا۔ وہ ولایت سے تازہ تازہ آیا تھا اور ایک دیسی کا انگریز کی خاطر لڑنا احسان سمجھتا تھا۔ یہ لفٹننٹ وائٹ تھا۔ جان وائٹ کی مُلاقات اُس شب کے ناگوار حادثوں کے بعد منہ میں گویا میٹھا ذائقہ چھوڑ گئی۔

دُوسرے دن کمان افسر سے مُلاقات ہوئی۔ خیال تھا رات کی لغزشوں کی صفائی طلب کریں گے، لیکن نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ ایڈجوٹنٹ صاحب نے البتہ اعلانِ جنگ واپس نہیں لیا تھا۔ دانت پیس پیس کر ہمیں اپنے نئے فرائض کے متعلق حُکم سنایا اور نتیجتہً ہم ایک ایسے سیکشن کے افسر یا فوجی زبان میں او سی (.O. C) مقرر ہُوئے جس کا کام پہاڑی توپ خانے کو مواصلات بہم پہنچانا تھا۔

اِس سیکشن میں اِنسان تھوڑے تھے اور گھوڑے اور خچر زیادہ۔ طبیعت پہلے تو کچھ برہم ہوئی۔ لیکن جب مَیں اپنے سیکشن میں پہنچا اور اِن لوگوں سے مُلاقات ہُوئی تو ایمان تازہ ہوگیا۔ یہ سیکشن تمام تر پنجابی مُسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یہ سُن کر کہ ایک دیسی افسر پہلی دفعہ اوسی مقرر ہُوا ہے، اِن لوگوں نے اِس خلوص سے میرا خیر مقدم کیا کہ مَیں انگریزوں کی رنجش بھول گیا۔ سینئر عہدیداروں نے نہایت شوق سے مجھے سیکشن کا سامان دکھایا اور جوانوں کے علاوہ تمام گھوڑوں اور خچرّوں سے تعارف کرایا۔ جی ہاں! اِن سب کے اپنے اپنے نام تھے، اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی شخصیتیں! اِس پہلی ملاقات پر سیکشن کے لوگ جس محبّت کا اظہار کر رہے تھے، وہ خود اِس سے کہیں زیادہ محبّت کیے جانے کے قابل تھے اور میرے دل میں یہ عہد مستحکم ہو رہا تھا کہ اِن لوگوں کی توقعات کو کبھی تشنہ نہ رہنے دوں گا۔

اُس شام جب میں مَیس میں گیا تو انگریز اگرچہ بدستور کھچے کھچے سے تھے لیکن میرے دل میں ایک ایسا اطمینان تھا جسے انگریزوں کی ناراضگی نہیں چھین سکتی تھی اور ہمارا مقاطعہ ایسا مکمّل بھی نہ تھا۔ جان وائٹ ہم سے غیر معمولی تپاک سے بغلگیر ہُوئے اور ریڈیو کی طرف اشارہ کرکے بولے: "ذرا اپنے مُلک کا گانا تو سناؤ۔" پھر ہنس کر بتایا کہ آج دن بھر تمہارے پنجابی گانا سُننے اور پرنسس رائل کی تصویر کو نہ پہچاننے کے متعلق بحث ہوتی رہی۔ سارجنٹ لوگوں نے تو تمہارے خلاف کمان افسر تک شکایت پہنچا دی، لیکن اُلٹی اُن کو تنبیہہ ہُوئی۔ مَیں نے پُوچھا: "سارجنٹ لوگ کون؟" تو کہنے لگا: "یہی تُم سے لڑنے والے افسر۔ یہ سب پہلے سارجنٹ تھے، اور اگر لڑائی نہ چھڑتی، تو اس وقت بھی سارجنٹ ہی ہوتے۔" بہرکیف ہم نے کسی قدر فاتحانہ انداز سے اِن لوگوں کی طرف دیکھا۔ انتقامی جذبے پر قابُو پاکر ریڈیو کو تو نہ چھیڑا لیکن جان وائٹ کی فرمائش پُوری کرنے کی خاطر مُنہ سے ماہیے کی ایک کلی گنگنا دی اور جان نے اپنی تحسین کے اظہار کے لیے والہانہ تالی بجادی۔

وائٹ سے اَب ہماری گاڑھی چھننے لگی۔ دُوسرے انگریزوں سے بھی ہمیں تو کچھ بَیر نہ تھا؛ البتّہ وہ ذرا خفا سے تھے اُور وائٹ کی حرکتیں اِس خفگی میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں۔ وائٹ دراصل ایک اچھے گھرانے کا تعلیم یافتہ اور رَوشن خیال نوجوان تھا۔ کیمبرج سے تعلیم اَدھوری چھوڑ کر آیا تھا۔ اُسے اپنے تلفّظ کا خاص طور پر خیال تھا اور باقی انگریز افسروں سے نہایت اہتمام سے نفرت کا اظہار کرتا تھا، کیونکہ اُن کی زبان اور تلفّظ گرامر کی پابندیوں سے بے نیاز تھے۔ اِن کے پاس فقط دس بارہ فحش مگر چُست اور جامع سے الفاظ تھے جن سے وہ اپنا تمام تر مافی الضمیر ادا کرتے تھے۔ یہ الفاظ کسی ڈکشنری میں نہیں ہوتے؛ یہ صرف سارجنٹ لوگوں کے یہاں سینہ بہ سینہ چلا کرتے ہیں۔ وائٹ کی اپنی زبان بیشک کلچر کی آئینہ دار تھی، لیکن جو چٹخارا سارجنٹوں کی مرصّع زبان میں تھا، اُس سے بھی اِنکار مشکل ہے۔

یُونٹ میں کوئی پندرہ دن گُزرے تھے کہ اچانک ہمارے کمان افسر کا تبادلہ ہو گیا۔ اُن کا جانا تھا کہ ہمیں ایڈجوٹنٹ نے طلب کیا اور حکم دیا:

"تم آج اَٹھارہ سو بجے (یعنی شام چھ بجے) کی گاڑی سے بنّوں جاؤ گے اور وہاں سے آگے ٹوچی کالم میں جا کر شامل ہو گے جو اِس وقت فقیر ایپیؔ کے خلاف وزیرستان میں دتا خیل کے مقام پر مصروفِ جنگ ہے۔ وہاں تُم لفٹننٹ ٹامؔ کو فارغ کرو گے۔"

جب وائٹ کو ہمارے تبادلے کا علم ہُوا تو بھاگا بھاگا آیا اور بولا:

"یہ ٹام بھی سارجنٹ ہے۔ اِس کے نہ ہونے سے اِن لوگوں کی برج کی چوکڑی نامکمّل تھی۔ صِرف کمان افسر کے کہنے پر تمہیں یہاں رکھا گیا تھا، ورنہ پہلے ہی دن فقیر ایپیؔ کی خدمت میں بھیج دیے جاتے۔"

اَٹھارہ سو بجے ہم بنّوں جانے والی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ فرنٹیئر کی لڑائیوں میں بَیرا ساتھ لے جانے کی اِجازت ہوتی ہے؛ چنانچہ شیر باز ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اس سے

پہلے بھی اپنے کئی انگریز صاحبوں کے ساتھ سرحدی معرکوں میں شریک ہو چکا تھا عام لوگوں کو علم نہیں کہ ان سرحدی لڑائیوں میں بھی دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ شیر باز سے باتوں باتوں میں معلوم ہُوا کہ اس کا ایک انگریز صاحب قبائلیوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا شناختی کارڈ اور دو کان واپس ملے تھے۔ ہمارے اطمینان کے لیے شیر باز نے اتنا اضافہ کیا کہ "تم فکر مت کرو، وہ مسلمان کا لاش خراب نہیں کرتے۔"

ادھر سیٹی بجی اور گاڑی بنوں کو روانہ ہُوئی۔

۴

کوہستانِ جنگ

بہرے شیر باز نے ہمیں انگریزوں کے مقابلے میں رعایت تو کافی دی تھی کہ مرنے کے بعد ہمارے کانوں کی بے حُرمتی نہیں کی جائے گی، لیکن قبائلیوں کی اِس اسلامی رَواداری کے باوجود ہمیں زندہ رہنا کچھ بہتر ہی معلوم ہوتا تھا۔ یوں بھی ہمیں ایک انگریز کو برج کے لیے فارغ کرنے کو بھیجا جا رہا تھا۔ کوئی شہادت کا معاملہ تو تھا نہیں کہ ہم گاڑی میں داخل ہوتے ہی سر بکف ہو جاتے؛ چنانچہ بالکل عام آدمیوں کی طرح سفر کیا۔ عام آدمیوں کی طرح بھیجنے والوں کو کوسا اور رات کو وہی متوقع خواب دیکھے کہ کان غائب ہیں۔

دُوسرے روز بنّوں ٹرانزٹ کیمپ میں پہنچے۔ منزلِ مقصود تو میراں شاہ سے آگے دتا خیل تھی جہاں ہمارا برگیڈ (ٹوچی کالم) فقیر ایپی سے لڑنے کے لیے بڑھ رہا تھا لیکن بنّوں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آگے جانے کے لیے R.O.D. ○ یعنی سڑک کھُلنے کے دِن کا انتظار کرنا پڑے گا جو ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ آتا تھا۔ اِس وقفے میں شیر باز کو اتفاقاً علم ہو گیا کہ ہمیں چالاکی سے ٹام کی جگہ بھیجا جا رہا ہے۔ شیر باز اس پر بہت برہم ہُوا۔ مجھے پشتو نہیں آتی تھی لیکن ٹام کے حق میں جو خاردار سی پشتو اُس کے مُنہ سے نکلی، ظاہر تھا کہ قصیدے کی قِسم کی چیز نہیں؛ البتہ اُردو میں

○ ROAD OPEN DAY

شیر باز نے ہمیں اتنا کہا کہ "صاحب آپ کے ساتھ ٹگی (ٹھگی) ہو گیا ہے، ہم اس کا علاج کرے گا اور تم کو واپس پخادر بیجے گا۔" (پشاور بھیجے گا)

یہ تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ شیر باز فوجی احکام میں ترمیم کیسے کرائے گا، لیکن شام کے کھانے کے لیے میس کو جانے لگا، تو شیر باز ایک ہی تکے کبابوں سے لبریز پلیٹ لے کر آ نکلا۔ کسی انگریزی میس کے رستے میں ایک دیسی افسر کے لیے تکے کبابوں سے بہتر کوئی روڈ بلاک نہیں؛ چنانچہ اس رات ہم میس سے غیر حاضر رہے۔ اس کے بعد شیر باز نے ہر کھانے سے پہلے تکے کباب کھلانے کا معمول بنا لیا۔ اسی طرح ہفتہ گزر گیا اور سڑک کھلنے کا دن آ گیا۔ صبح کانوائے جانا تھا۔ رات شیر باز آیا، تو میں نے کہا:

"شیر باز، وہ پخاور کی واپسی کیا ہوئی؟"

شیر باز کسی قدر جھنجھلا کر بولا:

"ہم نے تم کو اتنا تکا کباب کلایا (کھلایا) خو تم ناجوڑ ہی نہیں ہوتا۔"

شیر باز کی سکیم کا اندازہ مجھے پہلا تکا کھا کر ہی ہو گیا تھا؛ چنانچہ میں نے اسی حد تک زبان درازی کی تھی جو باعثِ فساد نہ ہو۔"

اگلے روز علی الصبح ہمارا کانوائے روانہ ہوا اور ہم پر پہلی مرتبہ آر او ڈی کے اسرار فاش ہوئے۔ واقعہ یوں ہے کہ ان دنوں قبائلی علاقے میں سفر کرنے سے پہلے قبائلیوں کے چند اعتراضات رفع کرنا پڑتے تھے۔ بدقسمتی یہ لوگ اپنے اعتراضات کے اظہار میں زبانی فصاحت یا بلاغت کے قائل نہ تھے، بلکہ سرے سے زبان کا استعمال ہی نہ کرتے تھے۔ مثلاً آپ موٹر میں جا رہے ہیں اور اچانک کہیں سے ایک گولی آپ کے ٹائر میں بطورِ اعتراض آ لگتی ہے یا چلتے چلتے اپنے رستے میں پل غائب پاتے ہیں اور دو چار ذرا خونخوار قسم کے معترضین آپ کے استقبال کے لیے آ وارد ہوتے ہیں جو بلا تکلف آپ کو موٹر سے نکال کر آپ کا روپے پیسے

اور کپڑوں کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں۔ آپ میں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کر لیتے ہیں اور اس کے لیے آپ سے کلمہ پڑھوانا بھی ضروری نہیں سمجھتے پھر اگر آپ ہندو ہیں تو فی الفور آپ کی جمکتی اور نروان کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور اگر مسلمان ہیں تو آپ کو صوم و صلوٰۃ کی مسلسل آسانی بہم پہنچانے کے لیے ایک غار مہیا کیا جاتا ہے جہاں صوم کا ثواب تو زیادہ تر میزبان ہی کو پہنچتا ہے؛ البتہ صلوٰۃ کا اجر آپ کی اپنی چیز ہے۔ اس خیال سے کہ آپ کی عبادت میں خلل واقع نہ ہو، آپ کو شکم پُری سے خاص طور پر محفوظ رکھا جاتا ہے تا آنکہ آپ کے رشتہ دار یا حکومت آپ کو روپوں میں تول کر واپس لے جاتی ہے یا پھر وہی گردن تراشی کی نوبت آتی ہے۔

آر۔ او۔ ڈی ایسے اعتراضات کا جواب تھا۔ جس روز قبائلی علاقے کی سڑکوں سے کسی رسد کے کانوائے یا فوج کے کالم کو گزرنا ہوتا تھا، سڑک کے دونوں طرف پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہماری فوج چوکیاں جما لیتی تھی تاکہ سڑک پر آمد و رفت بغیر اعتراض جاری رہے۔ محافظ دستوں کے لیے چوکیوں پر بیٹھنا کوئی پکنک کی قسم کی چیز نہ تھی کیونکہ دوسروں کی نسبت یہ لوگ معترضین کی گولیوں اور خنجروں سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والے اگرچہ محفوظ ہوتے تھے؛ تاہم اُن کے مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے بھی اِکّا دُکّا گولی کہیں سے آ ہی نکلتی تھی۔

ہمارا کانوائے روانہ ہوا۔ سڑک کے دونوں طرف حفاظتی دستے اور بکتر بند گاڑیاں موجود تھیں۔ اِن میں سے اکثر سکاؤٹ اور ملیشیا کے لوگ تھے جن کے انگریز افسروں نے مزری کی شلواریں پہن رکھی تھیں اور سر پر کلّہ دار پگڑیاں تھیں؛ کیونکہ اِس علاقے میں کسی سر کا انگریزی ہیٹ کے نیچے سلامت رہنا کسی قدر غیر یقینی تھا۔ ٥

میراں شاہ، جہاں ہمارا بریگیڈ فروکش تھا، پہنچے تو ٹام پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُونچا، پتلا، لال اور لمبی مُونچھوں والا۔ بالکل ٹام! لیکن نہایت خوش مزاج۔ مجھے دیکھتے ہی بولا:

"تو اِن بدمعاشوں نے تمہیں برج کی خاطر نکال مارا ہے۔ تُمہارا اپنا قصُور ہے، تمہیں
برج آنا چاہیے تھی۔"
ٹام کی صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔ تواضع کے بعد اُس نے حسبِ معمول اپنے
سیکشن کے جوانوں، گھوڑوں اور خچروں سے تعارف کرایا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سُرنگ گھوڑے
کے متعلق ٹام کے تعارفی الفاظ خاصے لرزہ خیز سے تھے اور مجھے اس سے ذرا دُور سے ہی
مزاج پُرسی کی ہدایت کی گئی۔ اِس گھوڑے کا رجمنٹل نمبر ۲۲ تھا۔
ٹام دُوسرے روز سیکشن ہمارے حوالے کر کے پشاور چل دیا اور ہم اپنے برگیڈ کے
ساتھ دتاخیل کو روانہ ہُوئے۔ دتاخیل افغانستان کی سرحد کے قریب واقع ہے اور فقیرایپی
کی جائے سکُونت یعنی گرویئنت سے قریب ترین برطانوی پوسٹ تھی۔ فقیرایپی کا قُرب
حاصل کرنے کے لیے ہمیں پُل صراط کی قسم کے مقامات سے گزرنا پڑا۔ ہر چند کہ پہاڑوں کی
چوٹیوں پر ہماری فوجیں پہرہ دے رہی تھیں تاہم سڑک کے بعض حصّے ایسے قبائلی نشانہ بازوں
کی زَد میں تھے جو خود تو چٹانوں کی اوٹ میں ہماری گولیوں سے محفوظ تھے، لیکن اُن کی گولیوں
اور ہمارے سروں کے درمیان ہَوا کے سوا کچھ نہ تھا۔ اِس کا جواب ہمارے پاس ایک ہی تھا
کہ کلمہ شریف پڑھیں۔ سڑک کا وہ حِصّہ نہایت تیزی سے عبُور کریں اور باقی معاملہ خُدا کے سپُرد
کردیں۔ اس ٹکڑے کو عبُور کرتے ہُوئے ہم نے اچھے خاصے سنجیدہ بزرگوں میں سنجیدگی کی تمام
علامتیں غائب ہوتے دیکھیں۔

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

البتہ وہ ٹکڑا عبُور کرنے کے بعد ان میں تمام تر بزرگانہ تمکنت عود کر آئی۔
ہم سے پہلے گزرنے والوں میں سے ایک دو آدمیوں کو گولی لگی، پھر ہمارے سیکشن

کی باری آئی جو پچیس تیس آدمیوں اور اتنے ہی جانوروں پر مشتمل تھا۔ اِس ٹکڑے پر قدم رکھنے سے پہلے نائیک حیات محمدؐ نے دُعا مانگی کہ" یا اللہ، ہم سب کو بچا اور ہم سے قُربانی لینا ہی ہے تو ہم گھوڑا نمبر ۲۲ پیش کرتے ہیں کیونکہ اِس کا علاج کچھ تیری ذات ہی کر سکتی ہے۔" معلوم ہوتا ہے نائیک حیات محمد کی دُعا اللہ تعالیٰ تک خطِ مستقیم میں جا پہنچی، کیونکہ چند منٹ بعد تمام سیکشن بخیر و عافیت پار تھا، سوائے گھوڑا نمبر ۲۲ کے جس نے سینے پر گولی کھا کر اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دی اور اپنے این سی او (NCO) کی لاج رکھ کر فوجی ضبط کی مثال قائم کر دی۔

دتا خیل کی پوسٹ (چھوٹا قلعہ) ایک خاصے کھلے میدان میں واقع ہے جس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں۔ ہمارے برگیڈ نے پوسٹ کے قریب ایک وسیع دائرے میں ڈیرے ڈالے۔ دائرے کی مختلف قوسوں میں ایک معروف قاعدے کے مطابق مختلف یُونٹوں کو جگہ دی گئی اور دائرے کے اردگرد جو پستہ قدسی حفاظتی دیوار تھی اِس کی مرمّت کی گئی۔ اَب اگلے روز فقیر اپیی کے خلاف جنگ آزما ہونا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب چار و ناچار ایک دو روز میں جاں بحق ہو جائیں گے۔

سرحدی جنگوں کا انداز کچھ نِرالا سا ہوتا ہے۔ ہر روز ایک معرکہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی لشکر کے جمع ہونے کی خبر سُنتے، تو اُس کی گوشمالی کے لیے جاتے۔ کبھی دُشمن کے گاؤں کو گھیرے میں لے کر اُس کے مکان اور برُج تباہ کرتے۔ کبھی سڑک بنانے کے لیے جاتے اور کبھی آر۔ او۔ ڈی کے لیے۔

پہلے دِن ایک لشکر کی تباہی کے لیے مُنہ اندھیرے ہمارا کالم کیمپ سے نِکلا۔ پلٹن، رسالہ، توپ خانہ، سب کے سب خاموش؛ خوف کا سا عالم۔ جاں بحق ہونے کا شدید احساس! آخر میدانِ کارزار میں پہنچے تو اپنے آپ کو چند دُوسرے افسروں کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر پایا۔ ہم سے ذرا نیچے ہماری پلٹن اور توپخانے نے مورچے سنبھال رکھے تھے۔

اس سے نیچے نالہ تھا اور نالے سے پار کی پہاڑی پر دُشمن تھا۔ فضا بدستور خاموش تھی۔ ہم اپنی دُوربینوں سے دُشمن کی حرکات دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ایک تنکا نہ ہلتا تھا۔ دفعتہً سکُوت ٹوٹا اور آواز آئی:

" ٹھک ٹھُوں "

یہ گویا قبائلی گولی کی SIGNATURE TUNE ⭘ تھی۔ جُونہی دُشمن کی کمین گاہوں اور سمت کا اندازہ ہُوا، ہماری طرف سے مشین گنیں دندنانے لگیں۔ توپیں گرجنے داغنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا دُشمن صفحۂ ہستی سے نابُود ہو جائے گا، لیکن جُونہی ہمارا فائر بند ہوا پھر وہی ٹھک ٹھُوں شروع ہو گئی۔

رہا ہمارے جاں بحق ہونے کا سوال، تو وہ کچھ پیدا نہ ہو رہا تھا کیونکہ اتفاق سے ہم اتنی بلندی اور فاصلے پر تھے کہ دُشمن کی گولیوں کی زد سے باہر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جٹانوں پر بے فکر اوٹ کیے بیٹھے، دُوربین آنکھوں سے لگائے، میدان جنگ بلکہ کوہستانِ جنگ کا معائنہ کر رہے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ جہاں تک ہم بالانشینوں کا تعلق تھا، پہلے دن کی جنگ اتنی ہی خطرناک ثابت ہُوئی، جتنا سینما میں جنگی فلم دیکھنا۔ لیکن ہمارے ساتھی جو دُشمن کی گولیوں کی زد میں تھے ایسے خوش قسمت نہ نکلے۔ شام کو پتہ چلا کہ اس دن ہمارے تین جوان مارے گئے

قبائلی معرکوں کا سب سے دردناک سین وہ ہوتا تھا جب قبائلیوں کے مکانوں اور بُرجوں کو گرایا یا جلایا جاتا تھا۔ آیئے یہ منظر دیکھیں:

ندی کے کنارے سبز اور لہلہاتے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو آج کل بالکل خالی ہے۔ سب مرد، عورتیں اور بچے پہاڑوں میں جا بیٹھے ہیں۔ کچے لیکن صاف ستھرے مکانوں میں قفل پڑے ہیں۔ وہ سامنے بڑی محرابوں والا مکان ہے جس کے

⭘ شناختی سُر

ساتھ ایک بلند و بالا اور دلکش سا بُرج ہے۔ یہ غالباً گاؤں کے ملک کا مکان ہے۔ حفاظتی فوج کی آڑ میں سفر مینا کے چند دستے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ کبھی کسی خاص شریر آدمی کا مکان اور کبھی گاؤں کا گاؤں زمین کے برابر کر دیتے ہیں۔ بڑے بُرج کا گرنا ایک نظارہ ہے جس پر ہر ایک کی آنکھ لگی ہُوئی ہے اور جونہی اِس کی بنیادوں میں بارُود کا دھماکہ ہوتا ہے چشم زدن میں وہ سرو قامت بُرج چکنا چُور ہو کر ایک بے معنی سا ملبہ بن جاتا ہے۔

——— لیکن قبائلی اِس حرکت پر کچھ بے جا طور پر مشتعل نہ ہوتے۔ وہ اِسے بھی جنگ کا ایک حصّہ سمجھتے۔ دن کو اُن کے مکان مسمار کیے جاتے، لیکن رات کو وہ لوگ آتے، اپنی فصلوں کو پانی دیتے، ہل چلاتے اور مکانوں کا گرنا گویا ایک موسمی حادثہ سمجھتے اور دوبارہ تعمیر کر لیتے۔

اُدر بازار سے لے آئے اگر ٹُوٹ گیا!

اگر کسی دن کوئی اپریشن نہ ہوتا، تو قبائلی تفریحاً ہی کچھ ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ ایک مرتبہ ہمیں ہفتہ بھر کیمپ سے باہر جانے کا اتفاق نہ ہُوا۔ ایک دن تو قبائلی خاموش رہے، لیکن دُوسرے روز اِس پھیکی زندگی سے تنگ آکر اُنہوں نے غروب آفتاب کے وقت ہمارے کیمپ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں اور اس وقت تک خاموش نہ ہُوئے جب تک گولوں گولیوں کی جوابی بارش نہ برسا دی گئی۔ ایسی کمیاب رونق مہیا ہونے سے بظاہر اُن کی تشفی ہو گئی، کیونکہ پھر وہ آرام سے سو گئے۔

اِس کے بعد ہر روز سرِ شام پہاڑ کے کسی کونے سے مصرع طرح کے طور پر ایک قبائلی گولی آ نکلتی اور یہ شعر گوئی اس وقت تک جاری رہتی جب تک جواب میں ایک پُوری غزل پیش نہ کر دی جاتی۔

ہم میں سے اکثر سامعین کے زمرے میں تھے اور اگرچہ باہر سے آنے والی گولی کا

واجبی سا ڈر بھی رہتا تھا تاہم ہر شام کا تماشا کچھ ایسا جزوِ زندگی بن گیا تھا کہ کسی وجہ سے ناغہ ہو جاتا تو ایسی ہی مایوسی ہوتی جیسے سینما ہال میں داخل ہونے پر فلم کی نمائش روک دی جائے۔ اِسی تماشے کے دوران ایک شام ہمارا ایک خوش مزاج اور کہنہ مشق پنجر راہیِ ملکِ عدم ہو گیا اور ہمارے سیکشن میں غم کی لہر دوڑ گئی کیونکہ بقول نائیک حیات محمد، آنجہانی کا "فیلڈ کرافٹ" کا علم اِس قدر پختہ تھا کہ اس کا ایک قبائلی گولی کی زد میں آنا باور نہ آتا تھا۔

لڑائی کے دِنوں میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ دُشمن سے نامہ و پیام بھی رہتا۔ بلکہ کئی روز ایسا ہوتا کہ پانچ سات تنومند سے قبائلی ٹھوڑیوں کے نیچے سے پگڑیاں باندھے اور سفید چادریں تانے کیمپ میں آ داخل ہوتے، کالم کمانڈر سے بات کرتے اور پھر اسی طرح سفید پھریرے اُڑاتے ہُوئے تیز تیز کیمپ سے باہر نکل جاتے۔ بات خُفیہ ہوتی مگر ہم تک مع تفسیر لنگر گپ کی شکل میں آ پہنچتی کہ قبائلی چند لاکھ رُوپے کے عوض صُلح پر آمادہ ہیں یا وہ مزید ایک سال کے لیے لڑنے کا چیلنج دے گئے ہیں۔

غرض دو ماہ تک یہی انداز رہا اور جس جنگ سے بچنے کے لیے شیر باز ہمیں تکّے کباب کھلا کر بیمار کرنا چاہتا تھا وہ نہایت ہی صحت افزا ثابت ہوئی۔ خود شیر باز کو اس زندگی سے عشق ہونے لگا جس میں اور چیزوں کے علاوہ مُفت اور وافر راشن کا حصّہ بھی تھا۔

جنگ اگرچہ اب ہفتے عشرے میں ختم ہونے والی تھی؛ تاہم شیر باز اور ہم ایک غیر معیّن عرصے کے لیے جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ اِتنے میں اچانک پشاور سے وائرلیس سے پیغام آیا:

"پشاور پہنچو، تمہاری جگہ پھر تام آ رہا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک اور پیغام آیا:

"ٹام کا انتظار کیے بغیر چل دو، میراں شاہ میں ہوائی جہاز تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

حیران تھا کہ یا اللہ ایک خستہ نیم لفٹین کے بغیر کون سے کام بند ہیں جو ہوائی جہاز سے بلایا جا رہا ہے۔ بہرحال دتا خیل کو ایک ارمان انگیز سی الوداع کہی اور پشاور پہنچتے ہی ایڈجوٹنٹ صاحب کے حضور پیش ہوا۔ مجھے دیکھ کر بولے:

"تم آ گئے؟ شاباش۔ اب تم سمندر پار جاؤ گے۔ تیاری کے لیے تمہیں دو دن دیے جاتے ہیں۔"

حکم سن کر باہر نکلا تو آگے جان وائٹ کھڑا تھا۔ بولا:

"دیکھا، یہ ان سارجنٹوں کی سازش ہے۔ سمندر پار ٹام کو جانا چاہیے تھا۔ وزیرستان کی لڑائی تو اب ختم ہونے والی ہے۔ دو دن کے لیے ٹام کو وہاں بھیج دیا ہے۔ وہ کل پرسوں آ جائے گا اور پھر یہ مزے سے برج کھیلیں گے اور تم؟ خدا تمہاری حفاظت کرے۔ سر کو ذرا جھکا کر رکھنا!"

یہ سن کر دل کو سخت صدمہ ہوا۔ فوراً شیرباز کو طلب کیا اور تکے کباب کا آرڈر دیا۔ ساتھ ہی برج کی کتاب منگوا کر مطالعہ شروع کر دیا۔

۵

سات دن سمندر میں

شام کی جگہ ہمیں سمندر پار بھیجنا سخت فرقہ دارانہ قسم کا فیصلہ تھا۔ اگر ہم سویلین ہوتے تو شاید بھوک ہڑتال یا کم از کم رِٹ پٹیشن کا انتظام کرتے لیکن فوجی افسر تھے، ضبط کا پاس تھا۔ یونہی عارضی سامان تھے پہ بَل ڈالا اور سفر کی تیاری میں مشغول ہو گئے لیکن شیر باز جو فوجی پابندیوں سے آزاد تھا، غصے سے مغلوب ہو کر باہر برآمدے میں جا کھڑا ہوا اور پشتو میں کیپٹن گبن (ایڈجوٹنٹ) کے شجرۂ نسب پر روشنی ڈالنے لگا اور اس ضمن میں چند ایسے گوشے بے نقاب کرنے کی کوشش کی جن کا مفادِ عامہ کی خاطر زیرِ نقاب رہنا ہی ضروری تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت ایڈجوٹنٹ صاحب وہاں موجود نہ تھے، لیکن ان کا بیرا جو ایک بار ایک رسیلے کا مدراسی تھا، شور سن کر ادھر آ نکلا۔ شیر باز نے بڑھ کر بغیر کسی تمہید کے اُسے دو مکّے رسید کیے۔ جس سے مدراسی بے چارے کا شیرازۂ حیات تھوڑی دیر کے لیے منتشر سا ہو گیا، لیکن شیر باز نے اپنے مکّوں کی شانِ نزول کی تشریح کرتے ہوئے اُسے تسلی دی اور کہا:

"دیکھو مدراسی، اگر تمہارا صاحب موجود ہوتا تو یہ زحمت تمہیں نہ دی جاتی۔"

بعد میں شیر باز نے کسی قدر سنجیدگی اور تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ایک منصوبہ

پیش کیا اور اس کی فوری تکمیل کی اجازت مانگی۔ اِس منصوبے کے خدوخال خاصے جارحانہ تھے کیونکہ اِس کا مرکزی خیال کیپٹن گبن کی زندگی کے اِردگرد گھومتا تھا۔ شیر باز پر پیار تو بہت آیا کہ ایک مخلص مگر تیز طبع پٹھان اِس سے بہتر کیا فنّی اِمداد پیش کرسکتا ہے، لیکن میرے اصرار پر شیر باز نے اپنی تجویز واپس لے لی؛ البتّہ ایک شرط پیش کی کہ جس طرح ہو سکے بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ جاؤ، بلکہ ہماری بیماری کے لیے شیر باز نے تمام آسانیاں بہم پہنچا دیں۔ مثلاً دہی شکم گداز کباب، چند زود اثر تعویذ اور بیسیوں تیر بہدف دُعائیں، لیکن پشاور میں ہمارے فقط دو دِن باقی تھے۔ پیشتر اِس کے کہ شیر باز کے کباب کارگر اور دُعائیں مستجاب ہوتیں، ہمیں بمبئی کا ٹکٹ دے کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

پشاور سے چلتے وقت ہمیں ہدایت کی گئی کہ ایک دن راولپنڈی میں ٹھہر کر آرڈیننس ڈپو سے کیمپ کٹ یعنی سفری پلنگ اور غسل وغیرہ کا سامان حاصل کرلینا۔ پنڈی میں چند دوست ملے۔ جب انہیں معلوم ہُوا کہ ہم سمندر پار جا رہے ہیں، تو انہوں نے ہمیں اُسی حسرت سے دیکھا جس حسرت سے بِن کھلے مرجھانے والے غنچوں کو دیکھا جاتا ہے۔ ایک رقیق القلب دوست کی ہمدردی تو کچھ تعزیت کی سی شکل اختیار کرگئی جسے ہم نے بھی مظلومی بلکہ شہادت کے عالم میں قبول کیا۔ اِن دِنوں یوں بھی غیر مُلکی آقاؤں کے لیے جان دینا کوئی برخورداری کی علامت نہ سمجھا جاتا تھا اور رہم پر تو مزید ستم یہ ہُوا کہ چند گوروں کی برج کی خاطر موت کے مُنہ میں دھکیلے جا رہے تھے۔ بہرحال ان تمام ناگہانی، لیکن ذرا شیر گرم بلاؤں کی دُعا مانگتے ہُوئے جو ہمارے سمندر پار جانے میں حائل ہوسکتیں، ہم نے سفر جاری رکھا۔ مثلاً یہ کہ ریل پٹڑی سے اُتر جائے اور ہمیں معمولی سی چوٹیں آجائیں، مگر ہڈی نہ ٹوٹے، لیکن گاڑی دُعاؤں اور تمناؤں کو نظر انداز کرتی ہُوئی صحیح و سالم بمبئی پہنچ گئی۔ گاڑی سے اُترتے وقت طبّی نقطۂ نگاہ سے ہم فوری طور پر لڑائی جانے کے قابل تھے۔

بمبئی میں ہمیں ٹرانزٹ کیمپ میں رکھا گیا۔ معلوم ہُوا کہ جہاز دو دِن کے بعد رَوانہ ہوگا؛ چنانچہ ہمیں حکم مِلا کہ اِن دو دِنوں میں امبارکیشن آفس سے اپنے سفر کے کاغذات وغیرہ حاصل کرلو۔ عام لوگوں کو دفتروں سے کاغذات برآمد کرانا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے، لیکن ہم عام آدمی نہ تھے، ایپایڑ کے فدائی تھے۔ کفن بدوش نہ سہی لیکن شناختی تختی گلے میں ڈال رکھی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اِمبارکیشن دفتر کے دروازے پر دستک دیں گے تو تمام افسر جو بہر کیف دُوسرے درجے کے غیر لڑاکا قسم کے افسر ہیں، بصد تواضع ہمارا استقبال کریں گے اور اگر ہمارے گلے میں ہار وغیرہ نہ بھی پہنا سکے، تو ہمارے کاغذات منٹوں میں تیّار کر کے ہمارے حضور پیش کر دیں گے۔ آخر ہم اِنہی لوگوں اور ان کے بال بچّوں کی سلامتی کی خاطر ہی ہتھیلی پر جان رکھ کر عرصۂ کارزار کو جا رہے ہیں۔ مگر دفتر میں گئے تو گھنٹہ بھر تو وہ کمرہ ڈھونڈتے رہے جہاں سے ہمیں کاغذات ملنے تھے۔ دو گھنٹے باریابی کے لیے اِنتظار کرنا پڑا، اور جب آخر باریابی کا وقت آیا، تو دفتر کا وقت ختم ہوگیا۔

دُوسرے دِن صبح وقت پر گئے۔ اپنی جانبازی کا مغالطہ کیمپ میں ہی چھوڑ گئے۔ وطنِ عزیز کے دستور کے مطابق دفتر میں جا کر کسی واقف کا سُراغ لگانے کی کوشش کی معلوم ہُوا کہ ایک کلرک ہمارے ضلع کا رہنے والا ہے۔ اُس سے مِلے اور ابھی چائے کی پیالی ختم نہیں کی تھی کہ کاغذات تیّار ہو کر آگئے۔

ٹرانزٹ کیمپ میں ہمارے چند اور جانفروش ساتھی سمندر پار جانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ شام کو اعلان ہُوا کہ صبح جہاز پر سوار ہونے کے لیے تیّار ہو جاؤ۔ دُوسرے روز بندرگاہ پر پہنچے۔ یہ تھا جہاز اور یہ تھے ہم لیکن سوار ہونے کا حکم نہیں مِل رہا تھا۔ پاس سے ایک حاکم نما سے حضرت گزرے تو اُن سے وجہ تاخیر پُوچھی۔ بولے: "کچھ نہیں، ذرا کاغذی رکاوٹ ہے ٹھیک ہو جائے گی۔" یعنی وہی پُرانا قصّہ تھا۔ کوئی فیتہ پرست افسر اپنے اَڑیل کلرک کی انگیخت

پر کسی ضروری کاغذ پر بیٹھ گیا تھا۔ چنانچہ شام ہو گئی اور ہر دو گل محمد اپنی جگہ سے ہلے نہ جہاز۔ ہمیں حکم ملا کہ واپس کیمپ جا کر حکمِ ثانی کا انتظار کرو۔

معاً مجھے خیال آیا کہ شاید شیر باز کی دعا میں ○ DELAYED ACTION کی خصوصیت ہو اور اب وہ آہستہ آہستہ قبول ہو رہی ہو اور یہ کہ شاید ہمارا سمندر پار جانے کا حکم ہی منسوخ ہو جائے۔ ساتھی سوائے ایک کے سب انگریز تھے اور وہ ایک نہ صرف "گرائیں" نکلے بلکہ ہم خیال بھی۔ انہیں بھی انگریزی شہادت میں ایسی کشش نظر نہ آتی تھی؛ چنانچہ ہم دونوں نے ایک مشترکہ دعا مانگی:

"اے بحر و بر کے مالک، ہمارا سمندر پار کا سفر ٹال دے۔"

کیوں اور کیسے، یہ باریکیاں ہم نے اللہ میاں پر چھوڑ دیں۔ ہم نے دعا کے اس پہلو پر البتہ بہت زیادہ زور دیا کہ فوری توجہ کی مستحق ہے، لیکن خدا جانے ہماری دعا میں کوئی ٹائپ کی غلطی رہ گئی تھی یا لیبل غلط لگ گیا تھا، صبح جاگے تو حکم ہوا کہ جہاز سہ پہر کو لنگر اٹھائے گا۔ مسافر بارہ بجے بندرگاہ پر پہنچ جائیں۔ اسی شام ہم اپنے کیبن میں بیٹھے مغرب کو رواں تھے ہمیں اتنا ہی اندازہ تھا کہ مغرب کو جا رہے ہیں۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ منزلِ مقصود کونسا مقام ہے۔ لڑائی ان دنوں مصر سے آگے لیبیا میں مسولینی کی فوجوں کے خلاف ہو رہی تھی؛ چنانچہ خیال تھا کہ سویز یا پورٹ سعید اتریں گے، لیکن دوسرے روز ہی کسی نے کان میں آ کر کہا: "بصرہ اتریں گے، لیکن بتانا کسی کو نہیں۔" ہم نے کسی کو نہ بتایا یعنی سوائے اپنے دوست کے، لیکن اسے پہلے ہی سے علم تھا اور ہمیں بتانے کے لیے بے تاب تھا۔ چند گھنٹوں میں سب کو معلوم ہو گیا، لیکن سرکاری طور پر ہماری منزل بڑی کامیابی سے خفیہ رکھی جا رہی تھی۔ پچھلے پہر جہاز کے ملازم سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یکم ستمبر ۱۹۴۱ء کی صبح کو بصرہ

○ تاخیری عمل: تمام طور پر اس بم کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ایک خاص وقفے سے پھٹتا ہے۔

پہنچیں گے۔ یہ تفصیل غالباً TOP SECRET (مخفیہ ترین) شمار ہو رہی تھی۔

جہاز کے لنگر اُٹھانے کے بعد بظاہر کوئی ایسا امکان نہ تھا کہ ہمارے سفرِ جنگ میں کامیاب رکاوٹ پڑ سکے؛ لہٰذا جہاز کو خانۂ خویش سمجھ کر اُس کے کوچہ و در دیکھنا شروع کیے۔ ہمارا پہلا سمندری سفر تھا۔ جہاز کا کونا کونا دیکھ مارا، لیکن شاید یہ ہماری فالتو ہستی کا فیض تھا کہ اچانک جہاز نے ہمارے پاؤں سے نکل کر ہمارے گرد چکّر لگایا۔ ہمارے اعضا نے یکے بعد دیگرے ہمیں خیرباد کہا اور ہم بمشکل سَر کو تھامے کیبن میں پہنچے اور دراز ہو گئے۔

یہ سمندری علالت بھی عجیب علالت ہوتی ہے۔ اچھا بھلا آدمی بیٹھے بیٹھے اپنے آپ پر گرفت ڈھیلی پاتا ہے۔ ہوش و حواس دُرست ہیں، لیکن اُن کی دُرستی کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اعضا پر اختیار نہیں۔ اِس مکمل بے بسی کے عالم میں زندگی پر ایک گہری بیوست محیط ہو جاتی ہے اور غریب مُسافر اپنے آپ کو بھرے جہاز میں مجبور و معذور پاتا ہے۔ اس بے چارگی میں ہمارا دستگیر ایک گوانی مُلازم بنام لوبو تھا، لیکن لوبو شوقِ خدمت میں فقط دستگیری کا قائل نہ تھا۔ اگر آپ کو اِن دنوں جہاز "اسلامی" سے سفر کا اتفاق ہُوا ہو اور لوبو کی خدمات سے مستفید ہونے کا موقع مِلا ہو تو آپ مجھ سے اِتّفاق کریں گے کہ لوبو کے فن پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالنا مناسب نہیں۔ مختصر یہ کہ اُستاد لوبو بڑے صحّت بخش فنکار تھے۔

سفر کا دُوسرا اہم واقعہ ایران کی جنگ تھی۔ ہر صبح اور شام جہاز کے ڈرائنگ رُوم میں وائرلیس سے مُرتّب کردہ خبرنامہ بورڈ پر چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ روانگی کے دُوسرے یا تیسرے روز خبر آئی کہ اتحادیوں نے ایران پر حملہ کر دیا ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے یہ حملہ ہندوستانی فوج ہی کے چند دستوں کی مَدد سے کیا تھا؛ تاہم ہمیں ایرانی بھائیوں سے بھی ہمدردی تھی۔ ہمارے انگریز ہم سفر تو ایرانی فوجوں کا مذاق اُڑاتے تھے، لیکن ہم چاہتے کہ اگر وہ جیت نہ بھی سکیں، تو دادِ شجاعت دے کر ہاریں؛ چنانچہ دُوسری صبح ہم کسی قدر بے تابی سے خبرنامہ

پڑھنے گئے، لیکن یہ سُرخی دیکھ کر ہمیں حیرانی ہُوئی کہ ایران میں ہر طرف اَمن و امان کا دَور دَورہ ہے۔

تفصیل اِس اجمالِ پُر ملال کی یہ ہے کہ انگریزوں اَور رُوسیوں نے ایک دِن کسی اِشتعال کے بغیر ایران پر حملہ کر دیا۔ اہلِ ایران کو اِس بدتمیزی پر غصّے سے زیادہ حیرت ہُوئی اَور پیشتر اِس کے کہ غصّہ آتا اَور اس کے اظہار کے لیے میدانِ جنگ میں اُترتے، دغاباز حملہ آوروں نے میدانِ جنگ سمیت ایران پر قبضہ کر لیا۔ حق بات یہ ہے کہ ایرانی بے خبری میں مارے گئے۔ وَیسے ان کی فوجی قوّت کا معیار بھی وہ نہ تھا جو آج ہے۔ یہ اِسی لڑائی کا شاخسانہ تھا کہ شہنشاہِ ایران رضا شاہ پہلوی تخت سے دستبردار ہو گئے اور موجودہ شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی تخت نشین ہُوئے۔

بمبئی سے بصرہ تک ایک ہفتے کا سفر تھا جو ایسا طویل تو نہ تھا، لیکن آخری دو تین دن تو ہم خشکی کے لیے ترس گئے۔ ہر طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ چھوٹا سا جہاز تھا اور تھوڑے سے مسافر اَور سب کے سب مَرد۔ متواتر وہی چہرے دیکھ دیکھ کر ایک دُوسرے سے تنگ آ گئے تھے اَور چند ہم سفروں کی دید تو بے حد اِشتعال انگیز تھی۔ پاس سے گزرتے تو جی چاہتا کہ اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیں، لیکن اَغلب ہے کہ وہ بھی ہماری شکل و صُورت سے بیزار ہو کر خونِ جگر پی رہے تھے۔ بہر کیف دونوں فریقوں نے صبر کا دامن نہ چھوڑا اَور باہمی رواداری کا پردہ سرِعام چاک نہ ہُوا، بلکہ جی کڑا کر کے ایک دُوسرے سے علیک سلیک بھی کرتے رہے۔

آخر چھٹے دن غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے ایک صاحب خوشی سے چِلّا اُٹھے:
"وہ دیکھو خشکی!" ساری عمر خشکی پر گزاری تھی اور اس عرصے میں غالباً اسے دیکھا بھی ہوگا، لیکن اُس روز محسوس ہُوا کہ سچ مچ ہم خشکی دیکھے بغیر ہی اِس پر قیام پذیر رہے ہیں۔ چنانچہ

بالکل اُسی انداز سے جیسے سرکس دیکھتے ہیں، ہم نے زمین کے اِس ٹکڑے کو دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد شط العرب میں داخل ہُوئے تو دونوں طرف دُور فاصلے پر کھیت اور انسان نظر آنے لگے۔ انہیں دیکھنا تھا کہ ہمارے دِلوں میں بھی بنی نوعِ انسان کے لیے جن میں ہمارے ساتھی بھی شامل تھے، محبّت کے چشمے پھُوٹنے لگے۔ ایک دُوسرے کو سمندر میں پھینکنے کے ناپاک منصوبوں کا شرمندگی سے اعتراف کیا اور پشیمان انگریزوں کی طرح اُنہیں واپس لیا۔ جب ڈنر سے فارغ ہو کر اپنے کمروں کو لَوٹے، تو جہاز پر ایک مُکمّل اَور پُرامن بقائے باہم (PEACEFUL CO-EXISTENCE) کا عالم تھا۔

صُبح ہوئی اور جاگے، تو ہمارا جہاز بصرے کی بندرگاہ میں کھڑا تھا۔ بڑے اشتیاق سے باہر جھانکا کہ اِس نئے مُلک کا ناک نقشہ تو دیکھیں۔ ایک نوٹس بورڈ پر نظر پڑی، لکھّا تھا:

"سامان پر نگاہ رکھیں اور چوروں سے ہوشیار رہیں۔"

اطمینان ہُوا کہ الف لیلیٰ کی اِس رُومان انگیز سرزمین اور ارضِ ہند میں کم از کم ایک قدر ضرور مشترک ہے، لیکن سوچا کہ عراق اور ہندوستان کی مشابہت کا یہی عالم ہے، تو ہمارا سفر بیکار رہا۔ کیا اس سے یہی بہتر نہ تھا کہ پشاور میں ہی اپنے مال و اسباب کی خبرداری کرتے رہتے۔ لیکن آئندہ چند ماہ میں جب بصرہ و بغداد کو ذرا قریب سے دیکھا اور وہاں کی زندگی کے کچھ دُوسرے گوشے بے نقاب ہُوئے تو معلوم ہُوا کہ اِس خطّے کی رنگینیاں تھرزاد کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گئیں، بلکہ

آج بھی اِس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دِل نشیں،

۶

بصرہ اور شائبہ کیمپ

بصرہ اگرچہ پہلے نہ دیکھا تھا، تاہم ذہن اس کے تصور سے یکسر خالی نہ تھا مثلاً بچپن میں جغرافیہ کی کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا اُس سے بصرے کا تصور سُرخ میٹھی کھجوروں کی شکل میں ہمارے دماغ میں محفوظ تھا۔ اُنہی دنوں کے اِمتحانوں کے "گھوٹے" ○ کی پسماندہ یاد یہ بھی تھی کہ بصرہ لندن یا ٹمبکٹو کے رستے میں ایک بحری یا ہوائی اُڈہ ہے۔ اگرچہ اس اُڈے کا تصور مزنگ کے ٹانگوں کے اُڈے سے مختلف نہ تھا، پھر بڑے ہو کر ان فوجیوں سے بصرے کے قصّے سُنے تھے جو پہلی جنگِ عظیم میں اِسی بندرگاہ پر اُتر کر میسو پوٹیمیا کے میدان میں کام آئے تھے یا یُوں کہیں کہ بیکار گئے تھے۔ کام آنے والوں نے آکر کیا قصّے سنانے تھے؛ اور بعد میں شاید اِن ہی فوجیوں کے طفیل بصرہ ہمارے لوگ گیتوں میں بھی گُھس گیا تھا۔ مثلاً وہ پنجابی گانا:

چھٹّی رَن گئی، بصرے نوں گئی،
تے موڑیں باوا ڈانگ والیا سَردارا

(اگرچہ گیت کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود خاتون نے بصرے میں گُھسنے

○ رَٹنے کے لیے طلباء لاہور کی اصطلاح

کی کوشش کی تھی۔ اللہ جانے کیوں؟)

جہاز سے اُترے تو معلوم ہُوا کہ ہماری منزل بصرہ نہیں، بلکہ بصرے سے کوئی پندرہ میل مغرب میں ایک بہت بڑا کیمپ ہے جسے شائبہ کیمپ کہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ اِس مقام کا عربی نام تو شعیبہ ہے لیکن اِس کا "ع" انگریزوں کے حلق میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ ناموں کے سلسلے میں ہم انگریزوں کی زیادتی سے اپنے مُلک میں بھی آشنا تھے۔ مثلاً حیدرآباد کا انگریزی نام ہائڈرابیڈ تھا اور کشمیر کا کیشمیر۔ لیکن عراقی ناموں کے ساتھ تو انگریزوں نے اچھی خاصی سِکھّا شاہی مچا رکھی تھی۔ مثلاً بغداد بیگ ڈیڈ تھا۔ موصل کو موزل کہتے تھے اور معقل کو مارگل بنا دیا تھا۔ انگریز تو خیر اپنے حلق کی بے بضاعتی کی وجہ سے شاید غلط تلفظ پر مجبور تھے، لیکن حیرت بلکہ رحم اُن ہندوستانیوں پر آتا تھا، جنھیں اپنی فلاح بیگ ڈیڈ کہنے میں ہی نظر آتی تھی۔

سرزمینِ عراق کے وہ پندرہ میل جو بصرہ اور شائبہ کیمپ کے درمیان تھے، ہماری زندگی میں ایک انوکھا تجربہ تھے۔ ہم نے اِس سے پہلے کبھی ایسا اصلی ریگستان نہ دیکھا تھا۔ خود بصرہ تو دجلہ کی گزرگاہ کے طفیل بہت سرسبز اور شاداب تھا اور کھجوروں کے درخت تو وہاں انسانوں سے بھی زیادہ تھے، لیکن بصرے سے باہر نکلنا تھا کہ سبزہ یک قلم غائب ہو گیا اور انسان بھی تقریباً غائب۔ حدِ نگاہ تک لق و دق اور ہموار ریگ زار تھا جس میں کسی عمودی شے کا وجود نہ تھا، سوائے کسی بھٹکے ہُوئے گدھے یا بہکے ہُوئے اُونٹ کے جو دُور اُفق پر نظر آتے تھے۔ اگرچہ اُن کے وہاں ہونے کی بھی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ پانی تھا، نہ نباتات۔ بقولِ حالی "خُدا کی زمین بِن جُتی سربسر تھی"۔ ممکن ہے کہ اِس ضمن میں گدھوں اور اُونٹوں کا کوئی اپنا زاویۂ نگاہ ہو، لیکن ہمارے پاس اِتنا وقت نہ تھا کہ اُن کے تاثرات معلوم کر سکتے۔ ہمارا قافلہ رواں تھا اور ہم برابر دیدے پھاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں گھاس کی واحد پتّی ہی نظر آ جائے لیکن نہ آئی۔ سعدیؒ کا شعر یاد آیا ؂

برگِ○ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اور محسوس ہُوا کہ ہم خواہ کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں، شائبہ کے نواح میں ہمیں معرفتِ کردگار ذرا مشکل سے ہی میسّر ہو گی۔ ہمارے ایک ساتھی جو سیّد تھے، بولے :

"بجا کہتے ہو دوست، شائبہ کردگار سے زیادہ کربلا کے نزدیک ہے۔ یہاں پتّے دیکھ کر نہیں، بلکہ سَر دے کر معرفت حاصل کی جاتی ہے۔"

سوچا کہ اگر سعدیؒ شیراز کی بجائے شائبہ میں پیدا ہوتے، تو معرفت کا ایسا آسان نُسخہ تجویز نہ کر پاتے۔

شائبہ کیمپ میں پہنچے، تو پہلی مرتبہ اِنسان نظر آئے یعنی ہندوستانی اور برطانوی فوجوں کے سپاہی۔ شائبہ ایک RE-INFORCEMENT CAMP⊖ تھا۔ یعنی اِس میں فوجی لوگ محاذِ جنگ پر بھیجنے کے لیے تھوک کے طَور پر رکھے جاتے تھے۔ اِس وقت ہمارے دو ڈویژن محاذ پر تھے اُور ان دونوں کو کمک شائبہ سے ہی جاتی تھی۔ کیا سپاہی، کیا افسر، کیمپ میں مُسافر ہی تصوّر ہوتے تھے اور کیمپ میں آنے کے بعد چند دِنوں میں آگے محاذ پر بھیج دیے جاتے تھے، لیکن یہاں خُدا کے کچھ پُراسرار بندے ایسے بھی تھے جنہیں فطرت نے مُفت خوری کا لازوال شوق بخشا تھا اور جنھوں نے تمام تر جنگ شائبہ کے لنگر خانوں اُور میسوں میں ہی گزار دی تھی۔ فوج میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ جو لڑ کر جنگ جیتتے ہیں اور وہ جو کھا کر جیتتے ہیں۔ شائبہ کیمپ میں دونوں قسمیں پائی جاتی تھیں۔ جگر گداز منظر اُس گھڑی ہوتا تھا، جب ایک کھا کر جیتنے والے کو محاذِ جنگ پر جانے کا حکم ملتا تھا اُور غریب ٹال نہ پاتا تھا ہم نے چند ایسے ہی مناظر دیکھے اُور ہر مرتبہ کلیجہ مُنہ کو آنے لگا۔

○ ایک عقلمند آدمی کی نگاہ میں درختوں کے پتّے بھی خُدا کی معرفت کا دفتر ہیں۔ ⊖ امدادی لشکرگاہ

ایک کپتان صاحب کا وقتِ سفر کبھی نہ بھولے گا۔ یہ حضرت شائبہ کے بانیوں میں سے تھے اور آپ نے اپنا تمام وقت اس چھوٹے سے دائرے میں گزار دیا جس کا مرکز کیمپ کا مَیس تھا۔ حضور کا بڑا ثقیل سا نام تھا جو چھوٹی سی "ی" پر ختم ہوتا تھا۔ مزاج میں رنگینی تھی اور اکثر اپنی شجاعت اور عشق کی داستانیں سُنایا کرتے تھے، بلکہ اُن دِنوں اپنی مُرادآبادی معشوقہ کو بصرہ میں لانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اچانک ایک دن آپ کو محاذ پر جانے کا ذرا اٹل سا حکم مل گیا۔ کیا بتائیں کہ اس مُجاہد نے اس مہم سے بچنے کے لیے کیا کیا بہانے تراشے، آپ نے جُملہ انگریز افسروں کو بآوازِ بلند خبردار کیا کہ یاد رکھو اگر ہمیں محاذ پر بھیج دیا، تو شائبہ ویران ہو جائے گا۔ ہندوستانی فوج کا مورال تباہ ہو جائے گا، پیچھے مُرادآباد کا WAR EFFORT ○ برباد ہو جائے گا اور اُدھر سلطنتِ برطانیہ کا مُستقبل تاریک ہو جائے گا ــــ دلائل بے شک وزنی تھے، لیکن ظالموں نے ان کا وزن کرنے سے ہی اِنکار کر دیا اور آپ کو اُس لاری پر سوار ہونا ہی پڑا جو ایک صُبح محاذ کو کمک لے کر جا رہی تھی۔ اِس قیامت خیز ساعت میں آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے جنہیں دیکھ کر سارے شائبہ پر رقّت طاری ہو گئی، لیکن لاری کا حرکت کرنا تھا کہ حاضرین میں ایک بے پناہ قہقہہ گُونج اُٹھا۔ ایک دل جلے نے مُرادآبادی معشوقہ کو پُکار کر کہا: "تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشا ایست"

اِس وسیع کیمپ کے دو حصے تھے جنہیں وِنگ (WING) کہتے تھے۔ یعنی برٹش وِنگ اور اِنڈین وِنگ۔ برٹش وِنگ میں فقط گورا افواج تھیں اور اُن کے افسر۔ یہ وِنگ کیمپ کے غربی سرے پر تھا۔ شرقی حصّہ انڈین وِنگ تھا۔ اِس میں ہمارے ہندوستانی سپاہی اور اُن کے افسر رہتے تھے۔ اُن دِنوں اِنڈین آرمی کے افسر بھی زیادہ تر انگریز ہی ہوتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ دیسی افسر بھی خاصی تعداد میں آنے لگے تھے۔ ان میں ہندو، مُسلمان، سِکھ، پارسی سب

○ جنگی تیاریاں

تھے جو باہم شیر و شکر تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستان میں فوج کو چھوڑ کر زندگی ایک مسلسل ہندو مسلم دنگل تھا جس میں اکثر سکھ بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شامل ہو جایا کرتے تھے اور فقط پارسی ہی اس بزم خیر و شر کو ساحل سے دیکھتے تھے، لیکن فوج میں تمام دیسی افسر ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور اگر خدا واسطے کا بَیر تھا تو صرف انگریز افسروں سے۔ ہندوستان کی محکومی کی وجہ سے شاید ہم لوگ کچھ ضرورت سے زیادہ حساس بھی تھے اور خواہ مخواہ انگریزوں سے اُلجھنے کو جی چاہتا تھا، لیکن جنگ چھڑنے کے بعد بظاہر برٹش افسروں میں بھی قصابوں اور کنجڑوں کی بھرتی ممنوع نہ تھی۔ پھر عہدے کے لحاظ سے یہ لوگ اُن دنوں ہم سے تقریباً ہمیشہ سینئر ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ دیسی اور انگریز افسروں میں اچھی خاصی فرقہ وارانہ کشیدگی رہتی تھی اور اسی وجہ سے افسروں کے میسوں میں بارہا نقضِ امن کی وارداتیں ہوئیں۔

شائبہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ انڈین ونگ میں اگرچہ اکثریت انگریز افسروں کی ہے، تاہم ہندوستانی افسروں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ چنانچہ خوشی ہوئی کہ شائبے کا چند روزہ قیام خوب گزرے گا، مگر ابھی بستر بھی نہ کھلا تھا کہ حکم ملا: "تم برٹش ونگ میں قیام کرو گے۔" وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کیمپ میں صرف رائل سگنلز کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ انڈین سگنلز کا کوئی آدمی یا ٹھکانہ نہ تھا۔ چار ماہ کے ناپختہ سیکنڈ لفٹیننٹ کو اپنی برادری سے اُدھیڑ کر اجنبی گوروں یعنی مخالفین کے سپرد کر دینا سامراجی تشدد کی ایک اور مثال تھی، لیکن کانگریسی تو تھا نہیں کہ لاری کے آگے لیٹ جاتا۔ بس دانت پیس کر زیرِ لب ہی اپنے جذبات کا اظہار کر لیا۔ دِل ہلکا ہوا، تو بوریا بستر اٹھایا اور برٹش وِنگ جا پہنچا۔ وہاں ہر طرف گورے ہی گورے تھے۔ کیا افسر کیا سپاہی، بلکہ بیرے خانسامے تک اِنگلستان ساختہ تھے۔

ایک گورا سپاہی ہمیں بطور اردلی ملا۔ اُس نے آتے ہی ہمیں سلیوٹ کیا اور بغیر بات کیے ہمارا بستر لگایا۔ سامان قرینے سے رکھا۔ جوتے پالش کیے اور چائے لایا۔ ایک انگریز کو یوں

اِن دہاڑے اپنی خدمت کرتے دیکھ کر محسوس ہُوا جیسے سچ مچ ہماری صاحبقرانی کی ابتدا ہو رہی ہے۔ معاً ہمارے خسروانہ ذہن میں یہ خیال آیا کہ سب انگریزوں کو بددماغ سمجھنا مناسب نہیں ہوتا؛ چنانچہ ہم اِس گورے غلام کے لیے اَب سراپا شفقت تھے۔

جب گورا کارِ خدمت سے فارغ ہو چکا تو پہلی مرتبہ ہم سے ہمکلام ہُوا، لیکن کلام کیا تھا ایک لہراتی سی انگریزی نُما آواز ہمارے سامنے سے گزر گئی، لیکن ہمارے دماغ پر کوئی قابلِ فہم نقش نہ چھوڑا۔ ہمیں خاموش دیکھ کر گورے نے اپنی بات پھر دُہرائی، لیکن ہمارے دماغ کے نقش بدستور دُھندلے اور تجریدی قسم کے تھے۔ گورا اب خاموش کھڑا تھا۔ سوچا کیوں نہ ہم ہی کچھ کہیں؛ چنانچہ گلا صاف کیا اور اپنی بہترین انگریزی میں اظہارِ مدعا کیا۔ گورے اردلی نے ہماری انگریزی کی داد میں ایک مخلصانہ مسکراہٹ ضرور پیش کی، لیکن جہاں تک اِس انگریزی کے اِدراک کا تعلق تھا، ظاہر تھا کہ غریب سراسر معذور ہے۔ بغیر مزید تجربے کے ہم نے طے کر لیا کہ ہماری اور گورے کی گفتگو میں کوئی نقطۂ اِتصال نہیں اور یہ کہ اگر ہم نے مشقِ سخن جاری رکھی، تو ہماری انگریزیاں بالکل متوازی پگڈنڈیوں پر ایک دُوسرے کو چھُوئے بغیر چلتی رہیں گی؛ چنانچہ زبان کی بجائے ہاتھوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور بلا تکلف ایک دُوسرے کو سمجھنے لگے۔ بقولِ داغ:

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے

شام کو برٹش وِنگ کے افسروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ گورے اردلی سے بھی زیادہ تواضع اور احترام سے پیش آئے۔ پہلے تو حیران ہُوا کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو، لیکن فوراً معلوم ہو گیا کہ اِن کی شرافت کی وجہ کچھ اور ہے۔ یعنی یہ کہ اِن انگریزوں نے ابھی تک ہندوستان نہیں دیکھا اور فرعونیت کا انہیں عملی تجربہ نہیں ہُوا۔ وہ لوگ سیدھے ولایت سے تشریف لائے تھے اور ایک غیر ملکی کو انگریزوں کی خاطر لڑتا دیکھ کر اسی طرح ممنون ہوتے تھے، جیسے دُنیا بھر کے مسلمان محمد علی کلے کے قبولِ اسلام پر مسرور ہوتے ہیں۔ آج محمد علی کسی اِسلامی مُلک میں آنکلیں تو لوگ دیدہ و دِل

فرشِ راہ کر دیں۔ انگریزوں نے اس قسم کے اعضائے رئیسہ تو ہمارے رستے میں نہ بچھائے، لیکن ان کا انگریزی بدل ضرور پیش کیا یعنی تپاک سے مصافحہ کیا۔ چائے پلائی۔ لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اُن کا اندازِ ملاقات تھا۔ جو بھی ملتا اُس کے چہرے پر شگفتگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی گفتگو سے سرپرستی اور بے نیازی نہ ٹپکتی تھی جو ہندوستان کے انگریز حاکموں کا ٹریڈ مارک تھا۔ وہ اپنے مخاطب کو اپنے برابر بھی سمجھتے تھے اور قابلِ عزت بھی۔

یہ سب کچھ تھا، لیکن مَیں طبعاً اتنا نامی مزاج بھی نہ تھا کہ اِن لوگوں سے گھُل مِل جاتا۔ محض مصافحوں یا مسکراہٹوں پر مستقل گزارا مشکل تھا۔ برٹش وِنگ میں آرام ضرور تھا لیکن گوشۂ قفس کے آرام سے ملتا جُلتا اور پھر زندگی فقط آرام کی زیادتی سے ہی عبارت نہیں بلکہ اگر آتش جواں ہو جیسا کہ وہ تھا، تو فالتو آرام ایک عجیب بدنی کوفت اور ذہنی فساد کا باعث ہوتا ہے؛ چنانچہ جی چاہتا کہ بھاگ کر کیمپ کے ہندوستانی حِصّے میں جاؤں اور اپنے ہم وطن دوستوں کے ساتھ مِل کر اُودھم مچاؤں۔ اور کرنا خدا کا کیا ہُوا کہ ایک دن انڈین وِنگ میں گورکھا سپاہیوں کو سگنل کی تربیت دینے کے لیے ایک افسر کی ضرورت محسوس کی گئی اور نظرِ انتخاب ہم پر پڑی؛ چنانچہ بظاہر کسی قدر وقار کے ساتھ، لیکن بباطن ہزار بے تابی سے انڈین وِنگ میں پہنچے اور دو نفل شکرانے کے پڑھے۔

برٹش وِنگ کی دھیمی دھیمی بے آواز سی فضا سے نکل کر انڈین وِنگ کی رنگ رنگیلی دُنیا میں پہنچا، تو یُوں محسوس ہُوا جیسے انار کلی میں آنکلا ہُوں۔ وہی انار کلی کے رنگ، وصُوت اور وہی گھما گھمی، لیکن عجیب بات تھی کہ عین اس وقت کوئی دیسی افسر نظر نہ آرہا تھا؛ البتہ ایک قریب کے خیمے سے قہقہے بلند ہو رہے تھے جو لاریب افسرانہ تھے۔ چِق اُٹھا کر داخل ہُوا، تو سبھی کو یکجا پایا۔ ممتاز قاضی، اصغر، بٹالیہ، بھاٹیہ، کیانی، امیر، سوامی، نیلنے، نادر اور کئی دُوسرے جن سے ابھی تعارف نہیں تھا، ہماری آمد کو حسبِ معمول ایک ایسے نعرے سے منایا گیا جس کا اثر شامیانے کے دیگر خیموں میں

ایک ہلکے سے زلزلے کے طور پر محسوس کیا گیا۔ پُوچھا کہ فرزندانِ ہند اس بند تمبو میں بیٹھے کیا سازش کر رہے ہیں، تو بتایا گیا کہ کونسل آف ایکشن کا اجلاس ہے۔

ہُوا یہ تھا کہ ایک انگریز میجر بنام مِڈوے (MEDWAY) نے کیپٹن اجندر سنگھ بتالیہ کے خلاف ایک کیس کھڑا کر دیا تھا یا بزبانِ فوج اُنہیں چارج پر رکھ دیا تھا۔ فردِ جرم میں مذکور تھا کہ مُلزم کو کیبرے دیکھنے کے لیے شامِ بُہ سے بصرہ جانا تھا۔ کوئی اور سواری نہ ملی، تو آرمرڈ کار یعنی بکتر بند گاڑی لے کر ہی تماشہ دیکھنے چلا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اَب ایوان کے سامنے سوال یہ تھا کہ بتالیہ کیا صفائی پیش کرے۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ مُلزم اِرتکابِ جُرم سے صاف اِنکار کرے اور ثبوت میں نائک پیندا خاں ڈرائیور سے شہادت دِلوائی جائے۔ دُوسری تجویز یہ تھی کہ مُلزم ڈٹ کر اقبالِ جرم کرے لیکن ٹریننگ کا بہانہ کرے۔ اگر پُوچھا جائے کہ یہ حرکت سرِشام کیوں کی گئی، تو عدالت کی توجہ نائٹ ٹریننگ کی اہمیت کی طرف دلائی جائے۔ یہ سوال کہ ٹریننگ کیبرے پر کیوں جا ختم ہوئی تو اس کی وجہ COMPASS ERROR یعنی قُطب نما کی غلطی بتائی جائے۔

مجھے یہ دُوسری تجویز کُچھ مذاق سا معلوم ہُوئی، لیکن دُوسرے روز بتالیہ نے کورٹ کے سامنے یہی صفائی لفظ بلفظ پیش کر دی۔ عدالت نے ــــ جس کے ارکان یقیناً اہلِ دل تھے ــــ اپنے فاضلانہ فیصلے میں لِکھا کہ کوئی جُرم سرزد نہیں ہُوا کیپٹن بتالیہ کو ایک بہتر قُطب نما مہیا کیا جائے!

قِصّہ مُختصر اگلی مرتبہ بتالیہ صاحب کیبرے دیکھنے گئے، تو ٹینک میں تشریف لے گئے۔ ہرچند کہ اُنہیں ایسی سواری کی ضرورت نہ تھی، یہ حرکت محض میجر مِڈوے کی خوشنودیٔ مزاج کے لیے کی گئی تھی۔ مِڈوے نے جب یہ خبر سُنی تو اُس سے زیادہ بے بس اور مضمحل انگریز برطانوی سلطنت میں اور کوئی نہ تھا۔ بے بس اِس لیے کہ ابھی ابھی ایک نیا قُطب نما بتالیہ کو

دے چکا تھا۔ زبان کھولتا تو نیا ٹینک بھی پیدا کرنا پڑتا۔

کیپٹن بتالیہ کی مُہم نے میجر مڈدے کی شکایتوں کا تو تقریباً قلع قمع کر دیا، لیکن اُس کی بدتمیزی کا اِنسداد مُشکل تھا۔ میجر مڈدے کی بدتمیزی کچھ خداداد سی چیز تھی اور اِس باب میں وہ خاصا برگزیدہ شخص تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس جنس کی تقسیم کے وقت اُسے قُربِ خاص حاصل تھا اور کسی مغالطے کے تحت اُس نے اپنا دامن ذرا زیادہ پھیلا دیا تھا اور اب اِس بیکراں دَولت کو اِس آزادی سے استعمال کرتا تھا کہ اس کی ترکیبِ اِستعمال پر داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ مجھے میجر صاحب سے کام پڑ گیا۔ اُن کے دفتر میں حاضر ہُوا اور دروازے پر کھڑے ہو کر معروف انگریزی طریقے سے اندر آنے کی اِجازت مانگی۔

"مَیں ایک سیکنڈ کے لیے اَندر آسکتا ہُوں؟"

میجر صاحب بولے: "ہاں آؤ"

اندر داخل ہُوا اور ابتدائے کلام کرنے لگا، تو گھڑی دیکھ کر بولے:

"ایک سیکنڈ ہو گیا ہے، آپ جا سکتے ہیں!"

بات تو ٹھیک تھی۔ ایک چھوڑ ڈیڑھ سیکنڈ ہو گیا تھا۔ مؤدبانہ سیلوٹ کیا اور باہر آ گیا اور سچ تو یہ ہے کہ میجر صاحب کی بدتمیزی پر پیار بھی آیا لیکن بدقسمتی سے یہ بدتمیزی کسی قدر اُن کی پریشانی کا باعث بنی۔ ہُوا یہ تھا کہ مَیں میجر صاحب کے پاس اُن کی ہمکلامی کا فخر حاصل کرنے کے علاوہ سرکاری کام سے گیا تھا۔ مجھے کیمپ کے کمانڈانٹ صاحب نے چند ضروری کاغذات دے کر بھیجا تھا کہ میجر مڈدے کو پہنچا دینا۔ ایک سیکنڈ کی مہلت میں یہ کاغذات پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئی؛ چنانچہ دوپہر کو جب کرنل صاحب لنچ پر ملے تو اُنہیں واپس کر دیے اور ساتھ ہی وجہ بھی عرض کر دی۔ یہ معلوم نہیں کہ بعد میں میجر مڈدے اور کرنل صاحب کے درمیان کیا گزری؛ البتہ بعد ازاں جب کبھی ہم نے میجر مڈدے کے دروازے پر دستک

دی تو وہ یہ نہیں پُوچھتے تھے کہ کیا چاہتے ہو، بلکہ یہ کہ کیا لائے ہو اور جی کڑا کر کے ایک بالکفایت سی مُسکراہٹ کا انتظام بھی فرما دیتے۔

سچ تو یہ ہے کہ میجر مڈوے کی بدتمیزیاں ہماری زندگی کا حصّہ بن گئی تھیں لیکن بدقسمتی سے ایک دو ناموافق حادثوں کے بعد میجر صاحب خوش تمیزی پر اُتر آئے جس کا ہماری صحت پر خاصا ناگوار اثر پڑا یعنی ہم ہُوئے کافر تو وہ کافر مُسلماں ہو گیا؛ اور خالی مُسلمان ہی نہیں پکّا حاجی بن گیا۔

لیکن جس چیز نے قصبہ شاعیبہ کو رنگین کر دیا وہ غریب مڈوے کا لہو نہ تھا بلکہ خُوبانِ بصرہ کے لب و رخسار کا غازہ تھا ___ بصرہ شاعیبے سے بہت دُور نہ تھا یہی کوئی چودہ پندرہ میل۔ چنانچہ ہماری ہر شام بصرہ میں گزرتی تھی۔ پہلی مرتبہ ہم ایک اتوار کی صُبح کو وہاں گئے اور یہ دیکھ کر حیرت سی ہُوئی کہ عراقی مرد تو ہم ہندیوں کی طرح گورے بھی ہیں اور کالے بھی، لیکن خواتینِ عراق سب کی سب لالہ رُخ اور سمن بر ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لالہ و سمن کسی قدر افلاس کے خس و خاشاک سے آلودہ تھا، لیکن ہم آملہ درجہ دوم کے متوالے ہندوستانیوں کے دل و دماغ کو معطّر کرنے کے لیے کافی تھا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ بصرہ کے بازاروں کی بدکاریں بھی اگر کسی طرح ہندوستانی ریاستوں میں پہنچ جائیں، تو بغیر تعارف کے جونیئر مہارانیاں بن جائیں۔ اِس قدر بے محابا حُسن کو یُوں چیتھڑوں میں ملبوس اور ننگے پاؤں دیکھ کر دل دُکھنے سا لگتا، بلکہ ہمارے ایک دوست نے تو جب پہلی عراقی حسینہ کو ننگے پاؤں دیکھا، تو تڑاق سے اُسے جُوتے خرید دیے۔ فرمانے لگے:

”کیا ستم ہے یار، پھُولوں جیسے نازک پاؤں اور انگاروں کی سی زمین پر چلیں، میری حمیّت کو گوارا نہیں۔“

لیکن بعد میں جب ایسی ہی گُل اندامों کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیکھے جو بلا تکلّف بصرہ کے بازاروں میں ننگے پاؤں پھر رہی تھیں، تو کسی قدر سراسیمہ سے ہو گئے۔ غالباً دل ہی دل میں

آپ نے اپنی پونجی کو ان برہنہ پا حسیناؤں کی تعداد پر تقسیم کیا اور دیکھا کہ حاصل قسمت اتنا بھی نہیں کہ فی حسینہ ایک اُنگلی بھی ڈھک سکے۔ اِس سادہ تقسیم کے سوال نے اُنہیں گہری رُومانی دُنیا سے نکال کر بصرے کے تپتے چوک میں لا کھڑا کیا؛ چنانچہ اب وہ بے پاپوش دوشیزاؤں کو دیکھتے تو اُن کی حمیّت کو کوئی واضح ٹھیس نہ لگتی۔

لیکن بصرہ میں باپاپوش خواتین بھی تھیں اور قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بالآخر ہمارے دوست کو پالا پڑا، تو ایک ایسی خاتون سے جس کے جوتے کی نوک میں ایک ننھا سا پیارا سا ایٹمی وار ہیڈ نصب تھا۔ ساتھ ہی اِس سراپا ناز کو دھول دھپا سے بھی خاص پرہیز نہ تھا؛ چنانچہ ایک روز ہمارے دوست پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑی اور غریب کسی پلیش دستی کے بغیر اس خاتون کے ذوشغل حملے کا شکار ہو گئے اور ہفتہ بھر کسی کو مُنہ بلکہ سر دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہُوا کہ جوتے کا جارحانہ اِستعمال ہندوستانی خواتین کا ہی اجارہ نہیں، بلکہ یہ حوّا کی بیٹی کا عالمگیر ہتھیار ہے ـــــ بہرحال محض جوتے کا بپا کردہ حشر ایسی چیز نہ تھی جس سے ہمارے دوست سے جنونِ عشق کے انداز چھُٹ جاتے؛ چنانچہ چند ہی دِنوں میں آپ کے نہ صِرف بال اُگ آئے بلکہ اِس زود پشیماں خاتون کے دِل میں مہر و محبّت کے چشمے بھی اُبلنے لگے۔ آج کل جب کبھی یہ میاں بیوی ہمیں پاکستان میں مِلتے ہیں، تو ہم شرارتاً سکول کے دِنوں کا مصرع گنگناتے ہیں۔

ع المدد پاپوشِ جاناں سر مِرا کھُجلائے ہے!

لیکن حسینانِ بصرہ کے ساتھ ہمارے تمام مُعاملے شادی پر ہی ختم نہ ہُوئے بلکہ بعض اوقات تو ہمیں نہایت ہی جگر خراش ناکامیوں کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ مثلاً مسعودیہ ہوٹل کی وہ رنگین شام کہ اُس کا وسیع دالان حسینوں سے پُر تھا اور لفٹننٹ کیانی یکا یک ایک فتنہ رفتار پر کھڑے کھڑے دِل لٹانے کو آمادہ ہو گئے۔ ہر چند کہ وہ کافرہ اِس خراجِ عظیم کی مستحق تھی؛ تاہم

اس کا انتخاب اِس اعتبار سے ناموزوں تھا کہ بیاہتا تھی اور اپنے دُولہا کے عین پہلو میں بیٹھی تھی۔ معلوم ہُوا کہ عراقی نفر انہوں میں سے ہے اور مسز الیاس کہلاتی ہے۔ اس کے دُولہا میاں اِس قدر واضح طور پر بے ضرر اور تہ دل سے یتیم نظر آتے تھے کہ کیانی نے انہیں ایک نظر دیکھا اور خارج از بحث کر دیا، پھر اپنی جگہ سے اُٹھے اور اُٹھ کر مسز الیاس کے قدم جا لیے اور اُس سے تخلیے میں بات کرنے کی التجا کی۔

مسز الیاس کی زندگی میں کیانی غالبًا پہلے پُجاری نہ تھے جنہوں نے اُس کے قدموں پر دِل کی بھینٹ چڑھائی ہو؛ چنانچہ اُس نے سکُون اور وقار کے ساتھ اجنبی کی اِلتجا سُنی اور پھر اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ گویا کہتی ہو کہ یہ وہ مقام ہے جہاں جواب دینا خاوند کا کام ہے اور کِتنا ہی بے جان خاوند کیوں نہ ہو، یہ آگ بگولا ہونے کا وقت ہوتا ہے؛ چنانچہ خاوند موصوف حسبِ توفیق آگ بگولا بھی ہوئے اور اُٹھ کر کچھ کر مرنے کو بھی تھے کہ کیانی نے اُن کے سر کو ہاتھ سے دبا کر کُرسی پر بِٹھا بلکہ چپکا دیا۔ کیونکہ اس کے بعد مسٹر الیاس نے اُٹھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اب اُن میں آگ باقی تھی نہ بگولا۔ بس ایک فیل شُدہ خاوندیت لیے کر حالاتِ حاضرہ کا اُتار چڑھاؤ دیکھنے لگے۔

اُب مُعاملہ مسز الیاس اور کیانی کے درمیان تھا۔ مسز الیاس نے موقع کا جائزہ لیا۔ کیانی کو ایک واجبی قہر سے دیکھا، پھر اُٹھی اور اُٹھ کر اس کے رُخسار پر ایک ہلکا سا تھپیڑ لگایا۔ وہی تھپیڑ جو مردانہ بدتمیزیوں کا روایتی نسوانی جواب ہوتا ہے۔ اِس سے کوئی جسمانی گزند پہنچانا مقصُود نہیں ہوتا؛ البتہ اس کا اخلاقی گھاؤ خاصا گہرا ہوتا ہے۔ اِس تھپیڑ کو کیانی نے ایک گونہ اطمینان سے برداشت کیا ـــــ بظاہر اُن کی زندگی میں بھی یہ پہلا حادثہ نہ تھا ـــــ اگلے لمحے میں مسز الیاس کا رُوئے سخن اس چیز کی طرف تھا جو اس کا خاوند کہلاتا تھا۔ اس قابلِ احترام خاتُون نے پہلے تو اُسے گہری حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور پھر

اُس کے بائیں گال پر ایک سنسناتا تھپڑ جما کر حقِ زوجیت ادا کیا۔ تھپڑ کی گونج اور مضروب کی چیخ سے واضح تھا کہ یہ محض اخلاقی تھپڑ نہ تھا۔ یہ ہو چکا تو مسز الیاس نے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھایا اور ایک تمکنت کے ساتھ تنہا ہوٹل سے باہر چل دی۔

حینان بصرہ کا ذکر جتنا جمیل ہے، اُتنا ہی طویل ہے، لیکن اس کی تفصیل سے احتراز ہی مناسب ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں کی زندگی تھپڑوں اور بوسوں کا ایک کھٹ مٹھا مرکب تھی اور اِس میں شک نہیں کہ شائبہ کے بے معنی اور بے رنگ دن محض اس لیے قابلِ برداشت تھے کہ ہر دن کے انجام پر بصرے کی بامعنی اور رنگین شام تھی، لیکن ظاہر تھا کہ بصرے کے لذائذ ہمارے قوائے عسکری پر بتدریج غالب آ رہے ہیں اور اگر ہم سے کوئی جنگی خدمت لینا مقصود تھا، تو یہ وقت تھا کہ ہمیں بصرہ سے نکال کر کارزار میں ڈال دیا جاتا اور یہ دن دُور نہیں تھا۔

اواخر اکتوبر میں ہمیں اچانک حکم ملا کہ فی الفور ہیڈ کوارٹر دسویں ڈویژن میں پہنچو۔ یہ جنگ آزما ڈویژن اس وقت حبانیہ میں تھا۔ وہی حبانیہ جہاں مشہور برطانوی ہوائی اڈہ تھا چنانچہ دُوسرے روز شائبہ اور بصرہ کو حسرتناک سی الوداع کہی اور بصرہ کے سٹیشن سے بغداد کی گاڑی لی۔ اس سفر میں ہمارے ساتھی لفٹننٹ سپنس (SPENCE) تھے۔

گاڑی کے ڈبے میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ خُلد کا در کھُل گیا ہے۔ ڈبہ کیا تھا، ایک رواں دواں دیوانِ خاص تھا۔ نفیس اور نرم صوفے، نازک ریشمی پردے، ملائم اور گداز قالین۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی قلوپطرہ داخل ہو گی اور کہے گی:

"معاف رکھیے، آپ غلطی سے آ گئے ہیں، یہ کمرہ میرے لیے ریزرو ہے۔"

ہم نے پیچھے وطن میں بھی پہلی مرتبہ فسٹ کلاس میں سفر کرتے وقت ذرا عیش سا محسوس کیا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ وہ احساس سراسر ناروا تھا اور اب کہ حقیقی عیش سے

ہمکنار رہتے، ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور اپنے آپ کو کھو دیا۔

یہ ہو چکا تو ہمیں حیرت ہوئی کہ آخر عین جنگ کے زمانے میں کہ غریب عراق کو پاؤں کے لیے جوتے میسّر نہیں، اِن سنہری روپہلی ڈبوں کی عیاشی کیا معنی؟ اور تفتیش پر یہ معنی نکلے کہ یہ مُجلّا و مُطلّا ڈبے حکومتِ ایران کی ملکیت ہیں یا تھے جو حافظ و خیام کے خوش مذاق ہموطنوں نے جرمنی سے منگوائے تھے کہ سفر کرتے وقت آب رکنا باد و گلگشتِ مصلےٰ کی کمی محسوس نہ ہو، لیکن گزشتہ اگست کی چند روزہ جنگ میں یہ مالِ غنیمت جرمنی سے آتے ہوئے انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اور بصرے میں اُتار دیا گیا اور نتیجہ یہ کہ وہ عیش جو فقط تحمل حسین خاں کے لیے بنا تھا، سپنس اور محمد خاں کے حصے میں آ گیا ------ یہ سفر اگرچہ گھڑیوں میں کٹ گیا، لیکن جو گھڑیاں قلوپطرہ کے آغوش میں کٹیں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر غنیمت ہوں گی۔

دوپہر کے قریب ہماری گاڑی بغداد پہنچی۔ ہمیں بتایا گیا کہ باہر ہمارے لیے پندرہ ہنڈرڈ ویٹ کا ایک فوجی ٹرک انتظار کر رہا ہے۔ یہ سُنا تو یُوں محسوس ہوا جیسے قلوپطرہ نے آغوش سے نکال کر پلیٹ فارم پر دے مارا ہو۔ بہرحال اِس ٹرک نے ہمیں اور سپنس کو حبانیہ لے جانا تھا۔ (حبانیہ بغداد سے مغرب میں کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے) سپنس بولے: "آؤ ذرا حبانیہ جانے سے پہلے بغداد میں تو جھانک لیں۔" دجلہ کے پُل سے گزر کر شارع رشید میں داخل ہوئے۔ یہی بغداد کا دل تھا اور ہے۔ وُہی بصرہ کے سے تیور، اگرچہ ذرا زیادہ تیکھے۔ دُخترانِ بغداد سے نگاہ لڑی تو محسوس ہوا کہ مقابلے میں نگاہ نہیں تیغِ نگاہ ہے۔ بڑا غیر مساوی مقابلہ تھا؛ چنانچہ بیشتر اس کے کہ کوئی سنگین واردات ظہور پذیر ہوتی، ہمارا ٹرک حبانیہ کی شاہراہ پر تھا۔

یہ وُہی سڑک تھی جس پر چند ہفتے پہلے رشید علی کی حامی عراقی فوج کو انگریزوں کے ایک بریگیڈ نے ایک دِن میں شکست دی تھی۔ یہ خیال آیا اور دل میں پھر وُہی کرب کا احساس

اُٹھا کہ کاش یہ لوگ جیتتے یا کم از کم کچھ لڑ کر ہارتے۔

حبانیہ کیمپ میں پہنچے جہاں ایک سمندر نما جھیل کے کنارے دسویں انڈین انفنٹری ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر مقیم تھا، یعنی ہماری منزلِ مقصود۔ اُترے اور گرد و پیش کا جائزہ لیا لیکن اِس جائزے میں جھیل کے سوا کچھ پلّے نہ پڑا۔ جدھر دیکھو جھیل ہی جھیل۔ یہ باور کرنے کے لیے کہ زمین پر کھڑے ہیں، سینۂ خاک کو پاؤں سے دبانا پڑتا تھا ورنہ چلتے چلتے بھی یہ احساس ہوتا کہ تیر رہے ہیں۔ جھیل کے گہرے نیلے پانی میں ایک ہیبت ناک سی کشش تھی اور بے اختیار اس میں کود پڑنے کو جی چاہتا تھا، یعنی اپنے آپ سے مشورہ کیے بغیر۔ اور اس زخار نگین جھیل میں کود جانا شاید ایسا صحت بخش ثابت نہ ہوتا؛ چنانچہ ہم نے اپنے آپ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور لبِ آب ہی سے جھیل کا تماشہ کر کے گزر گئے۔

چند قدم ہی گئے تھے کہ وہ خیمے آ گئے جو ہمیں قیام کے لیے ملے تھے۔ یہ پستہ لپستہ نابالغ سے خیمے اپنے وزن کے لحاظ سے FORTY POUNDERS یعنی "بیس سیرے" کہلاتے تھے۔ بمشکل ایک آدمی اِن میں رہ سکتا تھا اور آدمی سے مراد آدمی ہے۔ وہ حضرات جو بیشتر پیٹ پر مشتمل ہوتے ہیں، اس خیمے کے لیے آدمی سے ذرا فالتو نکلتے۔ خوش قسمتی سے ایسے لوگ یہاں نہیں پہنچے تھے۔ سب شائبہ کے لنگر خانوں میں رہ گئے تھے۔

بالآخر ہمیں ایک خیمہ مِلا۔ بستر کھولا، ہاتھ منہ دھویا۔ یا بقولِ سینس "واش" کیا۔ کپڑے بدلے —— اگرچہ ایک خاکی جوڑا اُتار کر دوسرا خاکی جوڑا پہننا کپڑے بدلنے سے مختلف فعل ہے —— اور حبانیہ کے سینما میں فلم دیکھنے چل دیے۔ جی ہاں! یہاں فلمیں بھی تھیں، یعنی باقی تمام خرافات کے علاوہ، اِس لیے کہ یہاں جنگ کا زمانہ تو تھا، صِرف جنگ نہ تھی۔ انگریزوں نے اِس ہوائی مستقر میں ایک طویل زمانۂ امن گزارا تھا؛ چنانچہ حبانیہ تفریحات و آسائش کے اعتبار سے برطانیہ کا لختِ بلکہ لختِ جگر نظر آتا تھا۔ حبانیہ کی سڑکوں پر انگریز لڑکیاں اِس

بیابا کی سے پھر رہی تھیں گویا پٹا ڈلی میں گھوم رہی ہوں۔ اگر فرق تھا تو یہ کہ جتنا حبانیہ برطانیہ کی نسبت گرم تھا، اتنا ہی اِن دخترانِ فرنگ کا حُسن لباس کی آلائش سے پاک تھا یعنی ہر چند کہیں کہ تھا، نہیں تھا۔ بقولِ شخصے اِس اشتعال کو برداشت کرنے کے لیے پیغمبر ہونے کی ضرورت تھی۔ ہماری پیغمبری کے متعلق کوئی CASUALTY ○ وغیرہ تو نہ چھپی، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ یہ اشتعال ہم نے کمال صبر کے ساتھ برداشت کیا۔

ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں ہمارا قیام مُسافرانہ تھا کہ ایک نیم لفٹین کی وہاں گنجائش نہیں ہوتی۔ ہماری پکّی منزل بریگیڈ تھی؛ چنانچہ صبح ناشتے سے فارغ ہُوئے تو ہمیں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا گیا۔ میجر سٹیڈ نے ہمیں ۲۰ بریگیڈ کے سگنل سیکشن میں "سیکنڈ اِن کمانڈ" ہونے کی نوید دی۔ ساتھ ہی تقرّر کے کاغذات دیے اور دُعا اور پیار کے ساتھ ٹرک میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔

○ فوج میں کسی شخص کی ترقّی، تقرّر، تبادلہ یا انعام کے متعلق کسی قسم کا تحریری اعلان ہو تو اُسے (CASUALTY) چھپنا کہتے ہیں۔

۷

صحرائے کیارہ اور برگیڈ آفیسرز میس

۲۰ برگیڈ اُس وقت بغداد کے شمال میں کوئی ڈیڑھ سَو میل دُور کیارہ کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ ہم نے بغداد پہنچنے پر گاڑی لی۔ رات سفر میں کاٹی اور صبح سویرے کیارہ کے اسٹیشن پر اُترے جہاں ایک اور اُٹل ٹرک ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے برگیڈ ہیڈ کوارٹر تک اور سینکڑوں میل ارد گرد ایک پسماندہ اور پابرہنہ سا صحرا تھا۔ کیارہ اگر کسی آبادی کا نام تھا، تو وہ بالائے زمین نہ تھی۔ ہر طرف ویرانہ تھا۔ ظاہر تھا کہ ۲۰ برگیڈ کے لوگوں کو ان مسائل سے واسطہ نہیں جو حضرت آدم کو باغِ عدن میں پیش آئے تھے۔

ریلوے اسٹیشن سے سیدھا برگیڈ کے آفیسرز مَیس میں پہنچا۔ لفظ مَیس سے کسی عالیشان عمارت کے تصوّر کی ضرورت نہیں۔ سیدھا سادا فوجی خیمہ تھا۔ اندر داخل ہُوا تو تمام افسر ناشتے میں مصروف تھے۔ ہمارے رہبر نے پہلے برگیڈیئر صاحب سے اور پھر دُوسرے افسروں سے ہمارا تعارف کرایا۔ تعارف ختم ہو چُکا تو جس گفتگو میں ہم مُخل ہُوئے تھے پھر سے جاری ہوئی۔ برگیڈ کمانڈر صاحب جو ایک معمّر سے بزرگ تھے، ایک نوجوان کپتان سے یُوں مخاطب ہوئے:

"بیٹا، تُم بغداد جا رہے ہو؟"

"یس سر"

"تو پھر دیکھنا، شاید اُس کی کوئی بہن بھی ہو۔"

"بہن تو ہے سر، مگر "

"مگر کیا؟"

"آپ کو جیفری سے اجازت لینا پڑے گی۔"

بیلیٹر نے جیفری کا نام لیا تو ایک خوش رُو کپتان قریب کی کرسی سے اُٹھا۔ کمر سے جُھک کر بریگیڈیئر صاحب کو سلام کیا اور بولا:

"سر اِس معاملے میں شرکت نہیں ہوتی۔"

اِس پر ایک قہقہہ پڑا اور خود بریگیڈیئر صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

اگر یہ مختصر سی گفتگو کسی قاری کی سمجھ میں نہ آئے، تو یہ گفتگو کا قصور ہے۔ خود مجھ پر اس کے رموز آہستہ آہستہ منکشف ہوئے۔ اور جب منکشف ہو چکے تو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا کہ ایک صحت مند لیکن بہرحال بوڑھا بریگیڈیئر اپنے نوجوان ماتحت افسروں سے اِس حد تک بے تکلفی کی باتیں کر سکتا ہے۔ دِلِ ناداں کو طرح طرح کے سوال سُوجھے۔ شرم کیا چیز ہے؟ حیا کیا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ضبط کیا ہوا جس پر سارا فوجی نظام قائم ہے؟

اِن سوالوں کے جواب بریگیڈ میں چند دِن رہنے کے بعد ہی معلوم ہو گئے۔ جہاں تک ضبط کا تعلق ہے، یہ میس کی بے ضبطی صرف درُونِ میس کی بات تھی۔ میس کے باہر وُہی حفظِ مراتب تھا جو فوج میں ہوتا ہے۔ سینئر کا حکم اور جونیئر کی لبیک، خواہ تعمیلِ حکم میں جان ہی کیوں نہ جائے، بلکہ یہ کہ میس کی آزادی ہی باہمی احترام اور محبت کی ضامن تھی۔ اچھی فوج کے سپاہیوں میں ایامِ جنگ میں ایک عجیب وُلولہ انگیز دوستی اور جان نثاری کا جذبہ پیدا ہو دیتا ہے۔ ہزار قالب مگر یک جان، اور جہاں ماحول ایسی بے پایاں محبت کا ہو وہاں مصنوعی ضبط کا رشتہ غیر ضروری اور بے معنی سا ہو جاتا ہے، مگر یہ فقط حوصلہ مند فوجوں کا خاصہ ہے۔

خوف زدہ اور شکست خوردہ فوجوں کا حال کسی قدر مختلف ہوتا ہے۔ افسر چڑچڑے اور اپنے رُعب کی حفاظت میں آستینیں چڑھائے ہوئے، باہر سے بپھرے ہوئے مگر اندر سے کانپتے ہوئے، سپاہی بُزدل اور حریص۔ باہمی رفاقت کا یہ عالم کہ ساتھیوں میں سے کسی کی آنکھ چوکی، تو حسبِ توفیق اُس کی جیب یا گلا کاٹ لیا۔ ایسی فوجوں میں قیامت کی نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے اور ایسے ماحول میں جان نثاری کی نہیں جاتی، کرائی جاتی ہے۔

رہا شرم و حیا کا مُعاملہ، تو شرم کی وہ قسم جو ہمارے ہاں رائج ہے ۲۰ بریگیڈ کے مَیس تک نہیں پہنچی تھی اور اس کے لیے وہ لوگ کچھ معذرت خواہ بھی نہ تھے۔ ایک تو انگریز کا حیا کا تصور ہی ہماری دیسی حیا سے بہت مختلف ہے، پھر جنگ کا زمانہ ہوا اور کیارہ جیسا ویرانہ، جہاں شش جہات میں مرد ہی مرد تھے اور کوسوں تک کسی نسوانی گوش کے برآواز ہونے کا امکان نہ تھا، تو وہاں حیا ایک بیکار بلکہ گرانبار تکلف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگرچہ غالبؔ کا دِلّی میں بیٹھے بیٹھے وضعِ احتیاط سے دَم رُکنے لگتا تھا تو صحرا نشینانِ کیارہ کے لیے تو پاسِ حیا یقیناً دمے کا باعث بنتا۔ تھوڑی سی چاک گریبانی سے حیا کا تو کچھ ایسا نہ بگڑتا تھا، لیکن اِن قوم کے سرفروشوں کی صحت بنی رہتی تھی۔

یہ شاید انہی روایات کا نتیجہ ہے کہ آج بھی فوجی افسروں کا اندازِ گفتار غیر فوجی حضرات کے لیے عرق آور ثابت ہوتا ہے اور ان کے الفاظ کا انتخاب بعض نازک طبع سویلین بھائیوں کو اس شدّت سے مردانہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بات سُننے کی بجائے اپنی عصمت بچانا شروع کر دیتے ہیں، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ فوجیوں کا یہ طرزِ کلام ایک خاص قسم کی مردانہ محفلوں تک ہی محدود ہے۔ خواتین کی موجودگی میں اُن کا اندازِ تکلّم یکسر بدل جاتا ہے۔ یہ فوجی روایات کا حِصّہ ہے کہ خواتین موجود ہوں تو یہ اکھڑ لوگ بے حد ریشمی اور ملائم گفتگو کرتے ہیں۔ اوّل تو کسی کثیف موضوع کو چھیڑنا ہی خلافِ شجاعت سمجھتے ہیں، لیکن اگر کسی مقام پر

بادہ وساغر کہے بغیر نہ بنے تو انہیں یہ کہنا بھی آتا ہے۔ یہ احتیاط ہمارے عوام میں کسی قدر کمیاب ہے۔ عام مجالس میں لوگ خواتین کے سامنے ایسے کلمات کا استعمال روا سمجھتے ہیں جو خاصے ناروا ہوتے ہیں۔ یہ دُوسری بات ہے کہ ہماری خطا پوش خواتین انہیں حافظِ قرآن نہ سمجھتے ہُوئے بھی چھوڑ دیتی ہیں۔

ناشتے کی میز پر ہمارے سوا تمام انگریز تھے۔ اگرچہ تمام افسروں نے مع برگیڈیر صاحب کے ہمارا پُرتپاک خیر مقدم کیا تھا؛ تاہم واحد دیسی ہونے کی وجہ سے میں اپنے آپ کو بے یار و مدد گار محسوس کر رہا تھا، لیکن کیا دیکھتا ہُوں کہ خیمے کے دروازے سے ایک دیسی کپتان میس میں داخل ہوتا ہے۔ سانولا سا رنگ، باریک تیر نما سی مُونچھ، بال بال قرینے سے کٹا ہُوا، ایک ہاتھ میں پائپ اور دُوسرے میں اخبار۔ اپنے ہم وطن کو دیکھا، تو میری آنکھوں میں جیسے روشنی سی لہرا گئی اور انتظار میں تھا کہ میری طرف دیکھے تو میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ راز کی باتیں کہہ ڈالوں کہ خُوب گزرے گی ــــــ لیکن بدقسمتی سے کپتان صاحب کی نگاہ مجھ پر ٹکنے ہی نہ پائی اور ایک دفعہ ذرا سی پڑی بھی، تو اُنہوں نے جیسے کھینچ کر واپس لے لی کچھ حیرانی سی ہُوئی کہ ؎

ہم ہیں مشتاق اَور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

کپتان صاحب ناشتے کے لیے بیٹھ گئے اَور برگیڈیر صاحب نے ہمارا اُن سے تعارف کرایا۔ لیکن کپتان صاحب نے فقط ایک لمحے کے لیے اپنی پلیٹ سے توجہ ہٹائی، بلکہ توجہ کو تو غالباً وہیں رکھا صرف اپنی ٹھوڑی گھمائی اور ایک جمائی میں لپٹی ہُوئی HOW DO YOU DO? ○ کہہ کر ٹھوڑی اُلٹے رُخ گھما کر اُسی زاویے پر لے گئے جہاں پہلے تھی۔ معاً مجھے وہ شیر یاد آیا جو میٹرو گولڈون میئر کی فلموں کے شروع میں ٹھوڑی کو پچھلی طرف موڑ کر ہلکی سی احتجاجی

○ تعارف کے موقع پر انگریزوں کا رسمی جملہ: مزاج اچھے ہیں؟

انگڑائی لیتا ہے اور پھر سامنے دیکھنے لگتا ہے۔ شاید اسی واقعہ کا اثر ہے کہ میں آج کل بھی جب یہ شیر فلم میں دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے جیسے اسے بھی کوئی برگیڈیئر تعارف پر مجبور کر رہا ہے۔

تو فرض کر لیں کہ اِن حضرت کا نام کیپٹن مہتہ تھا۔ اب مہتہ صاحب کو حق تھا کہ طبیعت کے اکھڑ ہوں، مزاج کے سنکی ہوں اور گفتار کے سڑیل ہوں۔ غرض ہر پہلو سے بدتمیز ہوں، لیکن بدتمیزی میں مساوات برتیں۔ لیکن ہوا یہ کہ مہتہ صاحب نے مجھ سے تو مقاطعہ کر لیا، مگر انگریزوں کے آگے دوہرے ہو ہو کر بچھنے لگے۔ کسی سے گڈ مارننگ کسی سے ہیلو۔ خالص انگریزی انداز مگر ذرا کم خالص انگریزی زبان میں ہر ایک سے خیریت مزاج پوچھی اور انگریزوں کی عادت کے مطابق مزاج پرسی کے علاوہ خواب پرسی بھی کی یعنی رات نیند تو اچھی آئی تھی، پھر برگیڈیئر صاحب کو مخاطب کر کے موسم پر تبصرہ کیا۔ کیونکہ ایسا نہ کیا جاتا، تو آپ کی انگریزیت ابھی خام تھی ـــــ وہ لوگ تو کپتان صاحب کو جانتے ہی تھے، ظاہر تھا کہ آج ان کی صاحب بہادری کی نمائش میرے استفادے کے لیے ہے اور وہ مجھے سبق دے رہے تھے کہ زنہار ہمیں اپنے جیسا NATIVE نہ سمجھیو۔ تم دیسی ہو تو ہو، ہم صاحب ہیں۔

اَب اس خاکسار کو مرعوب ہونے میں بھی عذر نہ تھا، لیکن کچھ مہلت چاہتا تھا کہ مہتہ صاحب کا اقتدارِ اعلیٰ قبول کرنے سے پہلے ذرا انہیں تفصیل سے دیکھ تو لیں اور تفصیل میں گئے تو ہمیں مہتہ صاحب سے گہری ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ بات یہ تھی کہ کیپٹن مہتہ صاحب حقیقتاً صاحب بہادر نہ تھے۔ فقط صاحب بہادری کے مریض تھے۔ اُن سے اُلجھنا بیکار تھا، بلکہ ان کی تیمارداری کے سلسلے میں ان کی باجگزاری بھی قبول کر لی، لیکن وہ اپنی دیرینہ بیماری سے شفایاب نہ ہو سکے اور ہمارا دیسی پن معاف نہ کیا۔ سال بھر میں ہم سے دو چار ہی باتیں کیں اور وہ بھی پائپ سے چھنی ہوئی انگریزی میں۔

لیکن برگیڈ میں کیپٹن مہتہ کے علاوہ اُور لوگ بھی تھے اور خوش قسمتی سے مزاج کے

لحاظ سے بالکل غیر مہتمّ۔ مثلاً میرے اپنے سگنل سیکشن کے کیپٹن مینسفیلڈ ایک متفنی مگر دلفریب شخصیّت کے مالک تھے۔ سالہاسال سارجنٹ رہنے کے بعد آخری عمر میں افسر بن گئے تھے لیکن جیسے عشقِ بتاں میں عمر گزارنے کے بعد مسلمانی کے انداز نہیں آتے، کپتان صاحب کی شکل و صورت یا حرکات و سکنات سے بھی افسرانہ آثار ناپید تھے۔ وہی سارجنٹوں کا درندہ نما چہرہ اور چہرے سے درندہ تر زبان۔ آپ کی ہر بات بھکڑ کی شکل میں منہ سے نکلتی۔ ذرا مزے میں آکر باتیں کرتے تو کہرام مچ جاتا۔ پاکیزہ سے پاکیزہ مضمون بھی گالی کا سہارا لیے بغیر ادا نہ کر سکتے: البتّہ گالیاں اِس قدر بلیغ کہ کوئی کھا کے بے مزا نہ ہو۔ یُوں بھی انگریزی گالیاں ہماری گالیوں کی طرح لبادہ اوڑھے بغیر وارد نہیں ہوتیں، بلکہ خاصی ملبوس اور ملفوف ہوتی ہیں۔ کپتان صاحب کی طبیعت میں تصنّع نہ تھا۔ سیدھا سادا انسان اور دوستوں پر شیدا۔ مجھے قُربِ خاص حاصل تھا کہ وہ کمانڈر تھے اور مَیں اُن کا نائب۔ زندگی ایک مسلسل ہنسی تھی۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ کام نہیں کر رہا بلکہ لگاتار مزاحیہ فلم دیکھ رہا ہوں۔ دو انگریزی الفاظ جنہیں انگریز شرفاء بولنا تو کجا، سُن کر بھی بدک جاتے ہیں اُن کی زبان سے تقریباً جھڑتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے کہا:

"اگر یہ دونوں الفاظ آپ سے چھین لیے جائیں تو؟"

بولے: "بس گونگا ہو جاؤں گا اور کیا؟"

لیکن اُن کا انگریزی فقرہ اِتنا سادہ نہ تھا۔

"GOD AL– —MIGHTY, I WILL BE– —DUMB !"

خالی جگہوں میں جڑاؤ کا بے نظیر کام تھا، لیکن اس کاریگری کی اُردو میں نمائش مشکل ہے میرے پہنچنے کے بعد ہی کیپٹن مینسفیلڈ کا تبادلہ ہو گیا اور اُن کی جگہ کیپٹن شاء (SHAW) آ گئے۔ نارمن شاء کیا آئے، کیارہ کے ویرانے میں پھُول کھل اُٹھے۔ کیا خوش وضع و خوش اوقات اِنسان تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دوست بن گیا اور ہمیں دوست بنا

لیا۔ میرا سینئر تھا، لیکن یہ اس لیے کہ کاغذوں میں درج تھا۔ کیپٹن شاہ نے مجھے اِس بات کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہمارے جوان شاہ پر جان دیتے تھے اور وہ اسی محبّت کے قابل تھا۔

برگیڈ کے دیگر افسروں کے ساتھ ہمیں ذرا کم واسطہ تھا، لیکن رہتے ایک ہی مَیس میں تھے۔ گویا ایک ہی کنبہ تھا۔ دن میں کئی بار اکٹھے ہوتے اور راتیں تو اکثر میس میں ہی سحر کر دیتے۔ ولسن۔ جیفری۔ ٹرن بل۔ سپوزر۔ مارگن۔ سٹمسن۔ مچسن۔ ہرلی۔ شاہ اور ہمارے برگیڈ کمانڈر رابرٹس (جو بعد میں سر اوگلوی رابرٹس بنے) اس مَیس کے ارکان تھے۔ طبیعتیں سب کی جُدا جُدا لیکن اپنی جگہ ہر ایک ہیرو۔

اِن میں سے ایک کا ذکر ذرا تفصیل کا محتاج ہے۔ یہ تھے کیپٹن ہرلی۔ برگیڈ میں واحد اینگلو انڈین تھے اور مجھ سے چند روز بعد آئے تھے، لیکن چونکہ پورے انگریز نہ تھے، کیپٹن مہتہ نے ان کے آنے سے کئی دن پہلے ان کے جرائم کے اعداد و شمار اور بداعمالیوں کی فہرست شائع کر دی تھی، بلکہ ضمیمے کے طور پر جُملہ افسروں کو فرداً فرداً بھی تبلیغ کرتے رہتے تھے کہ ہرلی کی آمد برگیڈ کے لیے کس قدر مضرِ صحت ثابت ہوگی۔

ایک اینگلو انڈین کو بدنام کرنا نسبتاً آسان ہے کہ ایک تاریخی حادثے کی وجہ سے اِن لوگوں کے خلاف یُوں بھی دھیمی دھیمی نفرت ہر دل میں سُلگتی رہتی ہے؛ لہٰذا کسی اینگلو انڈین کو مکمل طور پر نذرِ آتش کرنے کے لیے فقط ملائم سی ہی جمالو کی ضرورت ہوتی ہے اور مہتہ صاحب تو گویا کیپٹن جمالو تھے۔ بیچارہ ہرلی برگیڈ میں پہنچا، تو لوگوں نے ناک پر رُومال رکھ لیے لیکن ہرلی اِس بدتمیزی سے ذرا برہم نہ ہُوا اور اپنی گفتار و کردار سے ایسی دِلکش شخصیت کا مظاہرہ کیا کہ ہمارے دِلوں کو سچ مچ موہ لیا۔ مہتہ صاحب اسے اپنی شکست سمجھے۔ اِتفاق سے برگیڈیئر صاحب کہیں گئے ہُوئے تھے۔ واپس آئے اور ابھی ہرلی سے مِل نہ پائے تھے کہ مہتہ اُن کی خدمت میں جا پہنچا اور انہیں فی الفور فتنۂ ہرلی سے آگاہ کرنے لگا۔ برگیڈیئر صاحب نے پُوچھا:

"ہرلی میں کیا خرابی ہے؟"

مہتہ بولے: "بے شمار خرابیاں ہیں۔"

"مثلاً؟"

"جوا کھیلتا ہے!"

"اور؟"

"شراب پیتا ہے!!"

"اور؟"

"عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے!!!"

برگیڈیئر صاحب بولے: "بڑا خوش مذاق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جائیں اُسے کہیں، آج شام چائے میرے ساتھ پیے۔"

یہ سُن کر مہتہ کو سخت مایوسی ہوئی۔ بولا:

"سر، آپ کچھ ہی کہیں، میری چھٹی حس کہتی ہے کہ ہرلی اچھا آدمی نہیں ہے۔"

برگیڈیئر صاحب زور سے ہنسے اور بولے:

"مہتہ، تمہاری چھٹی حس تو بہت تیز ہے، مگر معلوم ہوتا ہے تمہاری باقی پانچ حِسیں خاصی سُست ہیں۔ دیکھتے نہیں یا کم از کم سُونگھتے نہیں کہ ہرلی کس قدر زندہ دِل آدمی ہے؟ جاؤ، تُم بھی ایک چھوٹا وِسکی پی لو۔"

کیاّرہ میں فوجی طور پر بہت کچھ کرنے کو تھا ـــــ مورچے اور خندقیں کھودنا، فوجی مشقیں کرنا وغیرہ ـــــ اور بہت کچھ کیا جاتا تھا، لیکن وہاں کی زندگی کا محور مَیس ہی تھا۔ وہی نیم زمین دوز خیمہ جس میں چوں چوں کرتی سفری میزیں اور کینوس کی کُرسیاں رکھی تھیں کہ اگر کسی وجہ سے برگیڈ کو اچانک دکان بڑھانا پڑے، تو خانہ بدوشی وبالِ دوش نہ ہو جائے اور یہ خانہ بدوشی ایسی

غیر اغلب بھی نہ تھی۔ کیونکہ ہمارے شمال میں بلخ بُخارے کے نواح میں ہٹلر کی آمد آمد تھی اور وہ کسی وقت دیوار کی دُوسری طرف کھڑے ہو کر ہم سے تُو تُو مَیں مَیں کر سکتا تھا لیکن بظاہر کچھ دِنوں کے لیے ہمارا قیام یقینی تھا اور ہمارا مَیس ہرچند کہ چھجّو کا چوبارا تھا؛ تاہم ہمیں یہاں وہ آرام میسر تھا جو بلخ بخارے میں تو اب یقیناً نایاب تھا۔

زمانۂ امن میں فوجی مَیسوں میں میزیں، کُرسیاں، چُھریاں، چمچے جگمگ جگمگ کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی چمچہ یا کانٹا جگمگانے میں مزاحمت کرتا، تو افسر لوگ اسے ہتکِ افسری سمجھتے تھے اور بیروں، خانساموں کی جان پر بن آتی تھی، لیکن ہمارے جنگی مَیس کا سامان شاید جگ تو کرتا ہو لیکن ہم نے اُسے مگ کرتے کبھی نہ دیکھا اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی۔ ہم نے ان گرد آلودہ کرسیوں میں سکون کے وہ لمحے دیکھے جو فرنگی صوفوں کی آغوش میں بھی میسر نہ آ سکے اور جب دِن بھر کی فوجی مشقوں سے چُور ہو کر شام کو مَیس کی کُرسیوں پر آ بیٹھتے، تو معلوم ہوتا کہ سلمیٰ نے اپنی گداز باہوں میں لے لیا ہے۔

ایامِ جنگ میں آپ نے اپنے گھروں میں سامانِ خور و نوش کی کمی محسوس کی ہو گی وہ ہونا چاہیے تھی، کیونکہ اُس کی بیشتر ہمارے جنگی مَیسوں اور لنگروں میں پڑی تھی ہمیں انگریزوں سے لاکھ شکوے سہی، لیکن وافر اور متنوع خوراک کی شکل میں جو جواب شکوہ انگریزوں نے ہمیں دیا، اُسے کوئی سپاہی نہیں بھول سکتا۔ پھر شاید انگریز رزق رسانوں کی دیکھا دیکھی قادرِ مطلق بھی ہم پر مہربان تھا اور ہمارے گرد و پیش فراواں شکار بکھیر رکھا تھا۔ عراق بیشتر صحرا ہے جہاں کھانے کو بظاہر کچھ نہیں، لیکن جتنے پرندے اور غزال عراق کے صحراؤں میں ہیں کسی دُوسری جگہ نہ ہوں گے۔ ہم سوچتے تھے کہ ان میں عقل ہو تو عراق چھوڑ کر ہمارے ہاں چھانگے مانگے میں کیوں نہ چلے جائیں، جہاں آب کی کمی ہے نہ دانے کی، لیکن صحرانوردوں نے کبھی ناصحوں کی بات پر کان دھرا تھا جو یہ دھرتے۔ شکار کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بندوق اُٹھا کر فقط کیمپ سے

باہر نکلنے کی تکلیف کرنا پڑتی تھی۔ اِس کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ امیر خسرو کہیں سے آواز دے رہے ہیں۔

ہمہ آہوان صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بامید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

شکار کا انداز یہ تھا کہ آپ جیپ میں بندوقیں تانے بیٹھے ہیں کہ بیسیوں آہو سر بکف سامنے آتے ہیں۔ آپ جیپ میں بیٹھے ہی مشقِ ناز فرماتے ہیں اور وہ بیکرِ وفا یکے بعد دیگرے خونِ دو عالم اپنی گردن پر لیتے آپ کی جیپ کے ٹاٹروں میں ڈھیر ہوتے جاتے ہیں اور آپ کے اردلی اُٹھا اُٹھا کر دُوسری جیپ میں اِن کُشتوں کے پُشتے لگا دیتے ہیں ـــــ ذرا آگے چل کر آپ دجلہ کے کنارے آ نکلتے ہیں، تو ہزاروں تیتر اور چکور آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک ایک کر کے اِس لیے نہیں بیٹھتے کہ انہیں معلوم ہے آپ اناڑی ہیں اور ان بامروت پرندوں کو گوارا نہیں کہ آپ کا نشانہ خطا جائے۔

نتیجہ یہ کہ میس کے خیمے میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کی میز پر غزالوں اور چکوروں کے روسٹ کا ایک پہاڑ نظر آتا تھا۔ اگرچہ میس سے نکلتے وقت یہ بلندی خاصی ہموار ہو جاتی تھی اور کیارہ کی سردی کا اس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا سوائے اس آتشِ سیال کے جس کے خُم براہِ راست سکاٹ لینڈ سے کیارہ کے ویرانے میں لائے اور لنڈھائے جاتے تھے۔

برگیڈ کے افسروں میں صرف میں ہی مسلمان تھا اور جب کبھی وسکی کا گلاس لینے سے انکار کرتا، میرے مے زدہ ساتھی ایک گہری ہمدردی کے عالم میں میری محرومئ قسمت پر آہیں بھرنے لگتے۔ ایسی آہیں جو معلوم ہوتا تھا آسمان چیر کر نکل جائیں گی۔ جب ان اصحافِ باطن رندوں کا کرب مجھ سے نہ دیکھا گیا، تو ایک روز جامِ وسکی تھام ہی لیا۔ اس پر ان سرمستوں نے اپنی شادمانی کے اظہار کے لیے میرے گرد اِس قدر دیوانہ وار رقص کیا گویا فلک جھوم رہا ہو۔

ہمارے میس میں پینے کے لیے پانی کا استعمال اگر نا جائز نہ تھا تو مکروہ ضرور تھا۔ ایک دوپہر کو کیپٹن ولسن باہر سے تھکا ہُوا آیا، تو بیرا پھُرتی سے ایک تازہ پانی کا گلاس بھر لایا اور صاحب کو پیش کیا۔ ولسن نے پانی دیکھا تو ایک وحشت کے عالم میں چلّایا۔

"بندۂ خُدا مجھے کچھ پینے کو دو۔ میں وضو کرنے نہیں آیا۔"

میس سے باہر ہماری گفتار اور حرکات پر ہٹلر، توپ اور تفنگ چھائے ہُوئے تھے، لیکن میس کے اندر ان چیزوں کا گزر نہ تھا۔ وہاں موضوعِ گفتگو فقط ایک تھا: عورت ○! اور کس باریکی اور بیباکی سے اِس موضوع کو کُریدا جاتا تھا! پہلے دن یہ گفتگو سُنی تو محسوس ہُوا کہ چند دن اور اسی معصیت کی زندگی کے گزارے تو ہم پر بہشت کے دروازے بند ہو جائیں گے لیکن رفتہ رفتہ کچھ ایسے عادی ہو گئے کہ نہ صرف احساسِ گناہ جاتا رہا، بلکہ یہ احساس بھی ہونے لگا کہ ابھی تو میں جوان ہُوں۔ پھر زلفِ یار کی باتیں فقط تحت اللفظ ہی نہ ہوتیں، بلکہ نہایت مرصّع انگریزی گانوں میں بھی۔ انگریز نہایت دیانت داری سے انہیں DIRTY SONGS (گندے گانے) کہتے ہیں اور غیر مطبوعہ انگریزی لٹریچر میں جتنا ذخیرہ اِس صنفِ سخن کا ہے وہ پاکیزہ گانوں کا نہیں۔ پھر انگریز بلکہ تمام یورپی اقوام کورس میں گانے کی عادی ہیں اور جس طرح کورس کی گُونج مطالبِ سخن کو جلا دیتی ہے اور گانے والے کے دل و دماغ کو گرماتی ہے وہ سولو یا اکیلے گانے میں پیدا نہیں ہوتی۔ جو لوگ ان دنوں عراق میں تھے انہیں ایک کورس یاد ہو گا جس کی آواز اکثر افسروں کے میسوں سے سنائی دیتی تھی۔ ○

THERE IS SHORTAGE OF GOOD WOMEN IN ERBIEL

○ یاد رہے کہ یہ ایک طرح کی جنگی رعایت تھی، ورنہ امن کے زمانے میں میس کی میز پر عورت کا ذکر فوجی آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

○ لفظی ترجمہ: "اربیل میں اچھی عورتوں کا توڑا ہے۔" اربیل عراق کا ایک شہر ہے۔

ہماری تہذیب میں کورس کے جملہ حقوق کم وبیش قوالی کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ میسوں کا ہلکا پھلکا ماحول قوالی کی طہارت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ جنگ کے آخری سالوں میں جب دیسی افسروں کی تعداد بڑھنے لگی تو ہم نے بھی محض انگریزوں کو جواب دینے کی خاطر چند نیم غلیظ دیسی گانوں کو کورس کی شکل میں میسوں میں پیش کیا۔ مثلاً "شہر کی لونڈیا" اور "چھٹی" وغیرہ لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو انگریزی کورس کا خاصہ ہے۔

برگیڈ میس میں نئے نئے پہنچے اور انگریز افسروں کو باہم باتیں کرتے سنا، تو ہمیں اچانک احساس ہوا کہ ہم تو انگریزی میں کورے ہیں۔ ہمیں بھرتی ہونے سے پہلے ناز تھا کہ ہم نے شیلے اور ملٹن پڑھ رکھا ہے اور یہ کہ اور نہیں تو ہم TABLE TALK میں نمبر لیں گے، لیکن میز پر بیٹھے تو ہماری ساری ٹاک ہوا ہو گئی۔ ان لوگوں سے بات کرنے یا سمجھنے میں شیلے دانی یا ملٹن فہمی کا کچھ استعمال ہی نہ تھا۔ بے تکلف مردانہ محفلوں میں انگریزوں کی بول چال چٹ پٹے محاوروں اور خستہ اور کرارے بلکہ فحش اور عریاں الفاظ سے مرکب ہوتی ہے۔ ان الفاظ پر درسی کتابوں اور ڈکشنریوں کے دروازے بند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انگریزی ہمارے اُستادوں اور سکولوں تک نہیں پہنچتی۔ یہ فقط اہلِ زبان کے آگے گوشِ ادب وا کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہر شب جب ہم میس سے اپنے خیمے کو لوٹتے تو دو صفحے نئے الفاظ کے رقم کر لیتے اور اگلے روز ذرا سہمے سہمے ان کے استعمال پر بھی طبع آزمائی کرتے۔ اس فن میں پختگی کے لیے بڑی ریاضت درکار ہے۔ بہرحال ہمیں اپنی لغت پر مکمل عبور تو نہ حاصل ہو سکا، لیکن گزارا اچھا خاصا ہونے لگا۔ اب کہ انگریز جا چکا ہے، یہ الفاظ کمی استعمال کی وجہ سے زنگ آلود ہو گئے ہیں اور جب تک کسی سے لڑائی نہ ہو، زبان پر نہیں آتے۔

گیارہ کے برگیڈ میس کی رُوداد نپولین اور بوجم کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہو گی۔ نپولین ہمارے میس کا ہیڈ ویٹر تھا۔ یہ ایک عراقی عیسائی تھا۔ نام تو کچھ اور تھا، لیکن قد و قامت اور

شکل کے اعتبار سے بالکل نپولین لگتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کشتی نما ٹوپی بھی پہن لیتا، تو ہمیں شک ہونے لگتا کہ کہیں سینٹ ہلینا تو نہیں پہنچ گئے۔ اسی وجہ سے کسی خوش مذاق افسر نے اُسے نپولین کہنا شروع کر دیا تھا، لیکن اب وہ سچ مچ نپولین ہی بن بیٹھا تھا اور اصلی نپولین کے متعلق کہا کرتا تھا کہ ہاں، اِس نام کا ایک اور شخص بھی گزرا ہے۔ اگر کبھی بوناپارٹ کہہ کر بلاتے تو وہ اور زیادہ اطمینان محسوس کرتا اور ذرا اجنبیت نہ دکھاتا کہ اِس طرح فرانسیسی خاندان سے رشتہ اور پکّا ہو جاتا تھا۔

خورد و نوش کی دُنیا میں کوئی معرکہ ایسا نہ ہوگا جسے ہمارے نپولین نے محض اشارے سے سر نہ کیا ہو۔ اپنے ماتحت بیروں پر خالص جنگی انداز میں کمان کرتا، لیکن آخر اُسے بھی ایک دن اپنے واٹرلو کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بھی ایک بے زبان بلکہ بے جان سے مدراسی کے ہاتھوں —— یہ غریب مسالچی بھرتی ہوا تھا اور قسمت اُسے مدراس کے کسی دور افتادہ گاؤں سے سیدھی ہمارے برگیڈ میس میں لے آئی تھی۔ اس کا اپنا نام تو کچھ انگلم منگلم ہی تھا، لیکن اُسے بوجم کہہ کر پکارتے تھے جو ایک فلم میں گونگے کردار کا نام تھا۔ ویسے بوجم گونگا نہ تھا۔ فقط ضبطِ نفس کا قائل تھا یعنی بول سکتا تھا، لیکن بولتا نہ تھا۔ وہ ہر سوال کا جواب ایک شرمیلی سی مسکراہٹ سے دیتا تھا۔ ادھر نپولین کو یہ توقع تھی کہ اُس کے اشارے پر گورنر جھک جائیں اور میز پر پلیٹیں چُننے لگیں۔ بھلا مسکراہٹ سے اُس کی کیا تسکین ہوتی؟

ایک رات جب بوجم کی مسکراہٹ سے پلیٹوں میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی اور ڈنر لیٹ ہونے لگا، تو نپولین کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ بپھرا، گرجا اور برسا یعنی آناً فاناً بوجم سے گتھم گتھا ہو گیا اور اُسے آنِ واحد میں پیوندِ خاک کر ڈالا۔ نپولین مُنہ پر جھاگ لاتا اُٹھا، تو تھوڑی دیر بعد بوجم بھی اپنی ہڈیوں کو ٹٹولتا اور جوڑتا، دل و جگر کو تھامتا، کُرسیوں کا سہارا لیتا اُٹھ کھڑا ہوا اور اُٹھتے ہی نپولین کو ایسی دل گداز مسکراہٹ پیش کی کہ اس فاتحِ اعظم کا پتّہ پانی

ہوگیا اور اس نے غیر مشروط طور پر بُوجم کے آگے ہتھیار ڈال دیے، بلکہ بُوجم کو سینے سے لگایا اور اُسے ایک پیار بھرا نام دیا۔ "گرمُوشہ" (خدا جانے اِس کے کیا معنی تھے یا ہیں)، اِس پر بُوجم نے ایک اور واضح تبسم کیا۔ اِس کے بعد بُوجم کا واحد کام میس کے ایک کونے میں کھڑا ہو کر مُسکرانا تھا۔ برگیڈ کمانڈر صاحب کا کہنا تھا کہ برگیڈ افسروں کے مورال کی تعمیر میں بُوجم کی مُسکراہٹوں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

ہمارے برگیڈ کا سگنل سیکشن جس کا کیپٹن شاہ کمانڈر تھا اور مَیں نائب کمانڈر، تمام تر سکھوں پر مشتمل تھا اور اِس کا کام برگیڈ کے نظامِ مواصلات کو قائم رکھنا تھا۔ یہ کسی قدر فخر سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے سکھ جوانوں نے یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا؛ البتہ اُس شب کی قسم نہیں دی جا سکتی جب رَم (RUM) ○ تقسیم ہوتی تھی۔ اُس رات سلسلۂ مواصلات درہم برہم ہو گیا، سرے سے ہوتا ہی نہ تھا۔ ٹیلیفون خاموش؛ وائرلیس مُہر بلب!! اور ایکس چینج اُنگشت بدنداں۔ رَم نوشی کے بعد ہمارے سکھ جوانوں کو اِن فرنگی کھلونوں سے کھیلنے کا دماغ نہ رہتا تھا۔ اُن کا قرارِ جان تو اُس ڈھولک اور چمٹے کی آوازیں ہوتا جس کی تال پر وہ جھومتے، ناچتے اور پھر دفعتہً ایک ہنگامہ خیز سی آواز اُٹھتی جو سارے کیمپ کو محیط کر لیتی۔

"تیرے لَونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہَل ڈک لئے

.... او بلّے بلّے ۔ بلّے بلّے ۔ بلّے"

اور لمحہ بھر کے لیے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم صحرائے کیارہ میں نہیں، ماجھے میں بیٹھے ہیں۔

فوج میں ہر افسر کی خدمت کے لیے ایک سپاہی مقرر ہوتا ہے جسے بیٹ مین (BATMAN) کہتے ہیں۔ ہمیں سگنل مین ہربنس سنگھ ملا۔ پہلی نگاہ پر لباس کے لحاظ سے

○ شراب کی ایک قسم

کچھ ڈھیلا سا نظر آیا۔ دو چار دن کام کر چکا، تو پتہ چلا کہ آپ کے دماغ کے کل پرزے بھی کچھ ایسے کسے ہوئے نہیں۔ غالباً ہماری خدمت کے لیے اسی وجہ سے چنے گئے تھے کہ کسی فوجی استعمال کے قابل نہ تھے۔ ہربنس سنگھ کی خدمات سے صرف تین دن ہی استفادہ کیا تھا کہ ایک شام آہ و بکا کرتا تیز تیز میرے پاس آیا اور گرم آنسوؤں اور سرد آہوں کے درمیان میرے سامنے ایک تار رکھ دیا۔ مضمون تھا :

YOUR FATHER HOPELESS COME SOON

مجھے تو اس دیسی انگریزی کا مطلب سمجھ آ گیا یعنی "تمہارے باپ کی حالت نازک ہے۔ جلد پہنچو۔" لیکن ایک انگریزی نگاہ میں یہ بنتا تھا کہ "تمہارا باپ بالکل بیکار ہے، جلد پہنچو۔" میں ہربنس سنگھ کو لے کر کیپٹن شاہ کے پاس گیا۔ کیپٹن شاہ نے تار پڑھا، تو سفید کاغذ پر جواب لکھ کر میرے حوالے کیا کہ اس کے باپ کو بھیج دو۔ جواب یہ تھا :

YOUR SON EQUALLY HOPELESS NOT COMING

"تمہارا بیٹا بھی اتنا ہی بیکار ہے نہیں آ سکتا۔"

۸

نیم لفٹین بغداد میں

اگر فرمودۂ اقبالؒ درست ہے کہ "وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ" تو یقیناً گیارہ کی کائنات سے بے رنگ تر کوئی جگہ نہ ہوگی۔ کیونکہ وہاں سے نزدیک ترین زن کا محلِ وقوع کوئی سَو میل کے فاصلے پر تھا، یعنی بغداد میں۔ درمیان میں سر بسر ایک خالص مردانہ صحرا تھا؛ لہٰذا اگر ہمارے برگیڈ کے افسر اپنے دِل کی سپاٹ خاکی دُنیا میں تھوڑا سا رنگ بھرنے کے لیے بغداد کی ڈیوٹی کے بہانے ڈھونڈتے یا ایجاد کرتے تو سراسر قابلِ معافی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بغداد جانے کے لیے کوئی کارگر بہانہ تلاش کرنا جُوئے شیر لانا تھا اور اگر یہ جُوئے شیر از خود بہنے لگتی یعنی بغداد جانے کے لیے کوئی جائز سرکاری کام نکل آتا تو بیسیوں رضا کار خدمت کے لیے پیش ہو جاتے۔ خدمت تو ہم بھی پیش کرتے لیکن صرف اِکیسویں رضا کار ہی تصوّر ہوتے۔ کیونکہ سب سے جونیئر اور ناتجربہ کار ہونے کی حیثیت سے برگیڈ افسروں میں ہمیں برادرِ خُرد ہی سمجھا جاتا تھا اور برادرِ خُرد کے لیے ایرانیوں نے ایک محاورہ وضع کر کے غریب کا ہمیشہ کے لیے ستیاناس کر دیا ہے؛ چنانچہ بغداد جانے کی خواہش کا اظہار کرتا تو ہر طرف سے آوازیں اُٹھتیں:

"تمیز سیکھو، چھوٹے میاں! اِس عمر میں تمہارے لیے بغداد کی سیر موزوں نہیں ہے۔"

ایک دفعہ کسی قدر بے حیائی سے کہہ بھی دیا کہ نہ صرف موزوں بلکہ سخت ضروری ہے، لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ اب کون تاریخ پیدائش نکلوا کر ثابت کرتا پھرتا کہ ہماری شیر خوارگی کا زمانہ گزرے مُدتیں ہو چکی تھیں؛ چنانچہ ایک عرصے تک اپنے پہلو میں دردِ دل دبائے بیٹھا کیے تاآنکہ ایک روز خود قدرت کو ہماری خاطر ایک ترکیب سُوجھی۔

ہُوا یہ کہ ہمارے بریگیڈیئر صاحب کو عربی سیکھنے کا شوق چرایا اور فی الفور ایک عراقی ٹیوٹر منگایا گیا۔ ٹیوٹر نے اپنے گزشتہ تجربے کی بنا پر بریگیڈیئر صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر عربی سیکھنے میں آپ کا ایک اور ساتھی بھی ہو تو دونوں شاگردوں کا بھلا ہو گا۔ بریگیڈیئر صاحب کے ہم جماعت ہونے کا قرعہ ہمارے نام پڑا۔ ایک سیکنڈ لفٹننٹ کے لیے ایک بریگیڈیئر کا ہم سبق ہونے سے بڑی کوفت کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن برخوردار جو تھے' دھر لیے گئے۔

خیر جب تعلیم شروع ہوئی، تو بریگیڈیئر صاحب بڑے مفید ہم جماعت نکلے معلوم ہُوا کہ پانچ چھ یورپی زبانیں جانتے ہیں' بلکہ زبانیں سیکھنے کا انہیں چسکا ہے۔ آپ ایران کے مختصر سے قیام سے تھوڑی سی فارسی بھی چُن لائے تھے' لیکن عربی بول چال میں ابھی منقار زیرِ پر ہی تھے۔ ادھر ہم نے کالج میں صرف فارسی پڑھی تھی۔ عربی گو درساً نہیں پڑھی تھی؛ تاہم باقی مُسلمانوں کی طرح (یعنی ٹیڈی مُسلمانوں کو چھوڑ کر) عربی پڑھنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور عربی لکھنا ہمارے دائیں ہاتھ کا اور دونوں ہاتھوں سے کوشش کر کے کچھ مطلب بھی نکال سکتے تھے؛ چنانچہ پہلے روز ہی جب عربی کتاب فر فر پڑھ ڈالی، تو بریگیڈیئر صاحب حیران رہ گئے اور استادِ محترم تو پھڑک ہی اُٹھے۔ جب اُنہیں یہ معلوم ہُوا کہ ہماری عربی دانی کی وجہ ہماری مُسلمانی ہے تو آپ نے خوش ہو کر حلق کی گہرائی سے ایک بَل کھاتی ہوئی الحمدُ لِلّٰہ نکالی۔ جواباً ہم نے بھی یرحمک اللہ پیش کی جو اپنے وطن میں تو چھینک مارنے کے سلسلے میں استعمال ہوتی ہے لیکن اس موقع پر بھی خاصی صفائی سے چپک گئی۔

احتیاطاً ہم نے ایک ہلکی سی مصنوعی چھینک بھی چھینک دی کہ ان مقدس تراکیب کے ٹیکنیکل استعمال کی صحت بھی برقرار رہے۔

باتوں باتوں میں بریگیڈیئر صاحب ہم سے فارسی میں سوال کر بیٹھے۔ ہمارے مُنہ سے محض اتفاقاً ایک چُست سا جواب نکل گیا۔ بریگیڈیئر صاحب مرعوب ہو کر کہنے لگے:

"ارے تمہاری تو فارسی بھی بڑی "مضبوط" ہے۔ بغداد جا کر امتحان کیوں نہیں دیتے؟ پُورے چھ سو رُوپے انعام ملے گا۔"

ظاہر ہے اس دعوت کے قبول کرنے میں تکلف کرنا بلوغت کُشی کے برابر تھا ہم نے بعجلت تمام امتحان کے لیے درخواست لکھی ساپنے ہم جماعت سے تصدیق کرائی اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی —— قصہ مختصر کوئی پندرہ دن بعد ہم رشید سٹریٹ بغداد میں ہوٹل قصرِ دجلہ کے مہمان تھے۔

امتحان کی منزل آسان نکلی۔ انگریز ممتحن کے پہلے سوال کا ہی جواب دیا، تو غریب دونوں بازو بلند کر کے بولا: " TOO GOOD " گڈ تو ہم واجبی سے ہی تھے لیکن یہاں سوال ہماری رائے کا نہ تھا، بلکہ ممتحن کی بصیرت کا تھا جس کی رُو سے ہمارا مقام مرد پروین کے قریب نکلا؛ چنانچہ فارسی زبان کے امتحان میں تو ہم پاس ہو گئے لیکن بغداد کی زندگی کے امتحان میں کسی قدر دُشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ سکول کے دِنوں میں الف لیلہ پڑھی تھی تو ہمارے تصوّر کا بغداد ایک خوابوں کی دُنیا تھی۔ پُراسرار و حیرت انگیز۔ جہاں علی بابے دبے پاؤں مٹکے اُٹھائے پھر رہے ہوں، ابوالحسن سو جاگ رہے ہوں۔ نیم برہنہ حسین کنیزیں رقص کر رہی ہوں ایک کونے میں الہ دین چراغ رگڑ رہا ہو اور کانا حجام آستین میں دشنہ چھپائے گھات میں بیٹھا ہو لیکن جو بغداد ہمارے سامنے تھا، اس میں کوئی اسرار تھے نہ رموز، علی بابا تھا نہ الہ دین بنئے اور الف لیلہ کے بغداد میں کوئی مماثلت ہی نہ تھی، سوائے نیم برہنہ رقاصاؤں کے جو اب اور

زیادہ برہنہ ہوگئی تھیں اور شاہی محلوں کی خلوت کی بجائے کرٹ کیٹ کی جلوت میں ٹکٹ لگا کر ناچتی تھیں۔

کیارہ کی بے زن دُنیا سے ہم اپنے اُجاڑ دل میں رنگ بھرنے آئے تھے وہ بھر لیا یا یُوں سمجھیے کہ بغداد نے بزور بھر دیا۔ شارع الرشید کا وہ رَواں دَواں حُسن کر شوخ بھی تھا اور بے حجاب بھی اور ہوٹل قصرِ دجلہ کی وہ رَنگ و بُو میں ڈوبی ہوئی شبینہ تقریبات کہ جہاں حُسن آمادۂ ظہور ہی نہ تھا، مائل کرم بھی تھا —— ایک واقعہ کبھی نہ بھُولے گا۔

سرِ شام قصرِ دجلہ کے چمن میں ایک حسین و جمیل مخلوط مجمع میں ہم چند افسر اپنے مشروبات پر محوِ گفتگو تھے کیپٹن رستم وسکی کے زیر اثر اپنا ناپاک فلسفہ بیان کر رہے تھے کہ یہاں ہر عورت کی کچھ قیمت ہے اور ہم اِس سُوءِ ظن پر لعنت بھیج رہے تھے کہ باہر سڑک پر ایک کیڈی لاک کار رُکی۔ شوفر نے اَدب سے دروازہ کھولا۔ اندر سے دو وجیہہ اور باوقار خواتین برآمد ہوئیں ہوٹل کے خادموں نے جھک کر سلام کیا۔ معلوم ہوتا تھا کسی بڑے گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ چلیں، تو ایک واضح تمکنت اور شان سے۔ آخر ٹیرس کی کونے والی میز پر جا بیٹھیں۔ ہم نے رستم سے کہا:

"اَب کہو، تمہارا گستاخ کلیہ اِن معزز خواتین پر بھی حاوی ہے؟"

بے لگام رستم کو بھی ہاں کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ ایک شکست خوردہ سا مُنہ لے کر رہ گیا۔ ہم نے شور مچایا۔ "ہار گئے۔ ہمیں DRINKS پلاؤ"۔ رستم نے سرِ تسلیم خم کیا۔ مزید مشروبات کا آرڈر دیا اور آرڈر دیتے ہُوئے بیرے کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ بیرے نے جاتے ہُوئے اُن خواتین کا بھی آرڈر لیا اور کچھ دیر کے بعد گلاسوں سے بھری ہوئی ٹرے لے آیا۔ ہمارے سامنے گلاس رکھے، تو رستم کے سامنے گلاس کے علاوہ ایک کاغذ کا پُرزہ بھی رکھا جس پر زنانہ ہاتھ سے لکھا تھا: "عشرہ دنانیر" (دس دینار)!

اب شمن کا پہلا اور جائز مطالبہ یہ تھا کہ قطار باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور جھک کر سلام کرو۔ اس پر ہم نے خوشی اور خاموشی سے عمل کیا۔ اس کا دُوسرا اور ذرا کم جائز مطالبہ یہ تھا کہ ہفتہ بھر اپنے پیسوں سے وِسکی پلاؤ۔ اِس پر ہم نے نہایت بآوازِ ناخوشی کا اظہار کیا۔ لیکن بہر حال عمل اس پر بھی کرنا پڑا۔

سو ہم چاہتے تو اپنی بلیک اینڈ وائٹ زندگی کو مکمل طور پر ٹیکنی کلر میں بدل دیتے، لیکن سچّی بات ہے ہم میں اِتنے شوخ رنگوں کی تاب نہ تھی اور بہر حال اِس مال فروخت میں وہ کشش نہ تھی کہ ہم دولتِ دل مع ڈیلی الاؤنس ان کے آگے ڈھیر کر دیتے، لیکن یہ کہنا بھی ریاکاری ہو گی کہ ہم نے قصرِ دجلہ کے حادثے کے بعد گوشہ نشینی اِختیار کر لی اور قیام بغداد کے باقی ایّام فقط یادِ خدا میں گزار دیے۔ ہمیں گزارشِ اِحوال واقعی منظور ہے اور وہ یُوں ہے کہ ہمارے ایّام بلکہ راتوں کا بیشتر حصہ کٹ کیٹ اور "ملی الف لیلہ" کے گردو پیش ہی گزرا جو وہاں کے مشہور کیبرے تھے، اگرچہ وہاں بھی ہماری کشش کا مرکز اپنے وطنی افسروں کی صحبت تھی نہ کہ عربی رقص۔

رقص کے مُعاملے میں ہر مُلک کا اپنا مذاق ہے۔ ہندو پاکستان میں رقص کے عناصر چشم و اَبرُو کے اشارے اور دست و پا کی حرکات ہیں اور جس قدر نزاکت ان چہار عناصر میں ہو رقص اِتنا ہی دِلفریب ہوتا ہے۔ بخلاف اِس کے عربی رقص کا پہلا لازمہ عریانی ہے اور دُوسرا کُولہوں اور چھاتیوں کی جنبش۔ عُریانی جس قدر دُور رس اور جنبش جتنی طوفانی ہو رقص اِتنا ہی لاثانی تصور ہوتا ہے۔ ہم لوگوں نے جب ایک عراقی رقاصہ کو تقریباً کپڑوں کے بغیر دیکھا تو بدک سے گئے اور جب مُعاملہ جُنبانیدن تک پہنچا تو باور نہ آتا تھا کہ بھری محفل میں یُوں بھی ہو سکتا ہے لیکن ہوتا رہا اور ہم دیکھا کیے۔ پہلے ذرا کانی آنکھ سے، پھر جیسے کتاب پڑھی

○ روزنامہ مجسٹر

جاتی ہے اور وہ جسے ذوقِ سلیم کہتے ہیں، اس مدوجزر کی نذر ہوگیا جو ان رقاصاؤں کی سینہ زوری سے پیدا ہو کر تماشائیوں کو لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ہمیں کٹ کیٹ اور ملی الف لیلیٰ میں وہ بات نہ ملی جو ہندوستان کے مرسیماؤں میں تھی۔ ہمیں اپنے وطن کے رقص اور عربی رقص میں وہی فرق محسوس ہوا جو ستار نوازی اور ڈھول بجانے میں یا گلاب اور گوبھی کے پھول میں ہے، لیکن یہ ہمارا نقطۂ نگاہ ہے۔ ممکن ہے عرب حضرات ہمارے لطیف اور رمزیہ رقص کو دیکھیں تو کہیں "کیا واہیات چیز ہے، نہ کولہا ہلتا ہے، نہ چھاتی پھڑکتی ہے، یہ تو مساکین اور یتامیٰ کا رقص ہے"

مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کا ہمارے دلوں میں پیدائشی احترام ہے، مگر ان ممالک میں جاکر یہ احترام ذرا ڈگمگانے لگتا ہے۔ اس میں قصور دراصل عربوں کا نہیں، ہمارا اپنا ہے۔ ہم نے انہیں محض عرب ہونے کی وجہ سے تقدیس کی روئی میں لپیٹ رکھا ہے اور ان سے سوائے اس کے توقع ہی نہیں رکھتے کہ صبح اٹھیں، وضو کریں اور دن بھر اذانیں دیتے رہیں یا نفل ادا کرتے رہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ عرب بھی ہماری طرح گوشت پوست کے انسان ہیں اور سینے میں دل رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً بھر بھی آتا ہے، بلکہ جغرافیائی مجبوریوں سے کچھ زیادہ ہی بھر آتا ہے۔ گویا دل کے معاملات میں عرب بھائی بالکل ہماری طرح ہی بے بس ہیں اور ان سے محض نیکیوں کی توقع صریح زیادتی ہے۔

البتہ ایک معاملے میں عرب ہم سے بہت آگے ہیں اور وہ ہے قرأت۔ عرب قاری کی آواز میں ایک جادو ہے اور لے میں ایک سحر، ہم نے جب بھی عربوں کی زبان سے قرآن سنا، وجد میں آگئے ــــ لیکن ایک معاملے میں عرب نہ صرف ہمیں وجد میں نہ لا سکے، بلکہ الٹا چکر میں ڈال دیا اور یہ تھا ان کا طریقۂ نماز۔ ایک دفعہ جو کچھ ہم نے دیکھا وہ بظاہر تھی تو نماز ہی لیکن عجیب فری سٹائل (FREE STYLE) کی عبادت تھی۔ عید کا دن تھا اور برادرِ عزیز اصغر ○

○ میجر سید اصغر حسین۔ آج کل کیپیٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے مشیر مالیات ہیں۔

مُصر ہُوئے کہ بصرہ مسجد میں جاکر نمازِ عید ادا کریں گے۔ پہلی مسجد کے دروازے پر پہنچے تو قفل پڑا تھا۔ خانۂ خُدا اور مقفّل ؟ چلو۔ کوئی مصلحت ہو گی۔" دُوسری مسجد میں گئے۔ خیر سے کھُلی تھی۔ وضو کر کے اندر داخل ہُوئے۔ دیکھا کہ نمازِ عید با جماعت نہیں بلکہ فرداً فرداً پڑھی جا رہی ہے۔ حیران ہُوئے لیکن کہا "چلو اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔" یہ دیکھ کر البتّہ خوشی ہُوئی کہ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شریکِ نماز تھیں، لیکن اس کے بعد ہم نے کچھ ہوتے دیکھا اور اسے دیکھ کر ہماری خوشی پہلے حیرت اور پھر وحشت میں بدلنے لگی۔

ابھی ہم نے نماز شروع نہ کی تھی کہ ساتھ کے نمازی عین نماز کے درمیان سَر پھیر کر نہایت بے تکلّفی سے ہمیں تکنے لگے۔ کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی اصغر کو اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھتے جا رہے تھے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ہم سے خیریت مزاج بھی پُوچھتے ہیں، لیکن شاید "آمین" تک پہنچ گئے تھے۔ اچانک منہ خانہ کعبہ کی طرف کر کے رکُوع میں چلے گئے۔ مَیں ابھی اس صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اصغر بولے : "اِدھر دیکھنا۔" اور کیا دیکھتا ہُوں کہ ایک بوڑھی سی خاتُون نے جو التحیّات میں ہیں، دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں ایک سُلگتا سگرٹ تھام رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً نہایت تسلّی بخش سا کش لگا لیتی ہیں اور خانۂ خُدا میں نیلے دھوئیں کے مرغولے اور محرابیں تعمیر کر رہی ہیں۔ حیران تھے لیکن کیا کہہ سکتے تھے سوائے اس کے کہ

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تُو کر

نماز پڑھی اور باہر آ گئے۔

ذکر بغداد کی تفریحات کا تھا۔ زمانۂ جنگ میں اخلاق کے بندھن کسی قدر ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور بغداد کا ماحول بھی اخلاقی صحت کے لیے ایسا سازگار نہ تھا، بلکہ دل و نظر کا سفینہ سنبھالنے کے لیے خاصی کوشش کرنا پڑتی تھی۔ ایک ایسی ہی کوشش ہمیں بغداد سے نکال کر نجف و کربلا لے گئی۔ ہوٹل میں ساتھ کے کمرے میں ایک اور سیکنڈ لفٹننٹ ٹھہرے ہُوئے

تھے۔ وہ بھی ساتھ ہو لیے۔ کربلا پہنچے تو معلّمین نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مختلف مقامات دکھائے۔ ہم دونوں نے فوجی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ فوراً باقی زائرین خصوصاً بچوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ جدھر جاتے، ایک چھوٹی سی فوج تعاقب میں ہوتی۔ معلّم نے انہیں بھگانا چاہا، لیکن اُنہوں نے یک زبان ہو کر کچھ عربی آوازیں نکالیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں یہ عربی میں لاہوری "اوئے اوئے" کا ہم معنی کورس نہ شروع کر دیں۔ معلّم کو ٹوک دیا اور تعاقب کنندگان سے مصنوعی خندہ پیشانی سے اشارے کیے۔

بالآخر حضرت امام حسینؑ کے روضے میں داخل ہوئے جہاں نہ صرف ان لونڈوں سے امان ملی بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے تمام ذہنی و روحانی آلائشوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ فاتحہ پڑھی اور دیر تک مقبرے کی جالی تھامے کھڑے رہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آنکھیں تر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

کربلا سے نجف پہنچے۔ یہاں کا ماحول کسی قدر مختلف تھا۔ یہاں ہندوستانی مسلمان خاصی تعداد میں تھے، مگر اکثر غریب اور نادار۔ روضے سے ایک فاصلے پر ٹیکسی سے اُترے، فوراً ایک ہم وطن ہماری طرف بڑھے اور میرے ساتھی کو جمعدار صاحب کہہ کر سلام کیا۔ اپنی لفٹینی کو اپنی آنکھوں کے سامنے یوں مسمار ہوتے دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ غریب کو بازو سے پکڑ کر کہنے لگے:

"او بھک منگے! تُو نے بیک جنبشِ لب مجھ فل سیکنڈ لفٹننٹ کو جمعدار بنا دیا۔ تمہاری یہ مجال؟" اس کے بعد آپ نے اُسے غلط انگریزی میں چند گالیاں دیں جسے اُس نے صحیح سمجھ کر بُرا مانا کہ لفٹین صاحب کی نیّت بہرحال صحیح گالیوں کی تھی۔

حقیقت میں سائل بیچارے کا قصور نہ تھا کہ اُن دنوں جمعداروں اور لفٹینوں کے کندھے کے نشانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں ایک سے پیتل کے ستارے لگاتے تھے

اور آج کل کا امتیازی فیتہ جمعداروں کو نہ ملا تھا؛ چنانچہ لفٹین صاحب کو بہت سمجھایا، لیکن نہ مانے کہنے لگے:

"جمعدار پگڑی باندھتا ہے، میرے سر افسرانہ ٹوپی ہے۔ کیا یہ اندھا ہے؟ پگڑی اور ٹوپی میں تمیز نہیں کر سکتا؟"

ذرا ہنس کر عرض کیا: "معاف کر دیں غریب کو، ذرا بھینگا ہے شاید OPTICAL ILLUSION ○ کی وجہ سے غلطی کر گیا ہے۔"

بولے: "گویا تم بھی سائنس کی مدد سے میری ہتک کرتے ہو۔"

اب معلوم ہوا کہ قبلہ لفٹین صاحب بھی ذرا دماغ کے بھینگے ہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا اور آگے روضے کی جانب بڑھے، لیکن دفعتہً لفٹین صاحب رک گئے اور کہنے لگے:

"امیر المومنینؑ کے روضے میں جانے سے پہلے خیرات بانٹنی لازم ہے۔"

آپ سید تھے، میں سمجھا ان رموز سے واقف ہیں چلو انہیں خیرات بانٹنے دو۔ آپ نے جیب سے ایک دینار کا نوٹ نکالا اور اپنی ہندوستانی زبان سے عرب ڈرائیور کو انگریزی میں حکم دیا کہ اس کی ریزگاری لے آؤ، تاکہ غرباء میں تقسیم کر دی جائے۔ ڈرائیور نے دل میں ہندوستانی انگریزی کا عربی ترجمہ کر کے سمجھا کہ اسے خود ہی دینار بھنا کر غرباء میں تقسیم کرنا ہے۔ غرباء کی وہاں کوئی کمی نہ تھی۔ ڈرائیور پانچ منٹ میں اس کارِ خیر سے فارغ ہو کر آ گیا۔ لفٹین صاحب بولے:

"اُچکّے کہیں کے، ہمارے ساتھ دھوکا؟ جاؤ جن جن غریبوں کو خیرات دی ہے، اُن سے واپس لاؤ۔ ہم اپنے ہاتھ سے بانٹیں گے۔"

ڈرائیور سمجھ گیا، سواری عقل سے عاری ہے۔ جیب سے ایک دینار کا نوٹ نکالا، اپنے

○ فریبِ نظر

سر پر پھیرا اور چوم کر قبلہ لفٹین صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لفٹین صاحب کے شور و غل سے بھکاری تماشے کی خاطر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اِس گہما گہمی نے خیرات کو تقسیم انعامات کی تقریب بنا دیا۔ آخری پیسہ ختم ہو چکا، تو جناب نے خطبۂ صدارت دینا چاہا، لیکن خوش قسمتی سے بھکاریوں نے اس میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا اور جب سامعین میں فقط یہ خاکسار اور ڈرائیور رہ گئے، تو شاہ صاحب نے ہمیں روضے کی زیارت کی اجازت بخش دی۔

الغرض جب واپس بغداد پہنچے، تو آدھی رات کا عالم تھا۔ لفٹین صاحب نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے تجویز فرمایا کہ کل کاظمین کی زیارت کی جائے۔ ارادہ تو ہمارا بھی تھا، لیکن اُن کی رفاقت کا شوق سرد ہو گیا تھا؛ لہٰذا ہم کابلی سے عُذر کر دیا۔ دُوسرے روز کاظمین پہنچے تو آگے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ معلوم ہُوا دو آدمی گتھم گتھا ہیں۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو فریقین میں سے ایک ہمارے لفٹین صاحب ہی تھے ـــــ اس کے بعد ان لفٹین صاحب کو آج تک نہیں دیکھا۔ حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ شاید اُدھر ہی ہوں۔ بہر حال جہاں ہوں خدا اُنہیں خوش رکھے۔ اگرچہ اِس مُعاملے میں وہ خُدا سے تعاون کرنے والے نہ تھے۔

آخر ہمارا بغداد کا قیام ختم ہُوا۔ واپس کیارہ پہنچے، تو بریگیڈ موصل کو کُوچ کر رہا تھا جو پچاس میل شمال میں تھا۔ گویا پچاس میل اور ہٹلر کے قریب۔ اِس نقل مکانی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ شمال سے ہٹلر بھی اسی قدر ہماری جانب بڑھنے کی زحمت اُٹھا رہے ہیں اور چونکہ مُلاقات کا امکان سا ہے لہٰذا معزز مہمان کو چند قدم بڑھ کر ملنا لازم ہے۔

موصل پہنچے تو آفیسرز میس اور چند سینئر افسروں کے لیے موصل شہر میں عمارت مل گئی۔ باقی سپاہیوں اور ہم جونیئر افسروں نے شہر سے چند میل باہر خیمے گاڑے۔ انداز یہ ہوتا تھا کہ جتنی جگہ خیمہ گھیرتا ہے اُسے دو تین فٹ گہرا کھود دیا جاتا تھا۔ اِس سے ایک تو

گہرائی کے سبب خیمے کے اندر چلنا پھرنا آسان ہو جاتا تھا اور دوسرے اندر بیٹھے یا لیٹے ہوئے دشمن کی گولی کارگر نہ ہوتی تھی۔ دن بھر سپاہیوں کے ساتھ کام کرتے، لیکن کھانے کا وقت اور خصوصاً شام میس میں گزارتے یا موصل کی گشت کرتے جہاں وہی بصرہ و بغداد کے رنگ تھے، لیکن ذرا کم شوخ۔ رات بہرحال کیمپ میں آ جاتے۔

ایک رات اس زور کی بارش ہوئی کہ بقول شخصے سات آسمان گر پڑے۔ ذرا بادل چھٹے تو رات کے دو بجے کیچڑ سے لت پت میس سے کیمپ پہنچے۔ آگے خلافِ معمول ہمارا اردلی بکسل مین ہربنس سنگھ انتظار کر رہا تھا۔ غریب ہڈیوں تک بارش سے بھیگ چکا تھا اور اچھا خاصا چرا اونچی بنا کھڑا تھا۔

میں نے پوچھا: "اتنی رات گئے انتظار کی ضرورت؟"

بولا: "صاحب، وہ گم ہو گیا ہے۔"

"کیا گم ہو گیا ہے؟"

"آپ کا تنبو، جی!"

"تنبو کیسے گم ہو سکتا ہے؟"

"جی اُڑ گیا ہے۔ طوفان جو آیا تھا۔"

"اور ہمارا سامان؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"یعنی؟"

"خیمے کا گڑھا پانی سے بھر گیا ہے اور زمین کے ساتھ ہموار ہو گیا ہے۔ صبح ڈبکی لگا کر دیکھوں گا۔"

"جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو تم کیا کر رہے تھے؟"

"جی، مَیں دیکھ رہا تھا۔"

ہربنس سنگھ اِس "دیکھتے رہنے" کی وجہ سے اپنے آپ کو شاباش کا مستحق سمجھتا تھا۔ اُسنے شاباش دی اَور حق تو یہ ہَے کہ حق ادا نہ ہُوا۔ رات واپس مَیس میں جا کر اُدھار کے بستر پہ گزاری۔ صبح کیمپ میں آئے، تو ہربنس سنگھ لنگوٹے میں ملبوس مُسکراتا ہُوا آگے بڑھا اَور بولا:

"صاحب، آپ کی لوہے کی کُرسی خیمے کے گڑھے میں سے مِل گئی ہَے۔"

مَیں نے کہا: "شاباش، اور باقی سامان؟"

ہربنس سنگھ کی مُسکراہٹ ذرا کملانے لگی۔ بولا: "صاحب، باقی سامان تو دَجلے میں پہنچ گیا ہَے۔"

۹

موصل سے طبرق ۔ پندرہ سو میل کا سفر

ہماری نگاہیں موصل کے شمال میں کاکیشیا کے پہاڑوں پر جمی تھیں۔ کیونکہ اسی راستے سے ہٹلر کی آمد کی خبر گرم تھی اور استقبال میں ہمارے بریگیڈ نے گھر کے تمام بوریئے بچھا رکھے تھے یعنی جس حد تک ایک بریگیڈ کی بساط تھی، بازی لگا دی تھی۔ اُدھر ہٹلر کا لشکر کئی ڈویژنوں پر مشتمل تھا اور کہا جاتا تھا کہ اگر وہ ستمگر ادھر آ نکلا تو ہمارے بریگیڈ کے پرزے اُڑیں گے۔ ہم اس کے لیے بھی تیار تھے، لیکن بالآخر یہ تماشا نہ ہُوا اور ہوا یہ کہ عین اس وقت کہ ہم ہٹلر کی خنجر آزمائی کے لیے موصل کے نواح میں مقتل آراستہ کر رہے تھے اُس کی نگاہ رُوس کے کہن بدخشوں پر پڑی اور ظالم نے اُن کے مقابلے میں ہمیں قابلِ التفات نہ سمجھا۔

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

اب ہم اس خیال سے نڈھال ہونے لگے کہ شاید موصل میں ہی بیٹھے بیٹھے بے مصرف بُوڑھے ہو جائیں گے اور سوچ ہی رہے تھے کہ اب کہاں قسمت آزمانے جائیں کہ اچانک شمالی افریقہ کے صحرائے اعظم سے ایک نئے خنجر آزما یعنی جنرل رومل○ نے ہمیں

○ صحرائے افریقہ میں لڑنے والی جرمن افواج کا نامور جنرل

یاد کیا۔ اُس وقت رومل مغرب سے مصر کی طرف بڑھ رہا تھا اور ابن غازی کی گوشمالی اور پھر اٹھک شوئی کرتا ہُوا اپنی دُور مار توپوں کے ذریعے طبرق کی ابتدائی مزاج پُرسی کر رہا تھا، لیکن پیشتر اس کے کہ اہلِ طبرق کوئی مناسب جواب دینے کی ہمت کر سکتے، ہمارے برگیڈ کو حکم ہُوا کہ موصل سے طبرق پہنچو، یعنی کوئی ڈیڑھ ہزار میل مغرب کو؛ چنانچہ فی الفور ایک طویل سفر کی تیاری ہونے لگی۔

نقشہ دیکھا، تو معلوم ہُوا کہ موصل سے فلسطین کے ساحل تک پائپ لائن ہماری رفیقِ سفر ہوگی اور اس سے آگے نہر سویز کے پار افریقہ کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ ساحلی سڑک۔ گویا تمام تر راستہ صحرا سے گزرتا تھا اور اس طویل صحرانوردی کے انجام پر کوئی لیلیٰ نہ تھی بلکہ رومل!

۵ مئی ۱۹۴۲ء کو موصل سے کوچ کیا اور جنوب میں بغداد سے سترہ میل ادھر بیجی کے مقام پر ڈیرے ڈالے۔ یہاں ہفتہ بھر ٹھہر کر بغداد سے نیا ساز و سامان اور اسلحہ و بارود حاصل کیا اور سفرِ طبرق کی تیاری کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سفرِ آخرت کی تیاری ہے کیونکہ رومل سے کسی بہتر سلوک کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ بہرحال ۲۲ مئی کو ہمارا ۱۲ روزہ صحرائی سفر شروع ہُوا اور علی الصبح برگیڈ کی سینکڑوں مختلف النسل گاڑیاں جوانوں اور سامان سے لدی ہُوئی ایک خاص ترتیب سے سڑک پر نکلیں اور کارواں مغرب کو روانہ ہُوا۔

کارواں میں سفر کرنے کے آداب خاصے کڑے ہوتے ہیں۔ گاڑیوں کی رفتار اور اُن کے درمیانی فاصلے مقرر ہوتے ہیں۔ کیا مجال جو کوئی ڈرائیور تیز مزاجی میں اپنے پیش رَو سے آگے نکل سکے؟ کوئی یہ غلطی کرے، تو بالیقین اُس کے پَر جل جانے کا اندیشہ ہے کہ امیرِ کارواں میں نہیں خُوئے دلنوازی! اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیونکہ اگر وہ ہر کارواں شکن کی دلنوازی کرتا پھرے، تو پھر کارواں کا اللہ حافظ! اور ایسے بگڑے ہُوئے

کاروانوں کی حفاظت اللہ کی عادت نہیں۔ کارواں سے ٹوٹنے کا فقط ایک ہی جائز بہانہ ہے کہ چلتے چلتے آپ کی گاڑی کا انجن جاں بحق ہو جائے، لیکن ایسے انجنوں کا مسیحا بھی کارواں کے ساتھ ہی چل رہا ہوتا ہے ـــــ اُسے غیر دینی زبان میں بریک ڈاؤن لاری کہتے ہیں ـــــ اور اس کی ایک پھونک مُردہ انجن کو صبا رفتاری پر آمادہ کر دیتی ہے اور اگر پھونک کارگر نہ ہو تو نہ سہی، مرگِ عاشق یُوں بھی بے معنی چیز ہے اور اس مسیحا کو اپنی بات جانے سے کوئی خفت بھی نہیں ہوتی۔ مرحوم کو سرِ راہ چھوڑتے ہُوئے باقی کارواں مع مسیحا رواں رہتا ہے۔

کوئی چار بجے کا وقت تھا کہ ہمارا کارواں مُورا کے مقام پر رات کے قیام کے لیے رُکا۔ مُورا کیا بلا تھی، ہمیں نظر نہ آئی۔ لق و دق صحرا تھا۔ دُشمن کے ہوائی جہازوں کا ایسا خطرہ تو نہ تھا لیکن کارواں سالار نے مورچے کھودنے کا حکم دے دیا اور کُھلے میدان میں سگریٹ پینے یا روشنی کرنے پر پابندی لگا دی۔ زندگی تلخ کرنے کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی پابندیاں بڑی پابندیوں سے کہیں زیادہ ظالم ہوتی ہیں۔ بہر حال جائے اعتراض نہ تھی۔ دِن کا کھانا ہم نے چلتی گاڑیوں میں ہی کھایا تھا، لیکن اب باقاعدہ مَیس کا خیمہ نصب ہُوا، میزیں لگائی گئیں، انگریزی دستور کے مطابق کھانا چُنا اور کھایا گیا اور مشروبات نوش کیے گئے ـــــ فوجی زندگی کا یہ قرینہ بے حد دلکش ہے۔ اِس زندگی میں جفاکشی بھی، قیامت کی ہے، لیکن اِن جفاؤں کے درمیان اگر ایک لمحہ فرصت کا میسّر ہو یا دُشمن مُہلت دے، تو بزمِ طرب آراستہ ہو جاتی ہے

یہ لکھتے ہُوئے بریگیڈیئر فِنڈلے FINDLEY کا واقعہ یاد آتا ہے۔ قبائلی علاقے کے سلسلۂ کوہستان میں فوجی مشقیں کر رہے تھے کہ چار و ناچار ایک رات پہاڑ کی دندانے دار ڈھلان پر گزارنا پڑی۔ خیال تھا کہ یُونہی کسی چٹان سے ٹیک لگا کر شب بسر کر دیں گے کہ بریگیڈیئر فنڈلے کو اپنا بستر اپنے ہاتھ سے کھولتے ہُوئے دیکھا اور بیحد حیرت ہُوئی، کیونکہ بریگیڈیئر صاحب

کاروانوں کی حفاظت اللہ کی عادت نہیں۔ کارواں سے ٹوٹنے کا فقط ایک ہی جائز بہانہ ہے کہ چلتے چلتے آپ کی گاڑی کا انجن جاں بحق ہو جائے، لیکن ایسے انجنوں کا مسیحا بھی کارواں کے ساتھ ہی چل رہا ہوتا ہے ـــــ اُسے غیر دینی زبان میں بریک ڈاؤن لاری کہتے ہیں ـــــ اور اس کی ایک پھونک مُردہ انجن کو صبا رفتاری پر آمادہ کر دیتی ہے اور اگر پھونک کارگر نہ ہو تو نہ سہی، مرگِ عاشق یوں بھی بے معنی چیز ہے اور اس مسیحا کو اپنی بات جانے سے کوئی خفت بھی نہیں ہوتی۔ مرحوم کو سرِ راہ چھوڑتے ہوئے باقی کارواں مع مسیحا رواں رہتا ہے۔

کوئی چار بجے کا وقت تھا کہ ہمارا کارواں مجورا کے مقام پر رات کے قیام کے لیے رُکا۔ مجورا کیا بلا تھی، ہمیں نظر نہ آئی۔ لق و دق صحرا تھا۔ دُشمن کے ہوائی جہازوں کا ایسا خطرہ تو نہ تھا لیکن کارواں سالار نے مورچے کھودنے کا حکم دے دیا اور کھُلے میدان میں سگریٹ پینے یا روشنی کرنے پر پابندی لگا دی۔ زندگی تلخ کرنے کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی پابندیاں بڑی پابندیوں سے کہیں زیادہ ظالم ہوتی ہیں۔ بہرحال جائے اعتراض نہ تھی۔ دِن کا کھانا ہم نے چلتی گاڑیوں میں ہی کھایا تھا، لیکن اب باقاعدہ میس کا خیمہ نصب ہُوا میزیں لگائی گئیں، انگریزی دستور کے مطابق کھانا چُنا اور کھایا گیا اور مشروبات نوش کیے گئے ـــــ فوجی زندگی کا یہ قرینہ بے حد دلکش ہے۔ اس زندگی میں جفاکشی بھی قیامت کی ہے، لیکن اِن جفاؤں کے درمیان اگر ایک لمحہ فرصت کا میسّر ہو یا دُشمن مُہلت دے، تو بزمِ طرب آراستہ ہو جاتی ہے

یہ لکھتے ہُوئے بریگیڈیئر فِنڈلے FINDLEY کا واقعہ یاد آتا ہے۔ قبائلی علاقے کے سلسلۂ کوہستان میں فوجی مشقیں کر رہے تھے کہ چار و ناچار ایک رات پہاڑ کی دندانے دار ڈھلان پر گزارنا پڑی۔ خیال تھا کہ یُونہی کسی چٹان سے ٹیک لگا کر شب بسر کر دیں گے کہ بریگیڈیئر فنڈلے کو اپنا بستر اپنے ہاتھ سے کھولتے ہُوئے دیکھا اور بے حد حیرت ہُوئی، کیونکہ بریگیڈیئر صاحب

صرف تین چوتھائی اصلی تھے اور باقی مصنوعی یعنی آپ کی ایک ٹانگ اور بازو چوبی تھے۔ اصلی اعضاء ایک جنگی حادثے میں ضائع ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے آپ نے پہلے چارپائی کے برابر جگہ ہموار کی، پھر سفری پلنگ لگایا، بستر بچھایا، سفری میز اور کرسی نکالی۔ میز پر بیئر کی بوتل اور گلاس رکھے اور ایک سکون کے عالم میں مے نوشی شروع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے سامنے ایک ٹوٹے پھوٹے برگیڈیئر کی بجائے کوئی جواں سال شاعر بیٹھا ہے جس نے انتہائی سنگلاخ زمین میں ایک شگفتہ غزل کہہ ڈالی ہے۔

جب برگیڈیئر صاحب نے ہمیں دیکھا کہ سوالیہ نشان بنے بیٹھے ہیں، تو ہنسے اور کہنے لگے:

○ ANY FOOL CAN MAKE HIMSELF UNCOMFORTABLE

برگیڈیئر صاحب کی چوٹ سے ہمارے سالم دست و پا حرکت میں آگئے اور منٹوں میں پہاڑ کی ڈھلان پنڈی کلب کی طرح آراستہ ہو گئی۔

کہا جاتا ہے کہ

منعم بکوه و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

لیکن حقیقت میں شرط منعم ہونا نہیں، بلکہ ایک خاص ذہنی کیفیت کی ضرورت ہے اور زندگی سے بھر رنگ لطف اندوز ہونے کا ذوق ہے ورنہ فوجی بے چارے کہاں کے منعم ہیں؟

رات آرام سے گزاری اور صبح سویرے پھر سڑک پر تھے۔ سڑک سے آپ چال لاہو کی قسم کی کوئی چیز تصوّر نہ کرلیں جسے پی ڈبلیو ڈی نے اپنے صدری نسخوں سے سجایا بنایا ہو

○ کوئی بے وقوف بھی بے آرامی سے بسر کر سکتا ہے۔

بلکہ ہمارے سامنے عراق کا وسیع صحرا تھا جس کی مغربی حد فلسطین سے جا ملتی تھی اور یہ شاہراہ سینۂ صحرا پر لاریوں کی متواتر آمد و رفت سے خودرَو سی سڑک بن گئی تھی جو "تار میک" نہ تھی پختگی اور ہمواری میں مال سے ٹکّر کھاتی تھی اور کشادگی میں تو ظرف تنگنائے مال کا اس سے کچھ مقابلہ ہی نہ تھا۔ سڑک کی وسعت صحرا کی وسعت کے برابر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس پر ایک مقررہ سمت میں سفر کرنے کے لیے دن کی روشنی درکار تھی۔ رات کے مسافر اس کی کشادگی میں کھو کر رہ جاتے تھے، اسی لیے ہمارا قافلہ سرِ شام ہی کسی موزوں مقام پر رُک کر ڈیرے ڈال دیتا تھا۔

ہمارے اگلے پڑاؤ کچھ ابجد، ہوز کی قسم کے تھے۔ ان کے کاغذی نام تھے ایل جی ۵۔ ایچ ۳۔ ایچ ۴ وغیرہ۔ اور ان کے مقابلے میں زمین پر یا ہوائی اڈہ تھا یا پمپنگ سٹیشن، جیسے مصنوعی نام تھے ویسے ہی مصنوعی مقام تھے، لیکن اگر ہمارے راستے میں یہ مقامات نہ ہوتے، تو پھر اس دشت میں فقط خدا کی ذات ہی تھی۔ کہیں کہیں اس بیکراں ویرانے میں خانہ بدوشوں کے خیمے بھی نظر آتے تھے جن کے اردگرد چند انسان، کچھ گدھے اور ایک کثیر تعداد بھیڑوں کی پھر رہی ہوتی تھی جنہیں دیکھ کر اُس کی رزاقی پر ایمان آجاتا تھا۔ یہ بدو تو خیر بھیڑیں کھا لیتے ہوں گے، لیکن وہ بھیڑیں کیا کھاتی تھیں؟ یہ راز بھیڑوں اور اُن کے رازق کے درمیان ہی تھا۔ بہرحال یہاں سمندر سے نہیں، بلکہ صحرا سے پیاسے کو شبنم ملتی تھی۔ جو یقیناً رزاقی تھی۔

پانچویں روز اچانک ایک دریا نے ہمارا راستہ کاٹا۔ پُل سے پار ہوئے، تو ایک نئی دُنیا میں داخل ہو گئے۔ حدِ نگاہ تک ایک وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ معاً ہماری نگاہ ایک پک نک کرتی ہوئی ٹولی پر پڑی۔ اُنھوں نے ہمارا کارواں دیکھا، تو ہماری طرف لپکیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، پُوری سات دوشیزائیں! خدا جانے اِن بنات النعش کے جی میں کیا آئی کہ دِن دہاڑے عُریاں ہو گئیں۔ یعنی تقریباً عُریاں! پیراکی کا لباس پہنے ہُوئے تھیں

اور ابھی بھیگی بھیگی دریا سے نکلی تھیں۔ ہم نے اُنہیں ایک نظر دیکھا اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی: ہمیں دیکھ کر تو خیر اُنہیں کیا حاصل ہونا تھا لیکن ہم سکتے ہیں آ گئے۔ ہمارا کارواں تو کیا، گردشِ شام و سحر رُک گئی۔ ساتوں کی ساتوں سرو قد، آہو چشم اور مرمریں بدن۔ اِس قدر دِلرُبا جیسے غالبؔ کی غزل، اِسے دیکھو تو زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے۔ اُسے دیکھو تو سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے اور وہ جو ذرا ہٹ کر مسکرا رہی تھی: چہرہ فروغِ مَے سے گلستاں کیے ہوئے اور ہم کہ مُدت ہوئی تھی یار کو مہماں کیے ہوئے جگر لختِ لخت سے دعوتِ مژگاں کرتے آگے بڑھے۔

بعد میں سُنا کہ ہمارے سالارِ کارواں بھی اِس حُسن کی یلغار کے آگے تھوڑی دیر کے لیے سالار سے انسان بن گئے اور جیپ روک کر اُنہیں ہیلو کہا اور چلے تو ایک مُدت تک پیچھے تاکا کیے۔ جب مقامی لوگوں سے پوچھا کہ یہ ایک سے بڑھ کر ایک نوبہارِ ناز کون ہے تو معلوم ہُوا کہ دُخترانِ یہود ہیں اور یہ کہ ہم دریائے اُردن عبور کر کے فلسطین میں داخل ہو چکے ہیں۔ فلسطین کی اُٹھان کشمیر یا سوات سے مشابہ ہے۔ انگریز اسے دیکھتے ہی ہوم یاد کرنے لگے اور ہمیں تو صحرائے عراق کی ریت اور لاوے کی درشتی کے بعد فلسطین کا سبزہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زیرِ پاچوں پرنیاں آمدہ ہے: چھوٹی چھوٹی یہودی بستیوں سے گزرتے تو معلوم ہوتا ٹیکنی کلر میں خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ زنگار رنگ کا ٹیج، وہ مدرسے کی سُرخ و سپید عمارت، وہ دلکش سینما ہال، وہ دلآویز سیناگاگ اور مکانوں سے کہیں زیادہ حسین ان کے مکین جنہیں سات دن کی مسلسل دشت پیمائی کے بعد دیکھنے کو اگر ٹکٹ بھی لگتا تو ہم فوجی رعایت نہ مانگتے۔ اور اب کہ یہ لوگ برضا و رغبت ہمارے کارواں کے دونوں جانب صف بستہ کھڑے تھے، ہم اپنی خوبیٔ قسمت پر ناز کرتے آگے بڑھتے گئے۔

ہمارا اُس شام کا پڑاؤ حیفہ تھا۔ حیفہ سے کوئی ایک میل ادھر ہمارا کارواں رُکا

اور ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ زن ہُوا۔ برگیڈ کمانڈر صاحب نے شاید ہمارے دلوں کو ٹٹول لیا۔ سرِشام ہی اعلان کر دیا کہ حیفہ دیکھنے کی عام چھٹی ہے۔

۱۹۴۲ء میں اسرائیل ابھی وجُود میں نہیں آیا تھا لیکن یہودی فلسطین پر چھا رہے تھے اور حیفہ تو ایک پکے ہُوئے پھل کی طرح اُن کی گود میں گرنے کو تھا۔ اکثر یہودی یورپ سے ترکِ وطن کر کے آئے تھے۔ نتیجتہً حیفہ کا مزاج نہ صرف عمارات بلکہ عام طرزِ زندگی میں بھی فرنگیانہ تھا۔ عرب تھے لیکن کم اور وہ بھی مزدور قسم کے۔ حیفہ کے مزاج کو متاثر کرنا تو درکنار، حیفہ کے مزاج دان ہی نہ تھے۔ بیچارے اپنے گھر میں اجنبی تھے۔

پہلی رات شہر میں گئے، تو ایک مشہور تفریح کدہ "پراسز" میں جا داخل ہُوئے۔ یہاں کے ماحول میں وہ بغداد کے کیبروں کی گرج چمک اور زلزالہ باری نہ تھی۔ اِس جگہ کی کشش کے عناصر حُسن اور سکُون تھے۔ مرد باوقار اور خواتین باتمکین، لیکن تمام تر یہودی۔ کوئی دیسی یعنی عرب وہاں موجود نہ تھا ــــــ بار پر گئے تو مقبول ترین مشروب مالٹے کا رس نکلا، لیکن یہ ہمارے ہم وطن مالٹے نہ تھے۔ پاکستانی مالٹے حیفہ کے مالٹوں کے سامنے برادرِ خرد اور وہ بھی سوتیلے نظر آتے ہیں۔ فلسطینی مالٹے نہ صرف قامت میں بزرگ تھے، بلکہ لذت میں بھی دو آتشہ تھے۔ یہ ہوائے فلسطین کا فیض تھا یا یہودی محنت کا ثمرہ، اِس بات کی تحقیق تو نہ ہو سکی؛ البتہ ہم نے دونوں ہاتھوں سے ایک مالٹا اُٹھا کر مشین میں رکھا، تو بار میڈ نے ایک رطلِ گراں بھر کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور جب پی چکے تو وہ آسودگی میسّر ہُوئی کہ اس کی یاد مع ذائقہ آج تک باقی ہے اور اب گوجرانوالہ کے مالٹے اپنا خُونِ جگر بہا کر بھی وہ بات پیدا نہیں کر سکتے ـــ اُس رات ہم نے دیکھا کہ کئی مستند انگریز مے خوار اس نئے مشروب کی خاطر وسکی سے دستبردار ہو گئے۔

دُوسرا دن بھی حیفہ کی سیر میں گُزرا۔ حیفہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر واقع ہے: لہٰذا

وہ اپنے رُخِ زیبا کا کوئی گوشہ بھی چُھپا نہیں سکتا اور نہ چھپانا چاہتا ہے۔ یُوں سمجھیں کہ اس کا حسن بندِ نقاب کھولے قوسِ قزاح کی طرح سامنے کھڑا ہے۔ ڈھلان خُدا نے بنائی ہے مکان اِنسان نے' اور دونوں نے مِل کر ایک دلکش شاہکار پیدا کر دیا ہے۔ ایک فیلسوف ساتھی سے بات کی تو بولا:

"حیفہ پر ہی کیا منحصر ہے' ہر شاہکار فطرت سے تعاون کرنے پر ہی وجود میں آتا ہے"

مسئلہ مشکل تھا' لیکن مثال کی مدد سے کچھ سمجھ میں آ گیا۔

اگلے روز علی الصبح ہمارا کارواں پھر روانہ ہُوا۔ حیفہ سے نکلے تو ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کو بڑھے۔ پہلے تیس چالیس میل یہودیوں کے باغیچوں کے تھے جن کے شاداب مالٹے آب و رنگ میں اُن یہودی دوشیزاؤں کو شرماتے تھے جو ہاتھ ہلا ہلا کر بے شرمائے ہمیں الوداع کہہ رہی تھیں۔ پاس ہی یہودی کاشت کار مشینوں سے صحرا کو گلزار بنا رہے تھے اور ہم فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ پھول ہیں صحرا ہیں یا پریاں قطار اندر قطار۔

پھر دفعتہً باغیچوں کا سلسلہ ختم ہُوا اور کیا دیکھتے ہیں کہ مختلف قطعاتِ زمین میں اُونٹوں اور گدھوں کے ناہموار تعاون سے ہل چلایا جا رہا ہے۔ معلوم ہُوا یہ عرب کاشت کار ہیں۔ کھیتوں کے قریب سے گزرے تو عرب بچّے بھاگے بھاگے آئے اور ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر "سگارہ رفیق" کی صدا لگانے لگے۔ صدا کا ترجمہ کرایا تو معلوم ہُوا سگریٹ کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہم مسافروں کو پہلے تو دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا اور پھر سوچا کہ ہمارے عرب بھائیوں کا کیا بنے گا۔ اور بنا یہ کہ چند ہی سال بعد فلسطین جغرافیے سے نکل کر تاریخ میں چلا گیا اور اُس کی جگہ اسرائیل نے لے لی اور ہمارے عرب بھائی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں منتقل ہو گئے اور بظاہر وہیں رہیں گے کیونکہ انرا (UNRRA) کے مُفت راشنوں کے علاوہ امریکہ کے خیراتی سگرٹوں نے اُن کے دل سے یادِ وطن کی خلش خاصی ملائم کر دی

ہے۔ بلکہ سُنا ہے کہ اُن کا قاف حلق کی بجائے اَب ناک سے نکلتا ہے۔ ○

جیفہ کے بعد اگلا پڑاؤ اسلوج تھا۔ اسلوج صحرائے سینائی کے مشرقی حاشیے پر واقع ہے۔ اسلوج میں رات گزار کر صبح دشتِ سینائی کی پہنائی سے گزرے تو ویرانی سے خوف سا آنے لگا۔ انگریزوں نے اِس ریگ زار میں یہ سڑک نہ بنائی ہوتی، تو اسمٰعیلیہ پہنچتے پہنچتے ایک عمر گزر جاتی اور شاید یہ تاخیر ہمارے لیے ایسی ناموافق بھی نہ ہوتی کہ ردمل سے فوری مُلاقات بھی بہت صحت افزا تقریب نہ تھی۔ خیر ہمارے جذبات کچھ بھی ہوں سڑک بحال ہو گئی تھی!

شام کو نہر سویز عبور کر کے اسمٰعیلیہ میں داخل ہوئے۔ رات کا بیشتر حصّہ اسمٰعیلیہ کلب میں گزارا، کیونکہ تہذیب سے قریب ترین آخری شب تھی۔ اِس کے بعد صحرائے لیبیا کی راتیں تھیں اور جنگ کی بدتہذیبی۔

اسمٰعیلیہ کلب کے ماحول سے ہر طرف پُونہ (یا شاید پھُونہ کہنا زیادہ صحیح ہے) ٹپکتا تھا۔ لمبی مُونچھوں والے ادھیڑ عمر کے کرنیل اور جرنیل جا بجا بکھرے پڑے تھے جن کی خدمات سے محاذِ جنگ تو محفوظ تھا، لیکن کلب کا محاذ اُن کی ہمہ وقتی زد میں تھا۔ ان کی کلب سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اُس کے فرنیچر کا حصّہ معلوم ہوتے تھے؛ البتہ کھاتا پیتا اور ناچتا گاتا فرنیچر؛ سوائے لڑنے کے ہر کام کے لیے تیار رہتے تھے۔ کلب کے سبز قطعات پر برقی پنکھوں کے نیچے بیٹھ کر بیئر پینا ان کا دُوسرا اہم کام تھا۔ خدمت کے لیے گہری لال ٹوپیوں والے اور گاڑھے کالے چہروں والے سُوڈانی خدمت گار تھے جو پُونہ کلب کے بیروں کے عم زاد معلوم ہوتے تھے۔ صرف "کوئی ہائے" کی مانوس آواز نہیں آ رہی تھی۔

صُبح محاذِ جنگ کی طرف بڑھنا تھا؛ لہٰذا رات کو ہمارے انگریز ساتھیوں نے معمول

○ یہ آج سے پندرہ بیس برس پہلے کے تاثرات ہیں۔ فلسطینی فدائین کے موجودہ جذبہ جاں نثاری اور وطن پرستی کو مصنّف سلام کرتا ہے۔

سے بہت زیادہ پی اور زیادہ دیر پی کہ جنگ پر جانے کی یہی اُن کی رِیت ہے۔ اِس خاکسار کے پاس کنارۂ سویز تو تھا، لیکن کوئی سفینہ نہ تھا کہ اُسے جلا کر مسلمانوں کی رِیت پُوری کرتا۔ ہاتھ اُٹھائے اور دُعائے خیر مانگی۔

کوئی دوپہر کا وقت تھا کہ ہم قاہرہ پہنچے، بلکہ قاہرہ سے گزرے کہ وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی۔ پاک و ہند کے مسلمانوں کے دماغ میں قاہرہ کا تصوّر سراسر جامعۂ ازہر کا تصوّر ہے یعنی اہلِ قاہرہ یا رکوع میں ہیں یا سجود میں۔ ہاتھ میں کوزہ ہے یا تسبیح اور سر پہ سُرخ رُومی ٹوپی۔ لیکن قاہرہ کے بازاروں سے گزرتے ہوئے اِس شہر کی جھلک دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہاں ازہر کے علاوہ کچھ اور بھی ہے اور اُسے دیکھ کر جی چاہا کہ

اِک لمحہ یہاں دَم لُوں
دَامن کو ذرا بھر لُوں
اُن پھُولوں کی خوشبو سے
جو سامنے کھلتے ہیں!

اور شاید نادانستہ طور پر دَم لینا شروع بھی کر دیا تھا کہ پچھلی گاڑی نے زور سے ہارن دے کر ہمارا رُومان پریشان کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد دریائے نیل عبور کیا جو شہر کے وسط سے بہتا ہے اور اہرام کی طرف بڑھے۔ مینا پہنچ کر ایک بلندی پر کھُلے صحرا میں داخل ہوئے اور غضب خدا کا یہاں ــــ یعنی قاہرہ کی بجائے صحرا میں ــــ کانوائے نے دَم لیا۔ گاڑی سے نکل کر پیچھے قاہرہ پر نگاہ ڈالی کہ شاید انسانوں کی بستی پر یہ آخری نگاہ ہو۔ اور جب دیکھا تو ہمیں قاہرہ کا شاداب نخلستان دکھائی دیا جو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اُس کا تصوّر کر لیا اور یُوں محسوس ہُوا جیسے زندگی کو بتدریج پیچھے چھوڑتے جا رہے ہیں لیکن خوفِ مرگ کے ساتھ ایک کونے سے یہ خیال بھی آنمودار

ہُوا کہ شاید بچ نکلیں اُور کسی دن واپس آکر اِسی قاہرہ کی زندگی میں حصّہ لے سکیں۔ بہر حال عین اُس وقت ہمارے دِل کے اندر بیم و رجا کے معرکے میں رجا کی حالت خاصی پتلی تھی۔

ہم کوئی چھ گھنٹے رواں رہے۔ دھوپ سے ہم اپنے وطن میں بھی مانوس تھے لیکن صحرا کی دھوپ یُوں لگتی تھی جیسے عارضۂ قلب ہو رہا ہو! چنانچہ دِل کو تھامے بالآخر سکندریہ کے قریب امریّہ پہنچے اور رات کے لیے ڈیرے ڈالے۔ جُوں جُوں رات قریب آتی گئی، گرمی غائب ہونے لگی۔ نصف شب کو خنکی کا یہ عالم تھا کہ ٹھنڈا عارضۂ قلب ہونے لگا اور سپاہی دلیپ سنگھ نے تو سچ مچ سینے پر دھر کے ہاتھ کہا 'یار مر گیا' اور مرنے لگا۔ حوالدار میت سنگھ نے دِن رات کے درجۂ حرارت کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے نہایت وثوق سے کہا کہ یہ بیماری دِل کی نہیں اُور نہ علاج ہی کی ضرورت ہے۔ دلیپ سنگھ محض گرم سرد ہو گیا ہے۔ صُبح کا انتظار کیا جائے کہ سَردگرم ہو کر شفا پالے؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ دلیپ سنگھ نے آنکھ کھولی۔ سینے پر سے ہاتھ اُٹھایا اور مُسکرا دیا۔

اگلی صُبح ہمارا کارواں ساحلی سڑک کے راستے سلوم کو روانہ ہُوا۔ جُوں جُوں سُورج بلند ہوتا گیا ہمارا درجۂ حرارت بھی بلند ہونے لگا۔ بارہ بجے کے قریب سُورج کے ساتھ ہم بھی نصف النّہار پر تھے۔ بہر حال اب شکایت کا مقام نہ تھا کہ کارزار کے مضافات میں تھے۔ وہ مقامات جو اِن دنوں تاریخ کی زبان پر تھے، ہمارے رستے میں یکے بعد دیگرے آنے لگے مثلاً العالمین، مرسیٰ مطروح، سیدی بارانی وغیرہ۔ العالمین نے ابھی وہ شہرت حاصل نہیں کی تھی جو پردۂ تقدیر میں اِس مقام اور لارڈ منٹگمری کی تاک میں بیٹھی تھی۔

مرسیٰ مطروح پہنچے تو سالِ گزشتہ کی یک طرفہ جنگ کی کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اِسی مقام پر لارڈ ویول اور اُن کے چوتھے اِنڈین ڈویژن نے مسولینی کی فوجوں کو مُرغا بنایا تھا۔ جنگ یک طرفہ اِس لیے تھی کہ اِس میں لڑنے کا پارٹ صِرف ہمارے ڈویژن نے ادا کیا تھا۔ مخالف

یعنی اطالوی سپاہی سٹیج پر آئے تھے، لیکن پھرتی سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے، بلکہ کچھ دور جاکر یک لخت تھم گئے تھے کہ تعاقب کنندگان کا ناحق دم نہ پھولے۔ اسی معرکے کے متعلق کسی نامہ نگار نے ہمارے سپاہی کی رائے پوچھی، تو اس نے جواب دیا: "اچھی ایکسرسائز تھی!" یعنی یہ اسے نقلی مشق سمجھ رہا تھا جو امن کے زمانے میں کی جاتی ہے۔

اسی جنگ میں جب اطالوی افسروں کو مورچوں سے نکالا گیا، تو ان کے ساتھ ان کی داشتائیں بھی برآمد ہوئیں۔ اس پر ہمارے ایک پنجابی سپاہی کی غیرت جوش میں آگئی اور اس نے ایک اطالوی کرنل کے ذاتی اسلحہ کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے اسے طعنہ دیا کہ اور نہیں تو ان "تیویوں"○ کی خاطر ہی جان پر کھیل جاتے اور پھر اسے سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ "چھوٹی تے پانی پاکے ڈُب مر!"

اور یہ سطور لکھتے ہوئے وہ مرصّع پستول بھی یاد آتا ہے جو اسی مرسیٰ مطروح میں کیپٹن میاں خاں◎ نے ایک اطالوی بٹالین کمانڈر کے گلے سے اتار کر تحفتہً ہمارے گلے میں ڈال دیا تھا اور بعد میں اسی پستول کی بدولت ہم ایک ناکردہ قتل میں ماخوذ ہوتے ہوتے بچ گئے۔ لیکن یہ قصہ اپنی جگہ پر!

اس لمحے اگرچہ مرسیٰ مطروح میں خاموشی تھی؛ تاہم طیور مطروح سے ایک اڑتی سی خبر تھی کہ جنگ بہت دور نہیں۔ سڑک کے کنارے ہر چند قدم پر کسی یونٹ کے نام کا بورڈ تھا یا تیر کا نشان، جو صحرا کی وسعت میں کسی چھپے سپلائی ڈپو یا ورکشاپ کی طرف اشارہ کرتا تھا، مگر سب سے بڑا بورڈ جو نظر آیا کسی یونٹ کے بارے میں نہ تھا بلکہ مکھیوں کے متعلق تھا۔ اس بورڈ پر قدِ آدم حروف میں لکھا تھا: KILL THAT FLY● جو سراسر شجاعت کے منافی تھا؛ چنانچہ اسے پڑھ کر ہمارے غازی دلوں کو ندامت سی محسوس ہوئی کہ آخر مکھی مارنا

○ عورتوں ◎ بعد میں لفٹننٹ کرنل میاں خاں ایم سی ● "مارو اس مکھی کو"

کونسی مردانگی ہے لیکن بعد میں جب اِن صحرائی مکھیوں سے ہمارے قریبی تعلقات قائم ہوئے تو معلوم ہُوا کہ جنگ میں مگس کشی ایک خاصا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ اِس جنگ میں ہمارے سامنے تین دُشمن تھے : جرمن۔ اطالوی اور مکھیاں۔ جرمنوں کا معاملہ تو ذرا مختلف تھا لیکن تجربے سے معلوم ہُوا کہ ایک اطالوی کی بجائے ایک مکھی مارنا زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ حربی صلاحیت کے اعتبار سے اِن ریگستانی مکھیوں کا مقام اطالویوں سے کسی قدر بلند تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ بورڈ لگایا گیا تھا، ورنہ ہمیں اِن غیر ملکی مکھیوں سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا۔ یہ محض SELF DEFENCE ○ کا تقاضا تھا۔ اگر ہم سے مکھیاں جیت جاتیں، تو ہمارا وقت میدانِ جنگ کی بجائے ہسپتال میں گزرتا۔ یا شاید ہسپتال سے بھی ذرا آگے !

مطروح سے نکلے، تو سیدی بارانی سے ہوتے ہُوئے شام کو سلّوم پہنچے۔ یہ مقام مصر اور لیبیا کی سرحد کے علاوہ امن اور جنگ کی سرحد پر بھی واقع تھا۔ رات وہیں جنگ کی طرف پیٹھ کر کے بحیرہ روم کے کنارے گزار دی اور صبح درّہ ہلفایہ سے گزر کر طبرق سے چند میل اِدھر بل حمد کے مقام پر فروکش ہُوئے۔ یہ ہمارے کارواں کی آخری منزل تھی، لیکن کوئی بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہماری منزلِ مقصود بھی تھی۔ کیونکہ اب ہم ریزرو برگیڈ ہونے کی حیثیت سے میدانِ جنگ کے دروازے پر بیٹھے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ درونِ خانہ کیا ہو رہا ہے۔

صرف چند میل جنوب میں جرمن فوجیں ہمارے برگیڈوں سے برسرِ پیکار تھیں۔ توپوں کی گھن گرج سے فضا میں ایک ہیبت ناک اور مستقل سی گُونج تھی جس میں شنوندگانِ گرامی یعنی ہمارے لیے کچھ تواضع کا رنگ نہ تھا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر گولہ ہمارے سر پر ہی بارِ امانت ہلکا کرے گا؛ چنانچہ پہلی رات گولہ شماری میں ہی کٹی۔ دُوسری رات کسی قدر

○ ذاتی حفاظت

مانوس ہونے لگے، لیکن مانوس ہونے کے بعد بھی ہمارا استعمال تو یہی تھا کہ جونہی ضرورت پڑے ہمیں مقتل میں جھونک دیا جائے۔ سو ہماری دماغی کیفیت وہی تھی جو بقرعید سے پہلے ہر دُور اندیش بکرے کی ہوتی ہے اور بمشکل دو ہفتے گزرے تھے کہ ہمارے بریگیڈ کی بقرعید آ گئی۔ یہ تقریب ہم نے جرمنوں کے ساتھ کس دھوم سے منائی، اس کا ذکر ذرا آگے آئے گا۔

۱۰

جنگ سے پہلے

طبرق پر برطانوی قبضہ ضرور تھا، لیکن تھا خانہ بدوشوں کا سا۔ کیونکہ نیچے جنوب مغرب سے جرمن فوجیں ہمارے العدم اور نائٹ برج کے مورچوں پر بے حد غیر دوستانہ دباؤ ڈال رہی تھیں اور ہمارا قبضہ بڑی شدّت سے ڈگمگا رہا تھا۔ امکان تھا کہ جرمن کسی لمحے اِن دو مقامات کو رَوند کر طبرق پر جھپٹ پڑیں گے؛ لہٰذا طبرق میں جہاں ڈٹ کر لڑنے کا سامان کیا گیا تھا وہاں رختِ سفر بھی باندھ رکھا تھا کہ ناچار بھاگنا پڑے، تو کھُلے بسترِ فرار میں حائل نہ ہوں۔ ہمارا بریگیڈ اَب اِس انتظار میں بیٹھا تھا کہ طبرق جانے کا حکم ملتا ہے یا العدم کا۔ اِن دو مقامات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا مُشکل تھا ہم جدھر جاتے راہیٔ مُلکِ عدم ہی تھے۔

بَل حمد میں بیٹھے ہُوئے جنگ نہ صِرف سُنائی دیتی تھی، بلکہ رات کو دکھائی بھی دیتی تھی، لیکن دو دن دیکھنے سُننے کے بعد یُوں محسوس ہونے لگا جیسے جنگ نہیں، یُونہی پڑوس میں تماشا ہو رہا ہے۔ جی چاہتا کہ یہ تماشا ذرا اور قریب سے دیکھیں؛ چنانچہ حجامت کے بہانے طبرق جا نکلے۔ گویا جرمنوں سے چند قدم ہی اِدھر ـــــ نائی کی کُرسی پر بیٹھے، تو محسوس ہُوا کہ آرائشِ گیسو کے لیے اِس سے بہتر ماحول قاہرہ میں بھی نہ مِلے گا۔ نائی کی دکان کے اندر قینچیاں اور اُسترے چل رہے تھے اور باہر توپیں اور بندوقیں دندنا رہی تھیں۔ اگر تکلیف توپیں اور

بندوقیں ختم جاتیں تو قینچی کی لَے ٹوٹ جاتی اور اُسترے کی تال بگڑ جاتی، لیکن جرمنوں کے ہوتے ہُوئے ایسے حادثے کا امکان نہ تھا؛ چنانچہ ہماری حجامت پُورے جنگی اعزاز کے ساتھ ہوتی رہی۔

لیکن اِس اعزاز کے باوجود ہم حجامت کے دوران کانپتے ہی رہے۔ وہ اِس لیے کہ طبرق کے چاروں طرف خاردار تار کی حفاظتی باڑ لگی ہوئی تھی اور بل حمد سے آتے ہوئے باڑ کے اندر داخل ہونے پر یُوں محسوس ہُوا تھا کہ محفوظ ہونے کی بجائے محبوس ہو گئے ہیں؛ چنانچہ ہم دل ہی دل میں دُعا مانگتے رہے کہ "الٰہی! اثنائے حجامت میں جرمنوں کو حملے کی توفیق نہ بخشنا۔ لڑائی میں ہارنا اور ہتھیار ڈالنا برحق ہے لیکن کُھلے میدان میں۔ طبرق کی چاردیواری میں تو ہتھیاروں کے علاوہ اپنے آپ کو بھی ڈالنا پڑے گا۔" ہماری دُعا قبول ہوئی اور حجامت ختم ہوتے ہی ہم باڑ سے نکلے جیپوں میں بیٹھے اور بل حمد کی کُھلی فضا میں جا کر دم لیا۔

خیال تھا کہ اب کسی لمحے لڑائی کا حکم ملتا ہے لیکن کئی روز گزر گئے اور وہ لمحہ نہ آیا۔ ہم نے سوچا فراغت ہے غسل کیوں نہ کر لیں۔ پہلے غسل کو بہت عرصہ تو نہیں ہُوا تھا یہی بیس پچیس روز اُدھر کی بات تھی اور ہر چند کہ جنگ بھی قریب تھی؛ تاہم بحیرہ روم قریب تر تھا اور اس کی گنگناتی، جھلملاتی موجوں کی صدا مسلسل دامنِ دل کھینچ رہی تھی؛ چنانچہ سہ پہر کا وقت تھا کہ یکایک مثلِ آزاد ○:

یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل
ٹہلتا ٹہلتا ذرا روم چل!

اور ذرا برعکسِ آزاد: وہاں جا کے کپڑے بدن سے اتار
سمندر کی موجوں پہ تھا ئیں سوار

○ مولانا محمد حسین آزاد

اَنا بعد بحیرہ روم کے شفّاف زمرّدیں پانی کے گوارا اور گداز لمس نے وہ آسودگی بخشی کہ پےَ درپےَ غوطے لگانے شروع کردیے اور اپنی ہم غوطہ مچھلیوں کی طرح زیرِ آب تھرکنے لگے۔ یہ شغل ایک محویت کے عالم میں کچھ عرصے تک جاری رہا۔ آخر سطحِ آب پر آئے اور آنکھ کھلی تو معلوم ہُوا کہ سَو دو سَو گز درونِ سمندر آچکے ہیں یعنی اگر بحیرہ روم کی تنارکوں نے ایک منٹ کے اندر اندر صدقِ دل سے مہاتما بودھ کے ہاتھ پر بیعت نہ کرلی، تو ہماری خیر نہیں۔ ساحل کی طرف دیکھا تو بے اختیار مُنہ سے نکلا:

کشتی شکستگانیم اے بادِ شُرطہ برخیز!

معاً خیال آیا کہ ہماری جنگ اور حیات تو تمام ہوگئی، لیکن پسماندگان کی نظروں میں نہ مُردوں میں ہوں گے نہ زندوں میں بس MISSING BELIEVED KILLED ○ ہی سمجھے جائیں گے۔ بچنے کا معروف ذریعہ تو ایک ہی تھا کہ بادِ شُرطہ چل پڑتی اور ہمیں اُڑا کر ساحل تک لے جاتی، لیکن اب کون اُسے شیراز سے لے کر آتا؟ اللہ کا نام لیا اور اپنی محدود پیراکانہ استعداد کے سہارے ساحل کی طرف تیرنا شروع کیا۔ اِس مُہم میں خُدا جانے ایک ماہ لگا یا ایک سال، تیرتے تیرتے آخر کار ہم ساحل پر وارد ہُوئے، لیکن یہ ورُود کچھ نیمے دروں نیمے بروں کا سا تھا۔ یعنی ہمارا دھڑ تو سمندر میں ہی تھا، صرف سر اور بازو ساحل کی ریت تک پہنچ سکے اور وہیں منجمد ہوگئے۔

جب آنکھ کھُلی تو معلوم ہُوا کہ کسی زمانے میں سمندر میں نہانے آئے تھے۔ شام ہونے کو تھی کہ اُٹھے اور لُڑھکتے لُڑھکتے کیمپ میں پہنچے۔ جب خبر عام ہوئی کہ ہم زندہ ہیں تو لوگ ہمیں دُور دُور سے دیکھنے آئے۔ چند بدتمیزوں نے ہم سے بحیرہ روم کی دلچسپیوں کے متعلق سوال بھی کیے۔ گویا ہم نے اِس لیے جان کی بازی لگائی تھی کہ اِن مسخروں کے ہاتھوں اپنی پریس

○ "لاپتہ ہے غالباً مارا گیا" ـــــ یہ جُملہ جنگ میں لاپتہ سپاہیوں کے متعلق اکثر استعمال ہوتا ہے۔

کانفرنس کرا لیتے؛ چنانچہ ہم نے اکثر سوالوں کے جواب ٹھونٹا رکھے۔

صُبح ہوئی تو وہ حکم بھی آگیا جس کا انتظار تھا یعنی یہ کہ بریگیڈ آگے بڑھ کر سیدی رزیغ کی پہاڑی پر دفاعی مورچے قائم کرے اور جرمنوں کے حملے کا منتظر رہے کیونکہ آثار سے پیدا تھا کہ جرمن طبرق کی بجائے سیدی رزیغ پر حملہ کرنے والے ہیں۔

دس دن کے آرام کے بعد ہمارا بریگیڈ بل حمد سے اُٹھ کر سیدی رزیغ میں مورچہ گیر ہُوا۔ ہماری پیادہ فوج کے دستے پہاڑی کی جنوبی ڈھلان پر ــــ یعنی دشمن کے آمنے سامنے ــــ کیل کانٹے بلکہ ذرا زیادہ مہلک ہتھیاروں سے لیس ہو کر بیٹھ گئے۔ ادھر ہم ہیڈکوارٹر والے پہاڑی کی شمالی ڈھلان پر زمین دوز مورچوں میں داخل ہو گئے جہاں باقاعدہ سگنل آفس کھولا اور ایکسچینج لگایا۔

ایک دن گزر گیا۔ ایک اور گزر گیا لیکن جرمن حملے سے گریز کر رہے تھے۔ ہم مُسلسل دو روز کے امن سے تنگ آ کر غاروں سے نکلے اور سیدی رزیغ کی وسیع سطح مرتفع پر مٹرگشت کرنے لگے۔ اِس پہاڑی پر پچھلے سال کئی معرکے ہو چکے تھے جن کے نشان بیسیوں بیکار توپوں، سینکڑوں ناکارہ گولوں اور ہزاروں کارگر مگر پوشیدہ بارُودی سُرنگوں کی شکل میں بکھرے پڑے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہُوا کہ ایک چلتی لاری کا پاؤں نادانستہ طور پر کسی سُرنگ پر آ گیا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنے سواروں سمیت خاک و خُون میں بدل گئی۔ سیدی رزیغ کی سطح پر ہر قدم الگ الگ پھُونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا کہ نیچے کوئی آفت نہ خوابیدہ ہو۔

سیدی رزیغ کی زندگی عام روزمرہ کی آسائشوں سے یکسر خالی تھی۔ جرمن توپیں کسی وقت ایک سوالیہ گولہ پھینک سکتی تھیں اور پھر نہایت آتشیں مکالمہ شروع ہو جاتا؛ لہٰذا میس کھڑا کرنے کا تکلّف کسی قدر بیجا تھا۔ بس ہر روز ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا، بُلی بیف ○ کا ایک ٹین

○ BULLY BEEF یعنی بیل کا گوشت

اور پھل کا ایک ڈبہ بل جاتا جو کسی چٹان کی اوٹ میں بیٹھ کر اَن دھوئے ہاتھوں سے کھا لیتے۔ وہاں ہاتھ دھونے کے لوازمات میسّر نہ تھے۔ پانی فقط زبان تر کرنے کے کام آتا تھا۔ باقاعدہ پانی پینے کا دستور نہ تھا اور ہاتھ مُنہ دھونا تو ایسی عیاشی تھی جسے یاد کرنے کی دلِ حزیں کو اجازت نہ تھی۔

چوبیس گھنٹوں کے لیے پانی کا راشن فقط ایک بوتل تھا اور صحرا میں پیاس کو داجبی طور پر بُجھانے کے لیے بھی ایک داجبی سی جھیل کی ضرورت ہوتی ہے؛ چنانچہ ہم نے کبھی ایک سالم گھونٹ کو اپنے حلق سے نیچے اُترتے نہ دیکھا۔ بس بوتل کو مُنہ سے لگاتے اور جونہی زبان کو ایک گرم مرطوب سا احساس ہوتا اُسے زبان سے علیٰحدہ کر دیتے۔ لہٰذا ہمارا پانی پینا پیاس بُجھانے کے لیے نہ تھا، بلکہ اِس لیے کہ بُلی بیف کے سُست رَو لقموں کا گلے میں کیو' نہ لگ جائے۔ پھر ہر کھانے میں خواہ وہ بُلی بیف ہو یا سینڈوچ، ایک مُناسب مقدار صحرائی ریت کی بھی ضرور شامل ہو جاتی۔

نہ پُوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اِس میں ریزۂ الماس جُزوِ اعظم ہے

رہا غسل تو وہ ماضی قریب کے تجربے کے بعد محض ایک واہمہ تھا۔ ایک سپنا اور سپنا بھی کبھی نہ آنے والا کہ بغیر نیند کے سپنے نہیں آیا کرتے اور سیدی رزیغ میں نیند کہاں؟ جہاں بیٹھ گئے یا لیٹ گئے، بے بستر و بالیں رات گزار دی، سوائے اِس کے کہ کوئی گولہ مخل ہو۔

تیسرا دن تھا اور جرمن حملے کا نام نہ تھا۔ ہمارے لیے حملے کا انتظار خود حملے سے زیادہ صبر آزما تھا۔ صبح صبح ہی ایک چٹان سے لگ کر یکہ و تنہا، بے آب و دانہ، زندگی سے بیزار بیٹھا تھا کہ ایک خُدا کا بندہ قریب آتا دکھائی دیا۔ پاس آ کر رُکا اور سلیوٹ کر کے کہنے لگا:

"صاحب، ہمارے صاحب نے آپ کو بُلایا ہے۔"

تنگ تو بیٹھا ہی تھا، جواب دیا:

"جاؤ، تم اپنے صاحب سمیت بہشت میں جا سکتے ہو، سمجھے؟"

غالباً کچھ نہ سمجھا اور چلا گیا، لیکن ایک گھنٹے کے بعد پھر آنکلا اور بولا:

"صاحب کا اصرار ہے کہ ضرور آئیے۔"

اب کے از راہِ تفنن صاحب کا نام پوچھا تو بولا

"کیپٹن مظفر۔"

دل میں کہا "کوئی ہوگا" لیکن کبھی سُنا تھا نہ دیکھا۔ پیامبر سے پوچھا:

"تمہارے صاحب ہمیں جانتے ہیں؟"

جواب میں کہنے لگا:

"کیپٹن صاحب نے صرف اتنا کہا ہے کہ سیدی رزیغ میں نیا برگیڈ آیا ہے۔ اگر اس میں کوئی دیسی افسر ہو تو اُسے کہو خدا کے لیے مجھے آکر ملے۔ میں چھ ماہ سے ایک پائنیر یونٹ لیے اکیلا صحرا میں بیٹھا ہوں اور کسی ہم جنس سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں۔"

یہ دل گداز کہانی سُنی تو پیامبر کے ساتھ ہولیا اور سیدی رزیغ سے کوئی دو میل پیچھے مشرق کو ایک پائنیر کمپنی کی لائنوں میں جا داخل ہوا۔ آگے ایک پنجابی کپتان کا کھلکھلاتا ہوا چہرہ اور کھُلے مہمان نواز بازو تھے۔ معانقے سے فارغ ہوئے تو بولے:

"تعارف بعد میں ہوتا رہے گا، پہلے غسل کرو۔"

سیدی رزیغ میں غسل کی دعوت! گویا کپتان صاحب ایک عام فہم صحرائی مذاق کر رہے تھے۔

عرض کیا:

"پہلے تعارف ہی ہو جائے، تو بہتر ہے۔ غسل تو اب وطن میں جا کر ہی میسر ہوگا۔"

جواب میں مظفر خاموش رہے اور میری بے یقینی کا احترام کرتے ہوئے میرا بازو تھامے چل پڑے اور آہستہ سے مجھے ایک خیمے کے اندر دھکیل دیا۔ اندر کیا دیکھتا ہوں کہ پانی سے لبریز ایک ٹب پڑا ہے جو صحرا کے پیاسے کو پہلی نگاہ پر تالاب نظر آیا۔ دُوسری جانب صاف خشک تولیہ اَور صابن رکھا تھا۔ ادھر ہم تھے کہ کبھی اپنے مُنہ کو اَور کبھی اُن کے گھر کر دیکھتے تھے۔ کپتان صاحب نے ہمارے چہرے کی کیفیت دیکھی، تو مُسکرائے اور خیمہ بند کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ اِس کے بعد جو کچھ ہم نے کیا اُسے غُسل نہیں کہنا چاہیے۔ ہمارے تشنہ و سوختہ جسم نے انگاروں کی طرح پانی جذب کر لیا۔

اِس عشرتِ نایاب سے فارغ ہوئے، تو کپتان صاحب کا اَردلی ایک تازہ دُھلا ہُوا خاکی جوڑا لایا ——— بتایا گیا کہ ہمارے اپنے کپڑے دُھلنے کے لیے بھیج دیے گئے ہیں ——— یہ یُونیفارم نہ تھی، خاکی رنگ میں عروسی جوڑا تھا؛ پہنا، تو محسوس ہُوا کہ صحرا میں جنگ لڑنے نہیں آئے، ذرا ہٹلر نے کاک ٹیل پارٹی پر آنے کی زحمت دی ہے۔

اِتنے میں دُوسرے خیمے سے مظفر کی آواز آئی:

"اگر نہا چکے تو جلد آؤ، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

یہ دُوسرا مذاق حقیقی معلوم ہوتا تھا۔ سیدی رزیغ میں گرم کھانے کا وجُود؟ ناممکن صحرا میں تو صِرف ایک ہی کھانا تھا: بُلی بیف، جو ٹین میں سرِ شام ہی چراغِ مفلس کی طرح بُجھا سا رہتا تھا، لیکن کھانے کے خیمے میں داخل ہُوا تو کیا دیکھتا ہوں! کیا دیکھتا ہُوں!! مُرغِ مسلّم اور بھاپ کے بادل، پُلاؤ اور بھاپ کی گھٹائیں اور کیا کیا کچھ۔ میرے دل نے لگاتار دو تین دھڑکنیں مِس کیں۔ اگر رُک بھی جاتا، تو رَوا تھا۔ اُس حج کا ثواب، جو ابھی ہم نے کرنا تھا، دِل ہی دل میں کیپٹن مظفر کی نذر کیا اَور مُرغ کو وہاں پہنچایا جہاں اُس کا خمیر تھا۔

پھر کپتان صاحب سے باتوں کا دَور شروع ہُوا۔ یہ شخص شیریں خصائل ہی نہ تھا،

شیریں دہن بھی تھا۔ اس کی باتیں سُنتے سُنتے دو گھنٹے گزر گئے۔ یُوں جیسے دو لمحے گزرے ہوں۔ دِلنوازی کا یہ سلیقہ پہلے نہ دیکھا تھا۔ اگر جنگ سے اُٹھ کر نہ آیا ہوتا تو مظفر○ کی باتیں ہی سُنتا رہتا، لیکن خیال آیا کہ کہیں طویل غیر حاضری کی وجہ سے بھگوڑا ہی نہ قرار دیا جاؤں، رُخصت چاہی اور برگیڈ ہیڈ کوارٹر پہنچا۔

شام ہونے والی تھی۔ معلوم ہُوا ڈویژن کمانڈر جنرل ریس (REES) تشریف لائے ہُوئے ہیں اور تقریب یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں جرمن مورچوں پر ایک محدود حملہ کیا جانے والا ہے۔ مقصد اس شب خُون کا یہ تھا کہ دُشمن کے مزاج اور ارادے کا اندازہ لگایا جائے اور اس غرض کے لیے دُشمن کے کُچھ قیدی پکڑے جائیں۔ دُشمن کو مار بھگانا یا اُس کے مورچوں پر قبضہ کرنا مُدعا نہ تھا۔

کوئی گیارہ بجے گُھپ اندھیرے میں ہماری ایک پلٹن آگے بڑھی۔ اِس پلٹن کے کاروبار اور خیروعافیت کے متعلق پیچھے خبریں بھیجنے کے لیے ایک سگنل کا دستہ ساتھ کر دیا گیا۔ اِس دستے کے پاس دو گاڑیاں تھیں جن میں وائرلیس سیٹ رکھے تھے۔ دستے کے کمانڈر کیپٹن کار تھے جو میرے سینئر تھے۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ سگنل آفس میں بیٹھ کر وائرلیس سیٹ سے کان لگائے رکھوں اور جونہی کوئی گرم خبر آئے جنرل ریس تک پہنچا دوں۔ جنرل موصوف کوئی بیس گز کے فاصلے پر اپنی وین (گاڑی) میں ہمہ تن انتظار تھے۔ جب گھنٹہ بھر گزر گیا اور شبخون کی کوئی خبر نہ آئی، تو جنرل صاحب متفکر ہونے لگے اور صُورتِ حالات معلوم کرنے کے لیے اپنے اردلی کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے اردلی کو اطمینان سے جواب دیا کہ NO NEWS ⊖ اور خُدا جانے کیا سُوجھی کہ ساتھ اِن الفاظ کا اضافہ بھی کر دیا:

○ بعد میں لفٹننٹ کرنل مظفر۔ آج کل غالباً کھیوڑے میں رہتے ہیں۔

⊖ کوئی خبر نہیں۔

"AND NO NEWS IS GOOD NEWS" ○

اُردلی کم بخت نے ہمارا پیغام مع ہماری فلاسفی کے جنرل صاحب تک پہنچا دیا۔ ہماری فلاسفی بھی ایسی کیا تھی، فوجی حلقوں میں یہ فقرہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ صرف یہ کہ ایک سیکنڈ لفٹننٹ ایک جنرل کو اِس بے باکی سے نہیں کہلا بھیجتا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُردلی پھر نمودار ہُوا اور حسبِ توقع ہمیں بتایا کہ جنرل صاحب سلام کہتے ہیں۔ اُٹھا، جنرل صاحب کی وین کے پاس گیا۔ دروازے پر دستک دی اور چہرے پر ایک مصنوعی سکون بلکہ کانپتا کانپتا تبسّم اوڑھ کر اندر پاؤں رکھا۔ اب جنرل صاحب کو جو دیکھتا ہُوں، تو داغ کے معشوق کی طرح

بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں!

ہمارا سکون اور تبسّم دونوں ایک لطیف سے پسینے میں تحلیل ہو گئے۔

جنرل صاحب بولے:

"جب مجھے نو نیوز کے معنی جاننے کی ضرورت ہو گی، تو مَیں خود پُوچھوں گا۔ مگر بغیر پُوچھے میں کوئی تشریحات سُننے کا عادی نہیں ہُوں۔"

جواب میں لیس سر کے علاوہ کیا کہہ سکتا تھا؟ فوج میں یہ ہزاروں جوابوں کا ایک جواب ہوتا ہے۔ اِس سے بہتیری بلائیں ٹل جاتی ہیں، لیکن جنرل ریس ایک دُوسری قسم کی بلا تھے۔ کہنے لگے:

"تو پھر شبخون کی کیا خبر ہے؟"

"سر! کچھ بھی تو نہیں۔ اُس طرف سے کوئی بولتا ہی نہیں۔"

"تم کیا کر رہے ہو؟"

"سر! کان لگائے بیٹھا ہوں، جُونہی ...."

○ کسی خبر کا نہ آنا بھی خوش خبری کے برابر ہے۔

"تمہاری دو ٹانگیں بھی ہیں؟"

"یس سر"

"پھر دوڑو اور خود جا کر خبر لے آؤ"

"یس سر"

یہ کہہ کر سلیوٹ کیا اور اسی ہاتھ سے واپسی پر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ وین سے نکل رہا تھا تو جنرل صاحب نے ایک رعایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ "ساتھ ایک وائرلیس گاڑی لے جاؤ اور جہاں بھی کچھ نظر آئے، مجھ سے براہِ راست بات کرو، خواہ نیوز ہی کیوں نہ ہو" ——— فوج میں ایسی گوشمالی کو رازبری کہتے ہیں اور ہم نے خوب سیر ہو کر نوش کی۔

اب جنرل صاحب ہمیں سینما میں فلم دیکھنے نہیں بھیج رہے تھے بلکہ دشمن کے مورچوں میں اپنی گم گشتہ بٹالین کی خبر لینے کے لیے۔ اور یہ کوئی معمولی پرائیویٹ سا کام نہ تھا، بلکہ اچھی خاصی مہلک سی بین الاقوامی مہم تھی۔ حکم سنتے ہی ہمیں وہ ہاتھ یاد آئے جو ہمارے بازو پر امام ضامن باندھا کرتے تھے، لیکن جو ہاتھ ہمارے قریب ترین تھے، نائیک ہرنام سنگھ کے تھے۔ سو وہ تسلی بھی میسر نہ ہو سکی؛ چنانچہ قہرِ لفٹین بر جانِ لفٹین۔ ایک گاڑی لی۔ اس میں وائرلیس سیٹ پہلے ہی سے نصب تھا۔ دو تین آدمی بھی ساتھ لیے اور گاڑی نصیبِ دشمناں، سوئے دشمناں روانہ ہوئی۔

سڑک کے دونوں کناروں پر خاردار تار کی باڑ لگی ہوئی تھی اور باڑ کے دونوں طرف بارودی سرنگوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کوئی انسان یا گاڑی سڑک سے ذرا بھٹکی اور تار میں الجھی۔ سرنگ پر پاؤں آیا اور ایکا ایکی سرنگ پھٹی، پھر ایک آن میں تار اور تار میں پھنسنے والوں کا قصہ پاک ہو گیا۔ ہمارا قصہ پاک ہونے کے امکانات اور زیادہ روشن تھے کہ ہم اندھیری رات

میں بتّیاں جلائے بغیر سفر کر رہے تھے اور سڑک کے کنارے ہمیں نظر نہیں آتے تھے۔ یُوں سمجھیں کہ ریل کی سُرنگ میں سے ہوائی جہاز اُڑا کرلے جا رہے تھے، ذرا دائیں یا بائیں چھُو گیا اور قصّہ پاک!

چلتے چلتے کوئی دو میل گئے ہوں گے کہ سامنے ایک ساکن گاڑی کی پُشت دکھائی دی۔ "یا خُدا! یہ دُشمن تو نہیں؟" ذرا پسینہ چھُوٹا، لیکن پیشتر اِس کے کہ دریا بہنا شروع ہوتا، ہمارا ڈرائیور ہنسا اور بولا:

"جی ایہہ تاں بھگت سنگھ دی گڈّی اے۔"

بلکہ غور سے دیکھا تو گاڑیاں تھیں اور وہی وائرلیس کی گاڑیاں جن کی بھیجی ہُوئی خبروں کے لیے جنرل ریس گوش بر آواز یا فی الحال گوش بَر ہوا تھے۔ گاڑیوں کے ڈرائیوروں سے اس پسماندگی کی وجہ پُوچھی تو بولے "کپتان صاحب بچھڑ گئے ہیں صاحب آگے آگے جیپ میں جا رہے تھے، پھر یک لخت غائب ہو گئے۔"

اِس مقام سے آگے چار پانچ میل تک NO MAN'S LAND ○ تھا اور ہماری بٹالین یہ فاصلہ عبُور کر کے اُس وقت دُشمن سے دست وگریباں تھی۔ گولوں اور گولیوں کی آوازیں آ رہی تھیں، لیکن صحرا کی وسعت میں ان کی سمت یا مقام کا اندازہ مُشکل تھا۔ اب نو نیوز کی وَجہ تو معلوم ہو گئی تھی، لیکن حیران تھا کہ جنرل ریس کو کیا خبر بھیجوں۔ اگر سچ بولتا تو ایک انگریزی محاورے کے مطابق جنرل ریس بہ نفسِ نفیس ایک بچّہ جَن دیتے جو ایک جنرل کے لیے بھی خاصا جوکھوں کا کام ہے۔ دروغ کا مقام نہ تھا کہ سینکڑوں جوانوں کی موت اور زندگی کا سوال تھا۔

اِسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ سامنے سے ایک جیپ آ کر رُکی۔ یہ کیپٹن کار تھے۔ ہانپتے

○ مخالف فوجوں کے درمیان کا علاقہ

کانپتے بلکہ روتے دھوتے: ہُوا یہ تھا کہ کیپٹن صاحب جاتے وقت پُورے سات میل پیچھے دیکھے بغیر نکل گئے تھے۔ جب دُشمن سے ٹکر ہُوئی اور جنرل صاحب کو کامیابی کی خبر بھیجنے کی ضرورت محسوس ہُوئی، تو وائرلیس گاڑی کو آواز دی: کوئی ہے؟ گویا کلب میں بیرے کو بُلا رہے ہوں۔ گاڑی کی تلاش میں نکلے، تو پانچ میل پیچھے آنا پڑا اور اب سانس اس لیے پھُول رہا تھا کہ پیچھے جنرل ریس دکھائی دے رہا تھا۔

جب مجھ سے کہانی سُنی تو سناٹے میں آ گئے۔ مَیں نے مشورہ دیا کہ خبر بہرحال کامیابی کی ہے، خود ہی جنرل صاحب کو سنائیں۔ کیپٹن کار نے مائیک ہاتھ میں لیا اور جنرل صاحب سے ابتدائے کلام کی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ کپتان صاحب پر بتدریج ایک غش غالب آ رہا ہے۔ اس غش کے پیچھے جنرل صاحب کا ہاتھ بلکہ زبان کارفرما تھی۔ بہرحال یہ برداشت کرنے کے بعد کیپٹن کار نے کامیابی کی خبر سنائی اور پھر ہم نے اُن کے چہرہ پر قطرہ قطرہ رونق آتے دیکھی۔ ظاہر ہے کہ یہ رونق بھی جنرل صاحب کا عطیہ تھا۔

صبح جب بٹالین واپس آئی، تو اپنے ساتھ چند اطالوی اور جرمن قیدی بھی لائی۔ جنرل صاحب نے تمام افسروں کو شاباش دی۔ لائن کے آخر میں ہم بھی کھڑے تھے۔ ہم سے ہاتھ ملایا تو مسکرا دیے اور دُوسروں کو سُنا کر کہا:

"رات ہم دونوں نے بھی ایک چھوٹی سی جنگ لڑی تھی۔"

اس واقعہ کے بعد جرمنوں نے ہمیں ذرا زیادہ توجہ کا مستحق سمجھا بلکہ دو ہی دن بعد ہمیں اس قدر توجہ دی کہ ہمارے برگیڈ میں سے جو بچ رہے اُنہیں جرمنوں کی کم التفاتی کی کبھی شکایت نہ ہو گی۔

۱۱

روزِ جنگ

۱۷ جون ۱۹۴۲ء کی صبح طلوع ہوئی تو اُس میں افریقہ کے صحرا اور سیدی رزیغ کی پہاڑی کے لیے کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن سیدی رزیغ کے مورچہ بندوں کے لیے یہ صبح بڑی خاص صبح تھی کہ آج اُن کی موت اور زندگی کا سوال زیرِ بحث آنا تھا۔ لیکن ذرا پچھلے پہر سر دست مشرق سے سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ بارد وجامد صحرا بتدریج ایک تپتے جھلستے آدے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سیدی رزیغ کے غاروں سے ہمارے برگیڈ ہیڈکوارٹر کے افسر اور عہدیدار رات کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر باہر نکلتے تو اپنی برساتیوں سے جوراتوں کو شبنم کے قطرے جمع کرنے کے لیے بچھا رکھتے تھے 'چلو بھر پانی جمع کرتے —— ڈوب مرنے کے لیے نہیں' شیو کرنے کے لیے —— یہ شبنم ہم صحرانوردوں کے لیے مَن وسلویٰ سے کم نہ تھی' ورنہ ہمارے پانی کے راشن پر حجامت کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم میں سے کئی ایک نے اپنی داڑھیوں کی بے پناہ یلغار کے آگے اُسترے ڈال دیئے تھے اور اچھے خاصے آرچ بشپ نظر آتے تھے۔

ہمارے زمین دوز سگنل آفس سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ کبھی کوئی ڈی۔ آر (یعنی چِٹھی رساں) تیز تیز نکلتا اور موٹر سائیکل سنبھال کر ہوا ہو جاتا۔ کبھی اگلے دستوں کے ساتھ

ٹیلی فون کی لائن کٹ جاتی تو فی الفور پانچ چھ جوان پہلے سے تیار کھڑی لاری میں پھٹتے گولوں اور بھڑکتی سُرنگوں سے بے پروا لائن کی مرمّت کو چل نکلتے۔

دُشمن کے مُقابلے میں ہماری تین پلٹنیں تھیں۔ گڑھوال رائفلز۔ راجپوت رائفلز اور ساؤتھ ویلز بارڈرز۔ علاوہ ازیں پہاڑی کمین گاہوں میں جا بجا ہمارے توپخانے نے توپیں نصب کر رکھی تھیں۔ اپنے مورچوں کے سامنے ہم نے بارودی سُرنگوں اور خاردار تاروں کا جال بھی بچھا رکھا تھا کہ دُشمن کو ہمارا مورچہ حاصل کرنے کے لیے ذرا دامن سنبھال کر اور جان کی بازی لگا کر آگے بڑھنا پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ بغیر بازی لگائے ٹہلتے ٹہلتے سیدی رزیغ کی بلندی پر آدھمکے اور ہمیں مزاج پُرسی کا موقع ہی نہ دے۔ ہماری سُرنگوں سے آگے چند میل بے مالک زمین تھی اور اُس پار فیلڈ مارشل رومل کی افواج اور اُس کے بکتر بند ڈویژن تھے۔

فریقین کو ایک دُوسرے کی موجُودگی کا نہ صرف علم تھا بلکہ کئی روز سے دُور مار توپوں کے ذریعے ایک دُوسرے سے علیک سلیک بھی کر رہے تھے۔ فرق صرف اِتنا تھا کہ قرائن سے آج جرمنوں کی نیّت میں معمُول سے زیادہ فتور نظر آتا تھا یعنی یُوں جیسے حملہ کرنے والے ہوں۔ وَیسے ہماری نیّت کا بھی اللہ ہی مالک تھا لیکن آج ہمیں فقط مدافعت ہی کی توفیق تھی اگرچہ اِس مدافعت کے یہ معنی نہ تھے کہ ہم جرمنوں کے خلاف محض پکٹنگ کا ارادہ رکھتے تھے۔ جی نہیں، ہمارے جنرل سٹاف کو گاندھی جی سے نیاز حاصل نہ تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں تو خاصے ظالم پتھر تھے۔ فقط یہ کہ جنگی ضرورت کے تحت اُن کا اِستعمال صرف اُسی صورت میں کرنا تھا کہ جرمن پہلے اینٹ پھینکیں۔ اور یہ اینٹ بالآخر پچھلے پہر نازل ہُوئی۔

مَیں برگیڈ سگنل آفس میں بیٹھا تھا ——— یہ آفس" ایک گہرے غار میں تھا ——— کہ اچانک ہمارے ہراول دستوں نے وائرلیس پر جرمن حملے کی خبر دی۔ حسبِ معمول حملے کی ابتداء شدید گولہ باری سے ہُوئی۔ جواب میں ہماری توپوں نے بھی ماحضر پیش کیا۔ جب یہ باہمی

تواضع ذرا زور پکڑ گئی، تو مختلف یونٹوں سے جنگی حالت کے متعلق ٹیلیفون اور وائرلیس کے ذریعے پیغام آنے لگے۔ دو چار ہی پیغام پڑھے تو محسوس ہوا کہ کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں۔ مجھے وہ لمحہ کبھی نہ بھولے گا جب وائرلیس پر ہمارے برگیڈ کے پہلے جوان کے مرنے کی خبر آئی۔ یہ ہمارے توپ خانے کا ایک گولہ انداز تھا۔

جنگ کے دوران عموماً وائرلیس پر خفیہ زبان یعنی سائیفر یا کوڈ میں پیغامات بھیجے جاتے ہیں جو بعض اوقات محض اعداد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ دشمن بات نہ سمجھ لے لیکن جب لڑائی کا یہ عالم ہو کہ دست و گریباں کا معاملہ ہو تو پوشیدگی کا تکلف برطرف رکھ دیا جاتا ہے اور صاف ستھری انگریزی میں اطلاعات اور احکامات آنا جانا شروع ہو جاتے ہیں؛ چنانچہ لحظہ لحظہ جنگی حالت کی خبریں آتیں کہ دشمن کے ٹینک اس پہلو سے بڑھ رہے ہیں یا فلاں مقام پر توپ کا فائر تیز ہو گیا ہے یا ہمارے اتنے آدمی ہلاک ہو گئے ہیں۔ کمک کی فلاں جگہ ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام اطلاعات خفیہ زبان کی بجائے ننگی انگریزی میں وائرلیس پر آتیں۔

لیکن ایک مرتبہ ہمارے ایک یونٹ کمانڈر کو جنگی چال کے سلسلہ میں نہایت راز کی بات کہنا تھی اور فی الفور کوڈ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ صاف انگریزی میں بات کرتا تو قیامت ٹوٹ پڑتی۔ لہٰذا اپنی گوراشاہی اردو میں بولنے لگا جسے ایک گورا ہی سمجھ سکتا تھا اور جو جرمنوں کے فہم سے بہت بالا تھی۔ اِدھر ہمارے برگیڈ کمانڈر نے بھی اردو میں جواب دیا اور عارضی طور پر یہ داؤ چل گیا۔ ہم نے یہ قصہ سنا تو سینہ فخر سے تن گیا اور کئی دن تنا رہا۔

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(اگرچہ یہاں اردو دھوم مچانے کے لیے نہیں، ڈھول ڈالنے کے لیے استعمال کی گئی تھی)

ہمارا برگیڈ پہلی مرتبہ جنگ لڑ رہا تھا۔ دشمن کی دُور مار توپوں کے گولے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہے تھے اور ایسا کرنے میں ہمیں زندگی بھر کے لیے ممنون کر رہے تھے کیونکہ

وہ دراصل ہمارے استفادے کے لیے ہی پھینکے جا رہے تھے اور اگر سر سے گزرنے کی بجائے وہیں نازل ہو جاتے تو ہم نہ صرف مستفید ہوتے بلکہ متوفی بھی۔ ویسے ان گولوں کو ہم تک پہنچنے کے لیے غار کی چھت چیرنا پڑتی اور اتنی زحمت کے بعد انہیں ہم تک رسائی ہو جاتی تو مرنا عار بھی نہ تھا۔ یہ بھی اطمینان تھا کہ اکیلے نہ مریں گے۔ بہت سے یارانِ غار کی رفاقت حاصل تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس غار کی گہرائی میں ہم بے حد محفوظ تھے۔

ہمیں رہ رہ کر اُن جوانوں کا خیال آتا جو کھلے میدان میں ہم سے دو میل آگے توپوں اور مشین گنوں کی زد میں بیٹھے تھے۔ ان کی سپرِ یہ فلاسفی تھی کہ اگر اِس گولے پر ہمارا نام نہیں لکھا تو ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا اور اگر لکھا ہے تو چھپنے کا فائدہ نہیں۔ یہ ہے بہادروں کی فلاسفی لیکن اِس فلسفے کا ذکر کرنا آسان ہے، اِس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ یارانِ غار تقریباً سب کے سب ذاکر تھے۔ عامل آگے تھے۔ ادھر رات بھر دُشمن گولے برساتا رہا، لیکن اپنے مورچوں سے نکل کر ہماری طرف نہ بڑھا۔ ہماری افواج تو خیر تھیں ہی دفاعی مورچوں میں اور دُشمن کی طرف پیشقدمی کرنے کا ہمارا ارادہ تھا نہ اِمکان۔

اُمن کے زمانے میں اِس لق و دق صحرا کی راتیں کس قدر خاموش اور بے ہنگامہ ہوتی ہوں گی جہاں سینکڑوں میلوں تک کہیں آبادی کا نام نہ تھا۔ جہاں سیدی رزیغ، الدّدہ، الصدم وغیرہ محض بے جان ٹیلوں یا گھاٹیوں کے نام تھے لیکن اَب اس مُردہ ریگستان کی تمام تر پہنائی رنگ و صوت کے وحشت خیز ہنگاموں سے بھرپور تھی۔ صوت : وہ توپوں کی مسلسل گڑگڑاہٹ جو کبھی اِس قدر دُور کہ خواب معلوم ہوتا اور کبھی اِس قدر قریب کہ ٹیلے کی اوٹ لینے کو جی چاہتا۔ رنگ : وہ روشنی کے سُرخ و سپید گولے جو ہر دو جانب سے مخالف افواج کو دیکھنے یا اپنی افواج کو اِشارہ کرنے کی غرض سے چھوڑے جاتے اور وہ سرچ لائٹ کی لمبی روشن اُنگلیاں جو آسمانوں کی وسعتوں کو چیرتی ہوئی مخالف طیاروں کا تعاقب کرتیں۔ یہ رات

تقریباً ساری کی ساری آنکھوں میں کٹی۔ لیٹنے کو ایک پل بھی نہ ملا اور ملتا بھی تو اسے لیٹ کر گزارنے میں کچھ خوبی نہ تھی کہ ان حالات میں سخن گسترانہ بات نیند نہ تھی بلکہ خود زندگی تھی اور زندگی بیداری اور حرکت سے عبارت ہے۔ اگر سو جاتے تو شاید سحر ہی نہ ہوتی۔

صبح ہوئی، تو جنگ بدستور جاری تھی لیکن نہ دشمن آگے بڑھا تھا اور نہ ہم ہی نے مورچے خالی کیے تھے۔ ہمارا جانی نقصان بھی ہلکا سا تھا لیکن جو کھٹکا ہمیں مسلسل لگا ہوا تھا وہ یہ تھا کہ سیدی رزیغ کے جنوب میں سینکڑوں میلوں تک صحرا ہی صحرا تھا اور ہمیں ڈر تھا کہ دشمن کہیں ہم سے آنکھ بچا کر دُور جنوب سے بڑھ کر مشرق میں ہماری پسپائی کا راستہ نہ کاٹ دے۔ لیکن ہماری سادگی دیکھیں کہ ہم اس ناگوار امکان کا محض ذکر ہی کرتے رہے اور جرمنوں نے اس پر عمل بھی کر دیا یعنی تمام دن ان کی توپوں نے ہمیں جیسے باتوں میں لگائے رکھا اور چپکے سے اُن کا مشہور ۹۰ لائٹ آرمرڈ ڈویژن بہت دُور جنوب سے ایک قوس کی شکل میں مشرق کو ہمارے مقدم کے لیے بڑھنے لگا۔ کوئی غروبِ آفتاب کا وقت تھا کہ ہماری ہائی کمان پر جرمن چال کا انکشاف ہوا اور فوراً ہمارے بریگیڈ کو سیدی رزیغ چھوڑ کر سلوم کی طرف پسپائی کا حکم ملا۔

اب پسپائی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جونہی حکم ملا، ہر سپاہی اور افسر نے سر پہ پاؤں رکھ کر پیچھے بھاگنا شروع کیا۔ پسپائی ایک نہایت ہی دقیق جنگی چال ہے۔ اس میں ہر یونٹ، ہر سیکشن بلکہ ہر جوان کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک خاص وقت پر اپنی جگہ چھوڑنی ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ کسی دوسری طرف سے دشمن پر گولہ باری شروع کر دی جاتی ہے کہ وہ پسپا ہونے والے یونٹ کو جگہ خالی کرتے دیکھ کر اس پر پل نہ پڑے۔ اپنے اور دشمن کے درمیان ہمیشہ فاصلہ رکھا جاتا ہے اور مختلف یونٹ ایک دوسرے کو حفاظتی فائر دے کر پیچھے ہٹتے ہیں۔ اس طرح مکمل بریگیڈ کو پوزیشن خالی کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا کہ ہمارے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر نے ـــــ جس میں یہ خاکسار بھی

شامل تھا ـــــ پسپائی کی ابتداء کی۔ کوئی دس بارہ گاڑیوں کا ہلکا پھلکا سا کارواں تھا۔ اِدھر ساحلی سڑک بچتہ بھی تھی اور سیدھی بھی۔ اور ہماری فلاح کا تقاضا تھا کہ اس صراطِ مستقیم پر جس تیزی سے بھاگ سکیں بھاگیں ـــــ چنانچہ بھاگنا شروع کر دیا۔

بھاگتے ہوئے ہمارے شمال میں بحیرۂ قلزم تھا اور جنوب میں جرمن۔ قلزم سے تو ہمیں ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن جرمنوں سے ہمارا بہت سا مفاد وابستہ تھا؛ چنانچہ ہماری آنکھیں اُن کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ دفعتہً جنوب میں ہمیں روشنی نظر آئی اور ہماری دُنیا تاریک ہو گئی کیونکہ یہ روشنی اُن گولوں کی تھی جنہیں جرمن دستے فضا میں بلند کرتے ہوئے ہماری پسپائی کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

ہم نے اپنی رفتار تیز تر کر دی۔ تیزی میں آ کر ہمارا ایک ٹرک صراطِ مستقیم سے بھٹک کر ریت میں پھنس گیا۔ ہمیں گمراہ ٹرک کو راہِ راست پر لانے کی فرصت نہ تھی۔ اسے وہیں رہنے دیا اور سواریوں کو دُوسری گاڑی میں بٹھا کر فرار جاری رکھا اور آخر دُشمن کے پنجوں سے اپنوں کے حساب سے بچ نکلے۔

اب بریگیڈ ہیڈ کوارٹر نے تو فلاح پا لی تھی، لیکن خود بریگیڈ کا کیا حشر ہونے والا تھا؟ اور وہ محض چند ہلکی پھلکی گاڑیوں کا کارواں نہ تھا، بلکہ سینکڑوں بھاری بھر کم لاریوں کا کارواں تھا جو تین ہزار جوان اور قیمتی اسلحہ لے کر تنگ صحرائی سڑک پر رینگتا رینگتا چلا آ رہا تھا اور جس کے استقبال کو جرمن توپیں دہانے کھولے کھڑی تھیں ـــــ دِل ہزار وسوسوں کی آماجگاہ تھا۔

"یا اللہ! ہمارے ساتھیوں کا کیا بنے گا؟ کھلی لاریوں میں بیٹھے وہ کوئی مدافعت بھی تو نہ کر سکیں گے۔ کیا وہ سارے موت کے مُنہ میں آ رہے ہیں؟"

ہم رات بھر جاگتے اور بھاگتے رہے۔ کوئی تین بجے شب کا عمل تھا کہ اچانک ہمیں سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے قریب اوٹ میں آگ جل رہی تھی جس پر

چائے کی کیتلی رکھی تھی اُور تین چار جوان آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ ہم نے گاڑی ٹھہرالی انجن کا شور بند ہُوا تو اچانک ماہیے کی ایک سُریلی آواز کان میں پڑی :

"پنڈیوں آئی لاری، یں تینوں ہوڑ رہیاں، پردیس نہ لائیں یاری"

جس پردیس اور جس برگیڈ میں ہم تھے اُس میں یاری لگانے کے امکانات تو ایسے روشن نہ تھے، لیکن ماہیے کی آواز سُن کر دلِ حزیں نے پہلو بدلا۔ یوں محسوس ہُوا جیسے چکوال آنکلے ہوں۔ اِن جوانوں کی بے پناہ SENSE OF HUMOUR (حسِ ظرافت) پر تعجب ہُوا کہ جہاں دُوسرے لوگ جان بچانے کے لیے اندھا دُھند بھاگ رہے ہیں، یہ مَن چلے پردیس کی یاری کے گیت گا رہے ہیں۔ ہمیں رُکتا دیکھ کر ایک جوان آگے بڑھا اور بولا :

"صاحب چائے پیو گے ؟"

ہم رات بھر کے بھُوکے پیاسے بھاگ رہے تھے اور پھر اس پیار سے پیش کی ہُوئی چائے سے اِنکار کس کافر کو ہوتا ؟ ایک پیالی پی تو شکست کا غم کم ہو گیا چلتے ہُوئے خالص دھنی ○ کے لہجے میں خدا حافظ کہا تو آواز آئی کہ صاحب تو گرائیں ⊖ معلوم ہوتا ہے۔ جی تو چاہا کہ دو گھڑی اِن دو عالم سے بیگانہ بہادروں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں لیکن کارِ واں کے آداب مانع تھے۔

صُبحدم سلوم پہنچے اور بے تابی سے اپنے ساتھیوں کی آمد کا اِنتظار کرنے لگے۔ ادھر مَیس کے عملے نے فوراً بارگاہ کھڑی کی۔ یعنی مَیس کے خیمے نصب کیے اور میز پر ناشتہ چُنا۔ برگیڈ کمانڈر صاحب مع دُوسرے افسروں کے کھانے پر آ بیٹھے۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو ارشاد ہُوا کہ "دیکھو، برگیڈ کے باقی یُونٹ آنے ہی والے ہیں۔ تم جلد جلد ناشتہ کر لو اور اِن یُونٹوں کے

○ چکوال اُور اِس کے ارد گرد کا علاقہ دھنی کہلاتا ہے۔

⊖ ایک ہی گاؤں کے رہنے والے۔

آنے سے پہلے ہی اِن کی لائنوں تک ٹیلی فون لگوانے کا انتظام کرو، تاکہ فی الفور سلسلۂ مواصلات شروع ہو سکے، اور مجھے نقشے پر ان یونٹوں کی جائے قیام دکھائی۔

مَیں نے چائے کی پیالی پی اور جلد جلد ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں گیا کہ پندرہ بیس میل تار حاصل کروں۔ ہمارے اپنے بریگیڈ کے تار تو سیدی رزیغ کی گھاٹیوں میں ہی بکھرے رہ گئے تھے۔ عام فوجی مشقوں میں کوچ سے پہلے تار لپیٹ لیا جاتا ہے کہ دوبارہ استعمال ہو سکے، لیکن گزشتہ شب کے کوچ میں ہم بمشکل اپنے آپ کو لپیٹ سکے تھے اور ہمارے ٹیلی فونوں اور تاروں نے ہر چند کہ لمبے ہاتھ کرکے فریاد کی تھی کہ ہمیں بھی ساتھ لیتے جائیے، لیکن ہم مُڑ کر ان پر حسرت کی نگاہ بھی نہ ڈال سکے تھے کہ ہمارا کوچ سراسر رضاکارانہ نہ تھا، اس میں جرمنوں کی طرف سے کچھ شائبہ جبر بھی تھا۔

ڈویژنل ہیڈ کوارٹر سے تار مانگا تو جواب مِلا:

"کیا کرو گے تار کو؟"

عرض کیا: "پیچھے سے تین بٹالین اور توپ خانہ آ رہے ہیں۔ ان کے اور بریگیڈ کے درمیان ٹیلیفون لگانا ہے؟"

ارشاد ہُوا: "تم نے خبر نہیں سُنی؟"

اندازِ سوال سے ظاہر تھا کہ خبر اچھی نہیں۔ تفصیل پُوچھنے کی ہمت نہ پڑی کہ خدا جانے ہمارے ساتھیوں پر کیا گزری تھی۔ بیم و رجا کے عالم میں اس کا منہ تکنے لگا۔ میری دماغی کیفیت غالب کے قیدی پرندے سے مختلف نہ تھی جس نے نوگرفتار ساتھی سے رودادِ چمن پُوچھتے ہُوئے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دی تھی کہ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو۔

اور جب رودادِ چمن سُنی تو معلوم ہُوا کہ سچ مُچ یہ بجلی اپنے آشیاں پر ہی گری تھی تفصیل سُن کر سکتے میں آگیا۔ ہُوا یہ تھا کہ ہمارے بچ نکلنے کے بعد دشمن نے سڑک پر ایک روڈ بلاک لگا

لیا اور تمام تر اسلحہ سے لیس ہو کر ہمارے بریگیڈ کا انتظار کرنے لگا اور جونہی ہمارے لاری سوار جوان قریب آئے۔ کم بخت نے گزوں کے فاصلہ سے اُن پر گولہ اور بارود کی بارش کر دی۔ بیشمار سپاہی لاریوں کے اندر مارے گئے۔ جو نیچے اُترے وہ وہیں ڈھیر کر دیے گئے۔ فرداً فرداً یہاں بھی ہمارے جوانوں نے بہادری کا ثبوت دیا۔ ایک جوان کو ٹامی گن سے جرمن ٹینک پر حملہ کرتے دیکھا گیا۔ کئی ایک سنگینیں تان کر جرمن مشین گنوں پر پل پڑے، لیکن یہ جوش دُشمن کو مارنے کے لیے نہیں تھا، صرف عزت سے مرنے کے لیے تھا۔ تقریباً نصف سے زیادہ بریگیڈ تباہ ہو گیا۔ سینکڑوں جوان مارے گئے یا قید کر لیے گئے۔

اِس شکست کا بدلہ آخر ہمارے چوتھے ڈویژن نے لیا جس نے آٹھویں فوج کی یلغار میں جنرل منٹگمری کی قیادت میں حصّہ لیا ـــــــ لیکن جنگ کی درشتی کا صحیح احساس فتح میں نہیں شکست میں ہوتا ہے اور ہمارا جنگ کا پہلا تجربہ ایک مکمّل شکست اور طویل پسپائی تھی جو فوجی نقطۂ نگاہ سے ایک ناقابلِ فراموش اور قیمتی سبق تھا۔

میں نہ اچھّا ہُوا، بُرا نہ ہُوا

۱۲

پلسپائی بسوئے ملینا کیمپ

اب سلوم میں ٹھہرنا بے معنی تھا۔ جنرل ہیڈ کوارٹر قاہرہ سے حکم آیا کہ چار پانچ روز میں برگیڈ کے پس ماندگان اکٹھے ہو لیں تو نہر سویز کے قریب ایک بیس کیمپ (BASE CAMP) میں بھیجے جائیں اور وہاں اُنہیں توڑ پھوڑ کر اور مزید کمک شامل کر کے ایک نیا برگیڈ کھڑا کیا جائے۔ خود ہمیں تو توڑنے پھوڑنے کی حاجت نہ تھی کہ ہم پہلے ہی خاصے کوبیدہ و مالیدہ تھے۔ سیدی رزیغ کے دنوں میں جرمن حملے کے ساتھ خود ہمارے گلے نے بھی بغاوت کر دی تھی۔ گلے کی تکلیف خاصی تھی لیکن صرف ٹانسلائیٹس ہی تھا جو جرمنائیٹس کے مقابلے میں گدگدی معلوم ہوتا تھا۔ اب جرمنوں سے تو سلوم میں امان مل گئی تھی، لیکن اپنے گلے سے گلو خلاصی کے لیے ہسپتال درکار تھا۔ ہر چند کہ ہمارے برگیڈ میں ایک فیلڈ ایمبولینس اور اُس کے ڈاکٹر بھی تھے جو ہمارے قریب ہی خیمہ زن تھے اور میں اوّلین فرصت میں اُن کے پاس گیا بھی، لیکن دیکھا تو ڈاکٹر لوگ سیدی رزیغ کی شکست کے بعد اپنے جگر کے چاک ہی رفو نہ کر پائے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اُن کی حالت دیکھ کر یہ خاکسار اپنے گلے کا دُکھ بھول گیا۔

ہُوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وُہ ہم سے بھی زیادہ کُشتۂ تیغِ ستم نکلے!

ہمارے گلے کے علاج کے لیے قریب ترین ہسپتال البصیلی تھا جو اسکندریہ کی بغل میں بحیرہ رُوم کے کنارے واقع تھا یعنی کوئی تین سو میل پیچھے مشرق کو؛ چنانچہ ہمیں حکم ملا کہ جس قدر جلد ہو سکے البصیلی کے ہسپتال میں پہنچو۔

اب سلوم اور البصیلی کے درمیان کوئی بس تو چلتی نہ تھی کہ ٹکٹ لے کر بیٹھ جاتا۔ جنگ میں مقام الف سے مقام ب تک جانے کا ایک ہی ذریعہ تھا یعنی HITCH-HIKE ○ اپنا مختصر سا اثاثہ لے کر جو ایک فوجی تھیلے پر مشتمل تھا، سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور مشرق کی طرف جاتے ہوئے پہلے ٹرک کو ہاتھ دیا۔ یہ صحرائی جنگ کے آداب میں سے تھا کہ کوئی سپاہی سواری کا محتاج ہو تو اُسے شناخت کے بعد بلا تامل جگہ دی جائے۔ ہم نے ڈرائیور کو اپنا شناختی کارڈ دکھایا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ٹرک کو صرف مرسیٰ مطروح تک ہی جانا تھا۔ اِس مشہور صحرائی چھاؤنی میں پہنچے تو دیکھ کر حیرت بلکہ عبرت آنے لگی شکست واقعی نامُراد شے ہے۔ مرسیٰ مطروح ہم نے جاتی مرتبہ بھی دیکھا تھا۔ کیا چہل پہل تھی؛ وہ آباد یُونٹ، وہ شاداب میس، وہ آسُودہ چہرے اور وہ بیہودہ گپیں۔ مرسیٰ مطروح زمانۂ اَمن میں ایک اطالوی چھاؤنی تھی، قد کے لحاظ سے چھوٹی سی، مگر آسائشیں بڑی بڑی میسّر تھیں۔ اطالوی افسروں اور سپاہیوں کے متعلق مشہور تھا کہ جنگ کے علاوہ ہر فن میں ماہر ہوتے ہیں۔ اُن کے دیگر کمالات کی پڑتال کا تو ہمارے پاس وقت نہ تھا لیکن فنِ تعمیر میں اُنہیں واقعی یکتا پایا۔ کم بختوں نے صحرا کو بہشت میں بدل دیا تھا۔ مرسیٰ مطروح کو تو جانے دیں کہ زمانۂ اَمن کی پیداوار تھا۔ عین جنگ اور عین صحرا میں بھی یہ خوش مذاق اطالوی اپنے مورچے اِس نفاست سے کھودتے تھے گویا تاج محل تعمیر کر

○ اِس انگریزی ترکیب کا غالباً کوئی ترجمہ نہیں۔ اگر آپ نے انگریزی نہیں پڑھی تو کوئی ہرج نہیں۔ پڑھتے جائیے معنی سمجھ میں آ جائیں گے۔

رہے ہوں اور اطالوی افسروں کے لوازماتِ زندگی کے پیشِ نظر شاید محلّات کی ضرورت بھی تھی۔ یہ پچھلے سال ہی کی تو بات تھی کہ جب ہمارے جوانوں نے اطالوی مورچوں کو جا دبوچا تو اندر سے جہاں ہر اطالوی افسر ہاتھ بلند کیے باہر نکلا وہاں ساتھ ہی ایک جوان لڑکی بھی ہاتھ کمر پر رکھّے برآمد ہوئی۔ غنیمت کے اِس مالِ لطیف نے شروع میں تو کچھ عجیب مسائل پیدا کر دیے کہ ہماری فیلڈ ٹُک میں اِس موضوع پر کوئی ہدایات نہ تھیں، لیکن جلد ہی ہمارے کمانڈر کے حُسنِ مذاق نے اِس کا واحد تسلّی بخش حل ڈھونڈ نکالا۔

ذکر مرسیٰ مطروح کی بے رونقی کا تھا۔ صِرف چند ہفتے پہلے مطروح کا ہر گوشہ کفِ گُل فروش تھا، مگر اَب کہ ہر لحظہ رومل کے حملے کا ڈر تھا، اِس کے گلی کوچوں میں ہر چند قدم پر خاردار تار کے دیو قامت گولے لُڑھکا دیے گئے تھے جن سے دَست و پا ہی نہیں، دیدہ و دِل بھی مجروح ہوتے تھے۔ پسپائی کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور جنگ میں پسپائی سے زیادہ یاس انگیز کوئی چیز نہیں ہوتی۔ محافظینِ مطروح بے حد مضمحل نظر آتے تھے۔ ایسے ماحول میں رات کو میٹھی نیند یا سہانے خوابوں کی توقع بیکار تھی؛ چنانچہ جُوں توں کر کے مرسیٰ مطروح میں ایک افسردہ سی رات گزاری۔ دُوسرے دن علی الصبح بستر باندھا اور اِس حسرت کدے سے نکل کر لاریوں کے رہگذر پر آبیٹھے اور کافی دیر بیٹھے رہے۔ اٹھائے جانے کا تو خوف نہ تھا کہ کوسوں تک نہ دیر تھا نہ حرم، نہ دَر تھا نہ آستاں، بالآخر مغرب سے ایک گاڑی نمودار ہُوئی۔ اس کی منزل العالمین تھی۔ اِسی میں بیٹھ گئے اور العالمین پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔

العالمین میں صِرف ایک یُونٹ تھا اور وہ بھی چھوٹا سا۔ رات اِن کے ساتھ بسر کی۔ اُن دنوں العالمین ایک غیر معروف سا مقام تھا اور ابھی یہ بات اِس سنسان سے قریہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ صِرف چند ہی ماہ بعد منٹگمری اور رومل اِسے تاریخ کے صفحات میں دَوام بخش دیں گے۔ بہر حال ہم نے العالمین کی رہائش کا تاریخی فخر العالمین کے زمانہ ماقبل

تاریخ میں ہی حاصل کر لیا۔

دُوسرے دن علی الصبح اسکندریہ جاتے ہُوئے ایک اور فوجی ٹرک مل گیا اور شام کو ہمیں تصیلی کے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگلے روز فی الفور ہمارے گلے کا آپریشن کر دیا جائے گا، لیکن ڈاکٹر صاحب نے دیکھا تو گلے میں ذرا سا پینٹ لگا دیا اور فرمایا کہ ہفتہ بھر غرارے کرو اور اُسی دن ڈسچارج کر کے قاہرہ ری انفورسمنٹ کیمپ میں بھیج دیا ـــــ ڈاکٹر صاحب نے زبان سے تو نہ کہا، لیکن اُن کا مطلب واضح تھا کہ جنگ جاری ہے۔ محض گلے کی خرابی سے تیمارداری کی عیاشی نہیں کرائی جا سکتی۔ ابھی جنگ لڑو۔ بچ گئے تو گلے کا علاج ہوتا رہے گا اور کام آگئے تو فرشتے تمہارے لیے بہشت یا دوزخ کا فیصلہ گلا دیکھ کر نہیں کریں گے۔ قصہ کوتاہ دُوسرے روز ہم قاہرہ کے قریب ری انفورسمنٹ کیمپ میں پہنچ گئے۔ سرکاری مقصد یہ تھا کہ ایک ہفتے کے آرام کے بعد ہمیں حسبِ ضرورت جنگی اِستعمال میں لایا جائے۔

قاہرہ کا یہ مشہور ری انفورسمنٹ کیمپ مینا کیمپ کے نام سے مشہور تھا، کیونکہ اسی نام کے علاقے میں قاہرہ شہر سے کوئی دس میل دُور اہرامِ مصر کے سائے میں واقع تھا۔ کیمپ میں پہنچے تو اُس کے حسنِ اِنتظام کا فوری احساس ہُوا۔ گاڑی سے اُترنا تھا کہ ایک صوبیدار صاحب مع چند سپاہیوں کے اِستقبال کو بڑھے۔ فی الفور ہمارا سامان خیمے میں پہنچایا گیا اور خود ہماری وہاں تک رہنمائی کی گئی۔ خیمے کے دروازے پر ایک سیاہ فام مگر صاف سُتھرا ادھیڑ عمر کا متبسم سپاہی کھڑا تھا۔ بولا:

"مَیں سپاہی بابُو رام ہوں، آپ کا اردلی۔"

خیمے کے دروازے سے بابو رام کا ظہور اِس قدر اچانک ہُوا تھا، جیسے الٰہ دین نے چراغ رگڑا ہو اور دُھوئیں سے ایک لاغر سا جن نمودار ہُوا ہو۔ بابو رام نے ایک خاص اردلیانہ ادا سے

چق اٹھائی اور ہم خیمے میں داخل ہوئے۔

کیا ستھرا اور کشادہ خیمہ تھا! درمیان میں پلنگ، اِدھر لکھنے کی میز اور کرسی اُس طرف ڈریسنگ ٹیبل اور کپڑوں کی الماری۔ خیمے کے سامنے کی دیوار میں دروازہ تھا۔ پردہ اٹھایا تو ایک دوسرے مگر چھوٹے سے خیمے میں کھلا۔ اندر کی چیزیں دیکھیں تو محسوس ہوا خواب دیکھ رہا ہوں۔ تین بالٹیاں بظاہر پانی سے بھری پڑی تھیں۔ سہمے سہمے ہاتھ لگایا تو سچ مچ پانی تھا۔ صحرا کی جنگ کے بعد ہمیں چلّو بھر سے زیادہ پانی یکجا دیکھنے کی توقع نہ تھی۔ اب نہ صرف بالٹیوں پانی موجود تھا، بلکہ اِس کے استعمال پر اختیار بھی تھا۔ بے اختیار اپنی خوش نصیبی پر کسی واضح ڈھنگ سے ناز کرنے کو جی چاہا۔ مثلاً ایک والہانہ رقص سے؛ جیسے ہٹلر نے فتح فرانس کی خبر ملنے پر کیا تھا، مگر پیچھے اردلی دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے رقص کرنے میں اپنے عُہدے کی سطوت مانع آئی: (ہٹلر عُہدے کے لحاظ سے ہم سے بہت جونیئر تھا۔ وہ کارپورل، ہم نیم لفٹین!) لہٰذا ناچ سے تو گریز کیا، لیکن آناً فاناً کپڑے اُتارے اور ایک انتہائی سُرور انگیز غسل سے دادِ عیش دی۔ بعد کی زندگی میں اِس سے زیادہ مکلّف غسل بھی کیے، مگر وہ سُرور نہ حاصل ہو سکا کیونکہ پھر کبھی مہینہ بھر باتیمّم زندگی بسر کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

غسل ہو چکا تو اردلی ایک صاف ستھری ٹرے میں چائے رکھ کر لایا۔ ساتھ بسکٹ اور سیب بھی۔ یعنی یہ سب تکلّف اُس شخص کے لیے ہو رہا تھا جو کل تک بُلی بیف بشمول ریگِ صحرا پر گزارا کرتا تھا۔ اپنی خوش بختی پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ کہیں کسی کلرک کی غلطی سے ہمارا نام نیم لفٹینوں کی بجائے جرنیلوں کے خانے میں تو نہیں لکھا گیا تھا؟ بہرحال ایسی غلطی اگر کہیں ہوئی بھی تھی تو اُس کا پکڑنا کسی جرنیل کا کام تھا۔ بالفعل ہمارا کام اِس چائے کو پینا تھا، دھیرے دھیرے پینا تھا اور جی بھر کر پینا تھا۔

چائے کے دوران اردلی سے مزید تعارف ہوا۔ معلوم ہوا مدراس کا رہنے والا ہے

ہماری طرح جنگ کی ابتدا میں بھرتی ہُوا اور اپنے کمالات کے مظاہرے کے لیے کیٹرنگ کور کا انتخاب کیا یعنی فوجی میسوں اور لنگر خانوں میں خدمت کرنے لگا۔ شکل و صُورت سے بابُورام پیدائشی خدمتگار نظر آتا تھا۔ اس کے اَردلی پن میں گویا مشیتِ ایزدی جھلک رہی تھی۔ کارِ خدمت میں وفورِ شوق اور محنتِ شاقہ میں خندہ پیشانی، یہ مشیت ہی کا توفیض تھا۔

بابورام نے ہمیں پہلی مُلاقات پر ہی رام کر لیا۔ باتوں باتوں میں بولا:

"صاحب، شام کو کیا کھائیں گے؟"

اَب کھانے کے مُعاملے میں میسوں میں رہنے والوں پر مختاری محض تہمت ہے جو خداوندانِ میس چاہتے ہیں، سو کرتے ہیں۔ ہم نے کہا:

"بابُورام، جو میس میں پکے گا، کھانا پڑے گا اور کھائیں گے۔ ہماری پسند کیا معنی؟"

بولا: "اگر اجازت ہو تو آپ کے لیے علیحدہ مدراسی دال پکا لاؤں؟"

اَب مجھے بابُورام کی دال کھانے کا ایسا شوق نہ تھا، اس لیے نہیں کہ ایک ہندو کے پکے ہُوئے کھانے سے میرے اسلام کو کچھ خطرہ تھا۔ آفیسرز میس میں کوئی مُلازم رنگ یا مذہب کے اعتبار سے اچھُوت نہ تھا۔ مجھے اعتراض تھا تو دال پر۔ کیونکہ دال سے میرا اسلام واقعی خطرے میں تھا۔ مجھے ہمیشہ خدشہ رہا ہے کہ اگر مسلسل دال کھائی جائے تو مسلمانی زائل ہو جاتی ہے۔ بہرحال بابُورام کی دِل شکنی منظُور نہ تھی۔ کہا: "پکاؤ دال۔"

بابُورام نے کہا: "شام کا کھانا میس کی بجائے خیمے ہی میں کھائیے گا۔"

یہ مزید حیاشی تھی۔ دعوت قبول کی اور ایک آسُودگی اور فراغت کے احساس سے خیمے سے باہر نکلے کہ تھوڑی سی مینا کیمپ کی سَیر ہی کر لیں۔

بصرے والے شائبہ کیمپ کی طرح مینا کیمپ بھی ایک شہر تھا جس کے مختلف حصّے تھے۔ برطانوی وِنگ، ہندوستانی وِنگ، پلٹن کا محلّہ، توپخانے کا محلّہ وغیرہ وغیرہ کیمپ میں

ہندوستانی افسروں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ اُن سے ملاقات ہُوئی تو گفتگو قاہرہ اور اس کی دلچسپیوں کے گرد ہی گھومتی رہی سب دیکھو فدائے قاہرہ۔ کوئی گراپی کا دِلدادہ۔ کوئی بادیہ کا شیدائی، کسی پر کانٹی نینٹل کا جادو اور کوئی شیپرڈ کا پرستار۔ اِن جگہوں کی رنگینیوں کے قصّے کچھ اِس اشتعال انگیز انداز میں سُنائے گئے کہ اسی ساعت قاہرہ کی سمت ہوا ہو جانے کو جی چاہا۔ اور قاہرہ کوئی دُور بھی نہ تھا، یہی دس بارہ میل۔ سڑک پر کھڑے ہو جاتے تو کوئی گاڑی یا ٹیکسی قاہرہ جاتی ہُوئی مِل ہی جاتی۔ مگر یہ کہ کیمپ کے کمان افسر سے رخصت لینا لازم تھا اور ہم نے ابھی بمشکل اپنی آمد کی رپورٹ دی تھی۔ سو قاہرہ جانا کسی دُوسرے وقت پر اُٹھا رکھا۔

کیمپ دیکھتے دیکھتے شام ہوگئی۔ اپنے خیمے کو لَوٹے۔ اندر داخل ہونے کے لیے چق اُٹھانا چاہی تو وہ خود بخود اُٹھ گئی۔ دیکھا تو چق کے پردے میں بابُورام بول رہا تھا۔ اندر داخل ہُوئے تو خیمہ جگمگا رہا تھا۔ بابُورام نے سرکاری بلب کے علاوہ ایک غیر سرکاری بلب بھی لگا دیا تھا اور ہماری غیر حاضری میں ایک چھوٹا سا قالین بھی پیدا کر لیا تھا، میز پر ایک گلدستہ سجا دیا تھا اور ساتھ تپائی پر مشروبات کی بوتلیں اور بلور کے جام چن دیے تھے۔ ایسا بندوبست ہم نے پشاور چھاؤنی میں بھی کم دیکھا تھا ——— ہماری دشت پیمائی کا صلہ دینے کے لیے سچ مُچ کوئی فراخ دِل بلکہ فضول خرچ فرشتہ مقرّر ہُوا تھا۔ پھر دفعتہً بابُورام نے جیسے ہمارے دِل کے اندر جھانک لیا ہو۔ آگے بڑھ کر وُہی مشروب تیار کیا جو ہمارے دل میں تھا اور ہم ایک پختہ اور خرانٹ جرنیل کی طرح اُسے جرعہ جرعہ پینے لگے۔ بابُورام اِس خاموشی سے غائب ہُوا کہ ہمیں احساس تک نہ ہونے دیا۔

کوئی آٹھ بجے کا وقت ہوگا کہ بابُورام خیمے میں داخل ہُوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک قاب تھی۔ ہمارے سامنے رکھ کر اُوپر سے پردہ سرکایا، تو مانوس انگریزی کھانے کے پہلو بہ پہلو ایک سبز مرچوں میں ملبوس پلیٹ نظر آئی ——— یعنی بابُورام کی تخلیق مدّاسی

دال، لیکن گہری سبز اور تلخ مرچوں کی دید سے ہمیں یُوں محسوس ہُوا جیسے بجلی کا تار چھُولیا ہو۔ بابُو رام ہماری سراسیمگی دیکھ کر بولا:

"دال مرچوں کے نیچے ہے۔ آپ صِرف دال بھی کھا سکتے ہیں، لیکن مرچوں کا بھی ساتھ رہے تو دو آتشہ ہو جائے گی۔"

دل سے مشورہ کیا تو معلوم ہُوا کہ یک آتشہ پر ہی اکتفا کرنا قرینِ مصلحت ہے؛ چنانچہ مرچوں سے قطع نظر کر کے بابُو رام کی دال سے بسم اللہ کی۔ پہلے لُقمے کے ساتھ ہی ہمارے اندر زندگی نے کروٹ لی۔ بخدا یہ دال مُونگ نہ تھی، دالِ حیات تھی۔ اُس شب ہم نے انگریزی کھانے پر ہر چند کہ توجہ دی، کم دی، اور اس کے بعد جتنے دن مینا کیمپ میں رہے، بابُو رام کی دال سے محروم رہنا گناہ سمجھا۔ جہاں تک ہماری مسلمانی کا تعلق تھا، اس میں ایک نئی تازگی اور تابندگی محسوس ہونے لگی۔ اور وہ جو مشتاق احمد یُوسفی نے کہا ہے کہ دو چار دن مُونگ کی دال کھاؤں تو اُردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشہ تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے، کسی اور دال کی بات ہو گی۔ ورنہ اگر اُن کا رُوئے سخن بابُو رام کی دال کی طرف ہے تو یہ بہتان ہے۔ اگر جناب یُوسفی مینا کیمپ میں میرے ہم نوالہ ہوتے تو آج چراغ تلے لکھنے کے علاوہ صاحبِ دیوان بھی ہوتے اور بنک کی بجائے کسی برگیڈ کی کمان کر رہے ہوتے۔

۱۳

قاہرہ ایّامِ جنگ میں

دُوسری صبح ایک گہری، میٹھی اور لمبی نیند سے بیدار ہوئے اور عین اُسی لمحہ بابُورام چائے کی صبُوحی لے کر خیمے میں داخل ہُوا۔ بیداری اور چائے بیک وقت کیونکر ظہور میں آئیں، میرے فہم سے بعید تھا۔ اِن اسرار کو بابُورام جیسا دانائے راز ہی کھول سکتا تھا، لیکن میں یہ راز کُرید کر بابُورام کی الہامی بیراگیری کا انداز نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر تازہ وردی پہن کر کیمپ کے دفتر میں گیا۔ ایڈجوٹنٹ صاحب کو حاضری دی۔ کمان افسر صاحب سے مختصر اور خوشگوار سی مُلاقات ہوئی یعنی ہمیں بتایا گیا کہ ہفتہ بھر کے لیے ہر قسم کی ڈیوٹی معاف ہے اور یہ کہ ہفتہ بھر ہم اپنے ساتھ جو سلوک چاہیں کر سکتے ہیں۔ یعنی چاہیں تو تصوّرِ جاناں میں دن بھر لیٹے رہیں اور چاہیں تو تلاشِ جاناں میں اہرامِ مصر پر چڑھ دَوڑیں ــــــ یہ دُوسری حرکت ہم نے کی بھی، لیکن کافی عرصہ بعد میں ــ سرِ دست ہمارے دل میں قاہرہ بستا تھا۔ ایک دو دیسی افسر اُدھر جا رہے تھے، ان کے ہمرکاب ہو لیے۔

مینا کیمپ سے نکلتے ہی کار ایک کشادہ، بلند اور دلکش سی شاہراہ پر آ نکلی۔ یہ مینا روڈ تھی جو اہرام اور قاہرہ کے درمیان شمالاً جنوباً واقع ہے۔ اِس کی دس میل کی لمبائی میں تو دونوں

طرف متموّل پاشاؤں کے وِلا (VILLAS) تھے جو باغوں کے لامتناہی سلسلے میں واقع تھے۔ وِلاؤں اور پاشاؤں کے باطن کے حالات تو خُدا ہی جانے ـــــ اور خُدا کے لیے یہاں جاننے کو بہت کُچھ تھا ـــــ لیکن ان کا بیرونی منظر بے حد جاذب تھا۔ قاہرہ کی تمہید واقعی حسبِ توقّع تھی۔

آگے چل کر دریائے نیل کا پُل عبور کیا تو گویا قاہرہ کے دروازے پر دستک دی! اِدھر قاہرہ نے زندگی سے بھرپُور جواب دیا۔ عورتوں اور مَردوں سے بھرے ہُوئے بازار۔ مَرد اکثر فوجی باوردی اور غیر مُلکی، لیکن ذرا کھوئے کھوئے سے۔ گو یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ کس چیز کی تلاش میں ہیں۔ عورتیں اکثر مصری' اندازِ لباس اور آرائش گیسو میں بے حد مغرب زدہ مگر ایک خاصی تعداد دُخترانِ مغرب کی بھی تھی جو خاکی وردیوں میں سینہ تان کر مصر کے بازاروں میں اکٹو سروس بجا لا رہی تھیں۔ مجموعی طور پر زنانہ اور مردانہ فوجیوں کی اِس قدر کثرت تھی گویا اصل جنگ صحرائے لیبیا میں نہیں، قاہرہ کے بازاروں میں لڑی جا رہی ہے۔ اور فوجی بھی ہر مُلک کے۔ ہندی۔ برطانوی۔ آسٹریلوی۔ کناڈوی۔ نیوزی لینڈوی۔ یُونانی۔ افریقی۔ فرانسیسی۔ پولستانی۔ الغرض ہٹلر کے تمام ستم رسیدہ مصر میں آجمع ہُوئے تھے اور ہر طرف سے ہائے گل اور ہائے دل کی صدائیں اُٹھ رہی تھیں۔

قاہرہ کی دُکانیں جنگ کے باوُجود جُملہ سامانِ عشرت سے آراستہ تھیں۔ ریستورانوں اور تفریح گاہوں میں وہ ہجومِ خلق کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ بلکہ بعض خواتین و حضرات نے تو گویا اپنے شانوں کا صحیح استعمال ہی یہاں آکر سیکھا تھا۔ قاہرہ میں جنگ کی فقط دو علامات تھیں۔ ایک بڑی دکانوں کے سامنے ریت کی بوریوں کے پُشتے کہ بمباری میں سپر ثابت ہوں اور دُوسرے بلیک آؤٹ یعنی سرِ شام ہی رُوشنیوں کو گُل کر دینا یا مدّھم رکھنا کہ دُشمن کے ہوائی جہازوں سے قاہرہ کا پردہ رہے۔ لیکن علامتِ جنگ بہرحال علامت ہے، جنگ نہیں؛

اور ادھر بے شمار ایسے فوجی تھے جو قاہرہ میں محض بزمِ یک شب مناکر سچ مچ صبح محاذِ جنگ کو جارہے تھے اور اس ایک رات کی مختصر سی فرصت میں زندگی کی تمام تر آسودگیاں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اور انہی کی خاطر قاہرہ نے قارون کی طرح گویا راستے میں خزانہ لُٹا رکھا تھا۔ جدھر دیکھو، مہ رُخوں اور زُہرہ وشوں کے پَرے، جو نہ صرف تعداد بلکہ شوق میں بھی مسافر فوجیوں سے ایک قدم آگے۔ اوّل تو سرِراہ ہی نظریں لڑجاتیں، ورنہ کسی رقص گاہ کا ٹکٹ لے کر فقط داخل ہونے کی ضرورت تھی اور پھر بقولِ اکبر:

یاں جوانی کی اُمنگ اور اُن کو عاشق کی تلاش

ہمیں اپنے مُلک میں یہ کیفیت ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے۔ ذرا اُن ملکوں سے پُوچھیں جو جنگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ اخلاق اور عصمت جنگ کے اوّلین شکار ہوتے ہیں اور کسی کو بُرائی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

ہمارے ساتھی کہ راہ و رسمِ منزل سے بے خبر نہ تھے، گراپی میں داخل ہوئے —— گراپی شارع سلیمان پاشا کی مشہور رقص گاہ تھی —— اندر قدم رکھا تو یُوں محسوس ہُوا گویا بُت کدے کا دَر کُھلا۔ گراپی کے کشادہ در و دالان میں سینکڑوں مَرد اور عورتیں مصروفِ اختلاط تھے۔ دفعتہً بینڈ پر ایک نئی دُھن کی ابتداء ہوئی اور مَرد التجائے رُقص لے کر اپنی پسند کی خواتین کے آگے جا جُھکے۔ ہم نے یہ التجائیں رَد ہوتی بھی دیکھیں، لیکن اکثر نے شرفِ قبولیت حاصل کیا۔ بلکہ کئی خواتین تو اِس بیتابی سے طالبانِ رقص کو تاڑ رہی ہوتی تھیں کہ اِلتجا ابھی ان کے لبوں تک پہنچی ہی نہیں اور اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید! —— یہ لازم نہ تھا کہ پسند کی خاتون سے پیشگی تعارف بھی ہو۔ مغربی رقص کے آداب نے اجنبی کو بہت کچھ حقوق دے رکھے ہیں؛ چنانچہ تعارف اکثر رقص کے دوران ہی ہوتا اور بارہا ایسا ہُوا کہ رقص کرنے کو اُٹھے تو اجنبی، اور کر کے بیٹھے تو رفیق بلکہ رفیقِ زندگی!

شاید یہ زنانِ مصر کا شیوہ ہے کہ دل دینے میں بہت شتابی کرتی ہیں۔ خصوصاً قبطی اور یہودی۔ اگرچہ مسلمان لڑکیاں بھی ایسی سست مزاج نہ تھیں خصوصاً جہاں معاملہ فوجیوں کے ساتھ ہو۔ آخر اس نیک روایت کی بانی مصر کی خاتونِ اوّل یعنی قلوپطرہ ہی تو تھی لیکن دورِ حاضر کی دوشیزائیں کہیں زیادہ باوفا تھیں۔ گو اتنی ہی زیادہ بودی تھیں۔ اگر پہلی ملاقات پر ہی کسی نے انگوٹھی پہنا دی یا فقط دکھلا ہی دی تو دفورِ شوق سے اُن کے چہرے تمتما اُٹھتے تھے اور جیسے کوئی دیرینہ حسرت پوری ہو گئی ہو، چلّا کر کہنے لگتیں:

"خاتم! خاتم!"

اور پھر کسی رسمی نخرے کے بغیر پیمانِ وفا باندھنا شروع کر دیتیں ـــــ یہ حسینانِ مصر کی سادگی تھی یا پرکاری، خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن جہاں تک عشاق کی نیت کا سوال ہے کچھ ہم بھی جانتے ہیں۔ اِن کشتگانِ محبت میں صرف ایک آدھ ہی سادہ ہوتا تھا، باقی ننانوے فی صد اچھے خاصے پُرکار عاشق تھے۔ کیونکہ بہت کم افسر ایسے تھے جو قاہرہ کا رُخ کرتے وقت جیب میں دس بارہ انگشتریاں نہ ڈال لیتے!

لیکن گراپی کی پہلی شام کا ناقابلِ فراموش واقعہ حسینانِ مصر کی دلنوازی نہ تھی بلکہ ایک عالمِ دین کی زیارت ـــــ گراپی کے بار پر کھڑے تھے اور حسبِ توفیق نرم و درشت مشروبات سے دِل بہلا رہے تھے کہ صدر دروازے سے ایک مولانا داخل ہوئے۔ یُوں جیسے داغ کی غزل کے کوئی شیخ جی اُٹھے ہوں۔ بے حد محتسبانہ حلیہ، متشرع داڑھی اور باوضو چہرہ۔ سر پر سُرخ ترپوش اور سفید عمامہ۔ جسمِ مبارک پر اُجلا اور لمبا جُبّہ۔ بائیں ہاتھ میں تسبیح اور دایاں خالی۔ شاید اِس لیے کہ دُرّہ استعمال کرنا پڑ جائے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے حاضرین سے مسلمانوں کو الگ کر کے کوتوال کے سپرد کر دیں گے کہ مے خانے میں کھڑے پائے گئے، لیکن جناب شیخ بار کے قریب آئے تو ذرا ٹھٹکے۔ تاآنکہ مے فروش سے آنکھیں چار ہوئیں۔

پھر ایک متبرک سی مسکراہٹ آپ کے چہرے پر پھیل گئی اور ایک مقدس آسمانی آواز میں بارمین کو مخاطب کرتے ہوئے بولے :

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" ـــــــــــــ واحد وسکی۔"

بارمین نے تعمیل ارشاد کی اور جام وسکی پیش کیا۔ جناب شیخ نے جام تھاما۔ پہلے اس انداز سے دیکھا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پی رہے ہوں۔ پھر آنکھیں بند کرلیں، جام کو لبوں تک لائے اور پھر جس لطف، جس سکون اور جس حسن سے گھونٹ پینے لگے، کہنہ مشق میگساروں کے دل موہ لیے اور مبتدیوں کو مے نوشی کا حرفِ آخر پڑھادیا۔

اس بات کے اعتراف سے ہمیں باک نہیں کہ اس رات گراپی کی رنگینیوں نے ہمیں مغلوب کرلیا اور جب کہیں پچھلی رات کیمپ میں پہنچ کر بستر پر دراز ہوئے تو گراپی کے ہنگامے خواب میں بھی ہمارے دماغ سے محو نہ ہوسکے۔

رہا خواب میں اُن سے شب بھر وصال
مرے بخت جاگے، مَیں سویا کیا

ہمیں قاہرہ میں آرام کے لیے سات دن ملے تھے۔ یہ آرام ہم نے مسلسل قاہرہ نوردی میں حاصل کیا کہ اس کے بعد ہمیں ہٹلر قاہرہ کی تفریح یا شاید زندگی کی ہی مہلت نہ دے اور قاہرہ میں دیکھنے کو کیا کچھ نہ تھا!

ـــــــــــــ وہ غیر فانی اہرام اور ابوالہول، لیکن اہرام سے زیادہ ہمیں اس ترجمان نے متحیر کیا جو لگاتار ایک گھنٹہ فصیح انگریزی میں تاریخ اہرام پر بولتا رہا اور خود خاک نہ سمجھتا تھا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور ترجمان سے بھی بڑا عجوبہ وہ مصری جوان جو پانچ منٹ میں اِن فلک بوس اہرام کی چوٹیوں کو ہاتھ لگا کر سالم اتر آتا تھا۔

ـــــــــــــ وہ قاہرہ کا کوہ پیکر حصار جو کئی خونیں انقلاب دیکھنے کے بعد اب نمبر ۱۵

انڈین ہاسپٹل میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا اور جس کی بڑی کشش اس کے تاریخی مقامات نہ تھے بلکہ ہسپتال کی بدتمیز اینگلو انڈین نرسیں جو صحت مندوں پر مہربان اور مریضوں پر نامہربان تھیں۔ اور وہ خاص نرس جسے اِس خاکسار نے زخمی گورکھا سپاہیوں کو ڈیم فُول کہتے سُنا، تو بلا اختیار برطرف کر کے ہسپتال سے باہر کیا اور بعد میں خود برطرف ہونے سے بال بال بچا۔

——— وہ قلعہ کی بلندی پر چمکتا ہُوا ہیرا یعنی مسجد محمد علی۔ وہ رنگ و سنگ کا معجزۂ فن جس میں نمازی کم اور سیاح زیادہ آتے تھے۔

——— وہ مشکی بازار۔ وہ تنگ و تاریک سی لکیر جس کی پُراسرار دکانوں کے سامنے جوئندگانِ عجائبات چیونٹیوں کی طرح رینگتے پھرتے تھے۔

——— وہ موم کا عجائب خانہ جس میں داخل ہوتے ہی مرحوم سعد زاغلول پاشا بقیدِ حیات کھڑے نظر آتے تھے۔

——— وہ شپرڈ اور کانٹی نینٹل ہوٹلوں کی ٹیرس جہاں بلیک آؤٹ کے سائے میں گناہوں کے ابتدائی سودے ہوتے تھے اور پھر قاہرہ کی ٹیکسیوں میں سارے شہر کو لپیٹ میں لے لیتے تھے۔

——— وہ جزیرہ ریس کلب کی گھوڑ دوڑیں جہاں پہلے روز ہی ایک گورے کیپٹن اور ایک گورے میجر کی ٹپ پر پُورے چالیس دینار جیت لیے اور بعد میں جب ان افسروں سے تفصیلی تعارف ہُوا تو ایک پرنس علی خان نکلے اور دُوسرے ڈگلس فیربنکس جُونیئر اور جن کے ساتھ چند لمحوں کی ہم نشینی کا حسینانِ قاہرہ پر یہ اثر ہُوا کہ ہمیں بھی اپنے دائرۂ نوازش میں شامل کر لیا۔ شاید اس مقولے کے تحت کہ گندم اگر بہم نرسد بھُس غنیمت است۔ اور خدا گواہ ہے کہ ہم نرے بھُس بھی نہ تھے۔ سیکنڈ لفٹننٹ ہونے کے علاوہ چند اور ٹھوس خوبیوں کے مالک بھی تھے۔

—— وہ نیل کے کنارے ہجن ریستوران جس کی نشستیں گلاب کی جھاڑیوں کی اوٹ میں سجتی تھیں اور سرِ شام ہی بلیک آؤٹ کی وجہ سے عافیت جُو جوڑوں سے پُر ہو جاتی تھیں اور اسی ہجن کی وہ شام جب ہمارے دوست ورما اور ہم پر نزولِ الطاف ہُوا۔ لاریب اس شام نے ہمیں ایک لازوال دولت سے مالا مال کر دیا، مگر خدا را ہم سے اِس دولت کی تفصیل پُوچھنے پر اصرار نہ کیجیے گا کہ اِس دن کے بعد اِس شام کا جب بھی کسی نے ذکر چھیڑا' اک تیر ایسا سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔

—— اور وہ مینا روڈ کی نائٹ کلب آبرژ کہ جس کی کشش وہ مخصوص شکمی رقص نہ تھا، بلکہ اِس رقص و سرود کا سرپرستِ اعلیٰ یعنی شاہ فاروق جو کلب کے شاہ نشین سے اپنے مقربین کے ساتھ دادِ رقص دئیے دیتے اور ہم جیسے ہزاروں پست نشینوں کو شرفِ زیارت اور درسِ عبرت بخشتے کہ شاہِ ملک و دین کا اندازِ داد بجائے خود ایک تماشا تھا یعنی ہر رقص کے بعد آپ رقاصہ کو بُلا کر اپنے پہلو میں بٹھاتے اور دستِ خاص سے اِس غارت گرِ دین و ایمان کو جامِ مے پیش کرتے۔ پھر التفاتِ شاہی مُسکراہٹوں' گدگدیوں' قہقہوں' بغلگیریوں اور کبھی کبھی ہلکے بوسوں میں جلوہ گر ہوتا۔ یہ الف لیلہ کی بادشاہی معلوم ہوتی تھی اور تھی۔

—— وہ جامعۂ ازہر کہ جس کے سقف و دالان ہزار شوق سے دیکھنے گئے اور لَوٹے تو اس کی تاریخی عظمت سے مرعُوب تھے لیکن موجودہ دقیانوسیت سے مایوس۔ جامعہ کے طلباء سے تبادلۂ خیالات ہُوا' تو حضرتِ علامہ کا مصرع یاد آیا۔

اے مسلماں! اپنے دِل سے پُوچھ مُلّا سے نہ پُوچھ

—— وہ قاہرہ کی شکستہ و ریختہ ٹریم کہ جس کی سیٹی اور کنڈکٹر کی بیلئے آج تک کانوں میں گونجتی ہے۔ اور وہ تین الفاظ جو قاہرہ میں ہر قدم پر راستہ کاٹتے تھے:

AUBERGE DES PYRAMIDES

ـــــــــــ وہ ملّی کے مُٹھے بیچنے والوں کی صدا: "رفیق پھلّی" جو وہ لوگ ہمارے پنجابی سپاہیوں کی کشش کے لیے لگاتے اور ہمارے سپاہیوں کی اخوتِ اسلامی کا وہ منظر کہ اپنے مصری دُکانداروں کی ہزاروں "پھلّیاں" سربازار بھون کر اپنا پیٹ اور اُن کی جیبیں بھر دیتے۔ ہمارے سپاہیوں کی اِس خالص اخوّت کا ایک مظاہرہ کبھی نہ بھولے گا۔

جیسا کہ ایک جگہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہندوستانی مُسلمان (یا اب کہنا چاہیے پاکستانی مُسلمان) بہت سادہ ہے۔ عرب ملکوں اور وہاں کے لوگوں سے اِسے والہانہ عشق ہے اور ہر عرب کے متعلق یہی سمجھتا ہے کہ بعد از نبی بزرگ توئی قصّہ مختصر۔ اُسے یہ خوش فہمی بھی ہے کہ عرب بھی ہمیں چچا زاد ہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اکثر عربوں کو ان رشتہ داروں کے وجُود کا ہی علم نہیں

اُن دِنوں قاہرہ میں میلاد النبیؐ کا تہوار بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ خود شاہ فاروق تقریبات میں حصّہ لیتے۔ اُس سال کے یوم میلاد میں ہمارے کیمپ کے مُسلمان جوانوں نے بھی شرکت کرنا چاہی۔ چُونکہ ہمارے سپاہیوں کا مصریوں کے ساتھ اختلاط کا معاملہ تھا، کرنل صاحب نے مجھے خود ساتھ جانے کو کہا کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہونے پائے؛ چنانچہ میں صُوبیدار صاحب اور کوئی پچّاس جوان صاف سُتھری وردیاں پہنے فوجی لاریوں میں بیٹھ کر جلسہ گاہ میں پہنچے۔ شاہ فاروق کے آنے میں ابھی کچھ وقت تھا کہ صُوبیدار صاحب نے میرے کان میں کہا:

"اگر اجازت دیں تو شاہ فاروق کے آنے پر ہم نعرۂ تکبیر بلند کریں؟"

مَیں نے کہا: "آپ کو کیا تکلیف ہو رہی ہے جو آپ ایسی حرکت کرنا چاہتے ہیں؟"

بولے: "خلیفۂ اسلام ہے اور ہمارا دل چاہتا ہے کہ اپنے مُسلمان بادشاہ کے لیے نعرہ لگائیں۔"

مَیں نے کہا: "ہم وردی میں آئے ہُوئے ہیں، ہمیں اِس تقریب میں متانت سے

حصّہ لینا چاہیے۔ یہ موقع نعرہ بازی کا نہیں۔ وطن میں جا کر یا یُونٹ میں ہی کوئی جلسہ کر کے نعرے لگا کر دل ہلکا کر لیں گے۔"

صُوبیدار صاحب خاموش ہو گئے لیکن سخت ناخوش۔ میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے غیر اسلامی روّیے پر سخت برہم ہیں۔ اتنے میں آواز آئی کہ جلالۃُ الملک کی سواری آ رہی ہے۔ یہ سُنا تو صُوبیدار صاحب کا چہرہ جگمگا اُٹھا۔ اُن کی نظریں اُس سمت میں گڑ گئیں جدھر سے شاہ فاروق کو جلسہ گاہ میں داخل ہونا تھا۔ اُن کا تنفس تیز ہو گیا۔ مَیں نے اُن کی حالت غیر ہوتے دیکھی تو اُن کے بازو پر ہاتھ رکھا لیکن ہاتھ کی بجائے اُن پر شہتیر بھی آ گرتا تو اُن کی توجّہ کا کُچھ نہ بگاڑ سکتا۔ وہ اب ایک دُوسری دُنیا میں پہنچ چکے تھے۔ جُونہی شاہ فاروق نے دروازے کے اندر قدم رکھا، صُوبیدار صاحب بجلی کی سُرعت سے اُٹھ کھڑے ہُوئے اور فضا میں ایک آواز بلند ہُوئی:

"نعرہ ــــ اے ــــ تکبیر"

نعرہ اور لمبی 'اے' کے بعد تکبیر کا لفظ اِس طرح ادا ہُوا جیسے فیتہ جلنے کی شُوں شُوں کے بعد یکلخت گولہ پھٹتا ہے اور جُونہی صوبیدار صاحب لفظ تکبیر تک پہنچے، ہمارے بچّاس جوانوں نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا:

"اللہُ اکبر"

اِس پر شاہ فاروق کسی قدر حیرت سے مُسکرائے اَور حاضرین نے شاہی مُسکراہٹ سے اشارہ پا کر تالیاں بجا دیں۔

واقعہ یہ تھا کہ ہمارے نعرے کو کسی نے سمجھا نہ تھا۔ چاروں الفاظ بیشک عربی کے تھے، لیکن اُن کا پنجابی تلفظ اور وہ بھی ایک نعرے کی شکل میں مصریوں کے فہم سے بعید تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ ہندوستانی فوجیوں نے کوئی تماشہ کیا ہے! چنانچہ مَیں نے صوبیدار صاحب کو ایک

قہر آلود نگاہ سے دیکھا، لیکن صوبیدار صاحب تو اپنے خلیفہ کے حضور میں تھے۔ ایک خستہ نیم لفظین کیا اور اُس کی نگاہِ غضب کیا؟ شاہ فاروق ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ جب ہمارے قریب سے گزرے تو جیسے صُوبیدار صاحب کا اندر سے بٹن دَب گیا ہو۔ پھر دیوانہ وار اُٹھے اور دایاں بازو بلند کر کے نعرۂ تکبیر کی صدا لگائی اور ایک مرتبہ اور اللہ اکبر کی آواز گونجی۔ اب کے شاہِ فاروق نے قہقہہ لگایا اور تمام حاضرین خصوصاً پاشاؤں نے شاہی قہقہے کی تائید میں اپنے جی حضوری گلے پھاڑ کر رکھ دیے اور شامیانہ سر پہ اُٹھا لیا ——— ہر چند کہ اللہ اکبر کا نعرہ ہمارا دین و ایمان تھا؛ تاہم اِس مجلس میں اِس نعرہ بازی سے ہم تماشہ بن گئے۔ شاہ فاروق کرسیٔ صدارت پر بیٹھ گئے۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی، تو جلسے کے منتظم بکری پاشا میرے پاس آئے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے مبارکباد دے کر کہنے لگے:

"تمہارے جوانوں کے تماشے سے جلالۃ الملک بہت خوش ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ حضور کی رُخصت کے وقت بھی ایسا ہی کریں، تو حضور اور خوش ہوں گے۔"

لگے ہاتھوں مجھے یہ مژدہ بھی سنایا کہ تمہاری چائے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اب اگر میں بکری پاشا کو دل کی بات بتاتا تو کہتا کہ تُم اور تُمہارا بادشاہ بہشت کی دُوسری طرف جا سکتے ہو، لیکن یہ کہنے کی بات نہ تھی۔ بکری پاشا کی سُنا کیا اور خُونِ جگر پیتا رہا۔ صُوبیدار صاحب بھی بکری پاشا کی سُن رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ خلیفۂ وقت کی خوشنودی کا اِمکان ہو تو وہ دن بھر نعرے لگاتے رہیں گے۔ بہر حال جیسا کہ فوج کا دستور ہے میں نے صُوبیدار صاحب سے کہا:

"آپ نے عدول حکمی کی ہے۔ آپ اپنے کو زیرِ حراست سمجھیں۔"

صوبیدار صاحب کے چہرے کا رنگ ذرا پھیکا ہونے لگا اور آپ نے میری طرف دیکھا بلکہ پہلی دفعہ محسوس کیا کہ یہ شخص بھی ساتھ آیا ہے اور غالباً اپنے دل میں وہی باتیں سوچنے

لگے جو گرفتاری کے وقت لوگوں کے دماغ میں آتی ہیں؛ چنانچہ ایک لمحے کے لیے اُن کے ذہن میں خلیفۃ اللہ اور بکری پاشا کے درمیان سے ہمیں بھی باریابی ہوئی لیکن اتنے میں فاروق تقریر کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اگلے لمحے صُوبیدار صاحب نے ہمیں دماغ سے نکال باہر کیا۔ ان کی آنکھوں میں پھر وہی روشنی عود کر آئی۔ ان کے نزدیک، ہر مصری باتیں کرتے وقت قرآن پڑھتا معلوم ہوتا تھا اور اب تو امیر المومنین خود سخن سنج تھے۔ صُوبیدار صاحب کی آنکھوں کی روشنی ایک آتشیں شعلے میں تبدیل ہو گئی۔

فاروق ابھی دو لفظ بھی نہ کہنے پائے تھے کہ صُوبیدار صاحب نے اپنی جگہ پر ہی یعنی میری بغل سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ فاروق اِس دخل در معقولات سے پہلے تو ذرا ٹھٹھک سے گئے لیکن معًا ان کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا اور تمام پاشے کھلکھلا اُٹھے۔ تالیاں بجنا شروع ہوئیں۔ صوبیدار صاحب نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ مصر فتح کر لیا ہے۔ لگے ہاتھوں ایک مزید نعرہ لگایا مگر دفورِ جوش سے گلے پر معمول سے زیادہ زور دے دیا۔ آواز بھکولے کھانے لگی۔ فاروق اور ان کے حواری ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔ بکری پاشا بھاگے بھاگے آئے اور میرا شکریہ ادا کیا کہ تمہارے سپاہیوں نے جلالۃ الملک کو آمادۂ خندہ کر دیا۔ مَیں شرم سے غرقِ نیل ہو رہا تھا نہ صرف ہماری فوج بلکہ قوم کی سُبکی ہو رہی تھی اور یہاں دونوں کی آبرو کا محافظ مَیں تھا کہ سب سے سینئر تھا لیکن اپنی سینیارٹی کا استعمال کس شکل میں کرتا؟

بکری پاشا کی داڑھی نوچ لیتا؟

فاروق کو شٹ اَپ کہتا؟

صُوبیدار صاحب کے مُنہ میں فونٹین پن ڈال دیتا'

یا کپتنی کو وہیں فالن کر کے رائٹ لیفٹ کرتا جلسہ گاہ سے باہر نکل آتا؟

اِن میں سے کوئی حرکت بھی کرتا تو صُوبیدار صاحب سے بھی زیادہ مُمتاز اُلو بنتا؛ چنانچہ

انتہائی بے بسی میں سر جھکا کر بیٹھا کیا اور سنتا رہا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے سر پر کیا کیا آرے چلے اور کیا کیا نعرے لگے۔

آخر مجلس برخاست ہوئی۔ واپس کیمپ میں پہنچے۔ صوبیدار صاحب کہ اب دربارِ خلیفہ سے نکل کر یونٹ لائن میں آ گئے تھے، برخاستگی بلکہ قید کی تیاری کرنے لگے۔ صوبیدار صاحب کا جرم واقعی سنگین تھا، لیکن اِس سادہ اور جوشیلے مسلمان کا جیل خانے سے ایک بہتر اور باعزت مصرف بھی تھا یعنی محاذِ جنگ۔ دوسرے روز دفتر میں بلایا تو صوبیدار صاحب سمجھے کہ اب کورٹ مارشل ہوتا ہے لیکن جب محاذِ جنگ پر جانے کا حکم سنا تو اُن کی آنکھوں میں روشنی کی وہی پرانی کرن پھوٹی۔ سیلوٹ کیا، دفتر سے باہر نکلے اور نعرۂ اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ ظاہر تھا کہ یہ نعرہ امیر المومنین کی شان میں نہیں بلکہ "غریب الافسرین" یعنی اس خاکسار سیکنڈ لفٹننٹ کے اعزاز میں ہے۔

۱۴

چند روز عباسیہ کیمپ (قاہرہ) میں

مینا کیمپ میں ہمیں صرف سات دِن کے لیے ٹھہرایا گیا تھا، لیکن مہینہ پُورا گزر گیا اور کسی نے ہم سے اِتنا سا آسان سوال نہ کیا کہ مُنہ میں کَے دانت ہیں۔ اَور ہمیں خود کیا ضرورت تھی کہ مُنہ کھولتے؟ ہمیں مولانا حالی کا فارمولا یاد تھا کہ عقلمند زبانیں بتیس دانتوں میں کیسے رہا کرتی ہیں یعنی کروٹ نہیں بدلتیں۔ ہم نے بھی زبان نہ ہلائی، کیونکہ ہمیں ہٹلر کی مُلاقات کی اتنی بے تابی نہ تھی! چنانچہ اِس خداداد فُرصت کو غنیمت جانا اور قاہرہ کا گھونگھٹ اٹھا کر ذرا تفصیل سے دیکھنا شروع کیا تا آنکہ خداوندانِ کیمپ کو احساس ہُوا کہ یہ شخص کسی قدر زائد المیعاد ہو چلا ہے؛ چنانچہ ہمیں فی الفور کیمپ سے روانگی کا حکم ملا لیکن حکم پڑھا تو ہمارا تبادلہ محاذ کی بجائے عباسیہ کیمپ میں کر دیا گیا تھا جو قاہرہ کے دُوسرے یعنی شمالی سِرے پر واقع تھا۔

محاذ کی بجائے عباسیہ جانا ہمیں یُوں معلوم ہُوا جیسے عُمر طبعی کے علاوہ کچھ فالتو زندگی عنایت ہو گئی ہے اور ہم نے طے کر لیا کہ اِن جھونگے کے ایّام میں ہم قاہرہ کو حسبِ ضرورت تہ و بالا کریں گے لیکن یہ خُدا تعالیٰ اور لفٹننٹ کرنل پیٹرسن کو منظور نہ تھا۔

لفٹننٹ کرنل پیٹرسن عباسیہ کیمپ کے کمان افسر تھے۔ آپ کی سیرت کے کئی درخشاں پہلو تھے لیکن جس پہلو سے ہم ماتحتوں کا واسطہ تھا، یعنی آپ کا مزاج، وہ اِتنا درخشاں نہ تھا جتنا

آتش فشاں تھا۔ نتیجۃً ہمیں جرمنوں کے علاوہ اپنے کرنل صاحب سے بھی جنگ یا خانہ جنگی کا سامنا تھا۔ آپ ادھیڑ عمر اور درمیانے قد کے خوبرو سے آدمی تھے۔ ملاقات پر ابتدائی کلمات میں ایسی شرافت و حلاوت کا اظہار کرتے کہ آپ پر فرشتہ ہونے کا گمان ہونے لگتا، لیکن جوں جوں گفتگو بڑھتی آپ صراطِ مستقیم سے بتدریج پھسلنے لگتے اور اپنی حلاوت میں عرق چرائتہ ملانا شروع کر دیتے۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی شبہ نہ رہتا کہ آپ کونسے فرشتے کے برُوز ہیں۔ ہم نے کئی لوگوں کو آپ کے دفتر میں گنگناتے اور چہچہاتے داخل ہوتے دیکھا۔ چِق کے پیچھے سے ایک دو قہقہے بھی سنائی دیے لیکن پھر کبھی چیخیں بلند ہوئیں، کبھی گالیاں گونجیں، کبھی مُکّے چلے اور کبھی تھپّڑ برسے۔ چونکہ کرنل صاحب مساوات کے قائل تھے؛ لہٰذا اِس کلیے سے کوئی مُلاقاتی مستثنےٰ نہ تھا۔

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ایک دن کیمپ کے ایڈجوٹنٹ کیپٹن ہنگو فنگ شرفِ مُلاقات حاصل کرنے کے بعد کے تو اُن کی آنکھ کے گرد ایک بے عیب آبنوسی ہالہ تھا جو کرنل صاحب کے زوردست کا نتیجہ تھا۔ دُوسرے دن سیکنڈ اِن کمانڈ میجر بریٹ برآمد ہوئے تو اُن کے کپڑوں پر روشنائی کی ایک دِلیع اور دلکش سی افشاں تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ ایک دوات کا خُون ناحق بھی کرنل صاحب کے سر ہے۔ غریب ہیڈ کلرک کے ماتھے پر تو ایک مُستقل مخروطی "روڑا" اُبھرا رہتا تھا جس کی تازگی میں کوئی کمی نہ آتی تھی کہ کرنل صاحب مُناسب وقفوں کے بعد اپنے پیپرویٹ سے اس کی تجدید کرتے رہتے تھے لیکن کرنل صاحب کا شاہکار وہ واقعہ تھا جو ایک صبح انہیں کیمپ کے مالی کے ساتھ پیش آیا۔

سات بج رہے تھے۔ تمام لوگ اپنے کاموں پر آ رہے تھے۔ کرنل صاحب بھی ہاتھ میں چھڑی لیے دفتر کی سمت رواں تھے کہ اتفاقاً آپ کی نگاہ مالی پر پڑی جو پھولوں کی کیاری میں

کام کر رہا تھا۔ حسبِ معمول آپ نے اُسے بھی بے مقصد شرفِ گفتگو بخشا۔ پھر جیسا کہ دستور تھا، گفتگو شاباشوں سے گزر کر گالیوں سے ہوتی ہوئی ڈنڈوں تک آ پہنچی اور مالی بھاگ نکلا۔ خدا جانے کرنل صاحب کو کیا سُوجھی کہ مالی کا تعاقب شروع کر دیا اور ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ آگے آگے مالی عربی زبان میں فریاد کرتا ہُوا بھاگ رہا ہے اور پیچھے پیچھے کرنل صاحب انگریزی میں گالیاں دیتے ہُوئے تیزی سے لپک رہے ہیں۔ کیمپ کے سینکڑوں افسر اور سپاہی کام چھوڑ کر تماشہ کرنے لگتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کوئی بدتمیز جونیر افسر جھوٹی تحسین کے طور پر کرنل صاحب کے حق میں تالی بھی بجا دیتا ہے۔ اُدھر بھاگتے مالی کے چہرے پر ہراس ہے اور پیشانی پر پسینہ۔ کرنل صاحب کی آنکھوں میں غضب ہے اور مُنہ پر جھاگ۔ راہ میں ایک ٹینک کھڑا ہے۔ مالی جانِ عزیز بچانے کی خاطر ٹینک پر چڑھ جاتا ہے، لیکن پیچھے دیکھتا ہے تو کرنل صاحب بھی جُوں تُوں کر کے ٹینک پر چڑھ رہے ہیں۔ مالی بے خطر چھلانگ لگا کر زمین پر آ جاتا ہے۔ کرنل صاحب بھی اتنی ہی بے ساختہ چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ مالی کہ جوان ہے سنبھل کر اُٹھتا ہے اور بھاگنے لگتا ہے لیکن کرنل صاحب کا یہ حال ہے کہ عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام چھلانگ کے بعد ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ مالی مُڑ کر دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ آج کا تماشہ ختم ہے۔ آرام سے اُلٹے قدم جا کر کیاری میں نلائی شروع کر دیتا ہے۔

بدقسمتی سے اِس حادثے میں کرنل صاحب کے پاؤں میں چوٹ آ گئی۔ دو دِن ہسپتال میں رہے۔ مہینہ بھر لنگڑاتے رہے اور مہینہ بھر ہمارا جینا حرام کر دیا یعنی اور باتوں کے علاوہ ہمارے شہر جانے پر پابندی لگا دی۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ مالی کی گرفتاری میں غیر جانب داری سے کیوں کام لیا؟

جاسیہ کیمپ آرمرڈ کور یعنی رسالے والوں کا کیمپ تھا۔ فوج میں رسالے والے اپنے بانکپن کے لیے مشہور ہیں۔ تنگ پتلونیں اور لمبے کوٹ پہنتے ہیں، لمبے بال رکھتے ہیں اور لمبی

ہانکتے ہیں۔ دُوسرے فوجیوں کو ایسی نزاکتوں کی اجازت نہیں لیکن رسالے والوں کے لیے یہ سب کچھ روایتاً جائز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اِن کے دَم سے ہی فوج کی سپاٹ زندگی میں کچھ آب و رنگ ہے۔ مَیں کہ سگنل کور کا ایک خاکی پوش تھا' ایسے ہی خوش وضع افسروں سے گھرا ہُوا تھا۔ جے جی سنگھ، جوشی، حبیبُ اللّٰہ، محمد یعقوب' ارجن داس سنگھ اور بیشمار انگریز افسر۔

لفٹننٹ جے جی سنگھ نان سٹاپ باتیں کرتے تھے لیکن باتوں میں وہ لذّت کہ جو اُس نے کہا۔ ہمارے دل میں نکلا۔ جوشی بھی لفٹیننٹ تھے۔ چھوٹے قد کی وجہ سے رسالے میں کسی قدر بے جا سے لگتے تھے لیکن اپنی رنگین مزاجی سے وہ معترضین کی توجّہ قد کی طرف آنے ہی نہ دیتے تھے۔ جوشی کی یاد اِس غزل سے وابستہ رہے گی جو خورشید نے ایک نہایت ہی دِلرُبائے میں گائی ہے اور جس کا مضمون ہم پردیسیوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ پہلا مصرع تھا:

"جو ہم پہ گزرتی ہے ستاروں سے پُوچھیے" ○

جوشی ہر شب یہ ریکارڈ لگاتے اور جب ختم ہو چکتا تو اپنی پُونا میں رہنے والی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ خُدا جانے سالی ستاروں سے سَوال بھی کرتی ہے یا نہیں؟

کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی!

کیپٹن حبیب اللّٰہ ببّل (BUBBLE) کہلاتے تھے۔ ہم سے سینئر تھے اور ذرا دماغی فاصلے پر رہتے تھے۔ خاصے انگریز مزاج تھے لیکن رمضان میں دن بھر کی فوجی مشقّت کے باوجود روزے رکھتے تھے۔ ارجن داس سنگھ اور یعقوب ہماری طرح سیکنڈ لفٹیننٹ تھے۔ ہمارے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور انہی نوالوں اور پیالوں کی خاطر ہم ہر شب کرنل صاحب سے آنکھ بچا کر گراپی یا بادیہ میں جا نکلتے تھے۔

لیکن اِن سب میں سے دلچسپ آدمی کیپٹن رام ناتھ تھے۔ ابتدائے جنگ میں رسالدار

○ وزنِ شعر بر گردنِ فلمی شاعر

تھا اور اگر جنگ نہ چھڑتی تو شاید رسالدار ہی جیتے اور مرتے، لیکن جنگ کے فیضِ عام میں خانہ براندازانِ فوج نے آپ پر بھی کپتانی پھینک دی اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا کرکے آپ کا ستیاناس کر دیا یعنی ایک عظیم الشان رسالدار کو ایک نہایت بے توفیقے افسر میں بدل دیا۔

رام ناتھ اپنے سرٹیفکیٹوں کے علاوہ شکل و صورت سے بھی نیم خواندہ لگتے تھے۔ آپ کا کپتان ہونا نہ صرف آپ کے مزاج کے منافی تھا بلکہ غالباً قضا و قدر کے ابتدائی منصوبے کے بھی خلاف تھا۔ آپ کسی کام میں بھی کپتانی کرتے تو آپ سے حوالداری ہو جاتی۔ پریڈ پر جاتے تو سپاہیوں پر دانت پیسنا شروع کر دیتے۔ وردی پہنتے تو سر اور ٹوپی میں تسلی بخش ربط نہ پیدا ہو سکتا۔ چائے پیتے تو ہونٹوں سے نہیں بلکہ پھیپھڑوں کے زور سے۔ پیالی ہونٹوں کے قریب جاتی تو پھڑپھڑانے لگتی اور خرادکی سی آوازیں آنے لگتیں۔ الغرض آپ چائے اُسی اصول پر پیتے جس پر جیٹ طیارے پرواز کرتے ہیں۔ سگریٹ پیتے تو پہلے اُسے مٹھی میں بھینچتے اور پھر آنکھیں بند کرکے کش لگاتے اور آنکھیں کھولنے تک اُسے راکھ کر دیتے۔ یہ دیکھ کر میں داغ کا مصرع گنگناتا

"جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں"

اِس پر آپ فرماتے: "معلوم ہندا اے، ایہہ داغ وی سگرٹ پیندا سی۔"

آپ نے کہیں سے سُن لیا تھا کہ افسری شراب پیئے بغیر پختہ نہیں ہوتی؛ چنانچہ سرِشام اپنے کوارٹر کے باہر میز پر بوتل اور گلاس رکھ کر بیٹھ جاتے اور پینے سے پہلے ہی ایسی باتیں شروع کر دیتے جن سے اُن کے خیال میں مستی کا اظہار ہوتا تھا مثلاً ہوا یا ہٹلر کو مخاطب کرکے بڑی زرق برق مگر عام فہم گالیاں بکتے۔ اب پنجابی گالیاں بیشک توانا اور دُور رس تخیل کی آئینہ دار ہوتی ہیں؛ تاہم اُن سے مستی سے زیادہ زبردستی کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ نے نوشی سے بھی رام ناتھ کی رام ناتھی ہی نکھری، اُن کی کپتانی کا ملمع اُن کا جزوِ بدن نہ ہو سکا۔

یہ نہیں کہ ہر وہ آدمی جو رینک سے ترقی پا کر افسر بنا، رام ناتھ تھا۔ جی نہیں، بے شمار افسر

ایسے تھے جو سپاہی بھرتی ہوئے اور بعد میں افسری خود اُن کے استقبال کو آئی۔ وہ اس بات کو نہیں چھپاتے تھے کہ اُنہوں نے بطور سپاہی ابتدا کی۔ بلکہ جب ذکر کرتے تو اُن کے سپاہی رہنے پر رشک آتا لیکن عام طور پر یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے جوانی میں ہی افسری کی منزل عبور کر لی تھی۔ رام ناتھ بہت بُڈھے طوطے تھے اور اس عُمر میں میاں مٹھو سے زیادہ پیچیدہ بات کرنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

کرنل پیٹرسن کی تنک مزاجی کی وجہ سے عباسیہ کیمپ کی زندگی کافی پھیکی تھی لیکن اچانک جرمنوں کو ہم پر رحم آیا اور اُنہوں نے ہمارے لیے رونق کا سامان پیدا کر دیا یعنی ایک رات عباسیہ کے نواح میں ہوائی جہازوں سے فی الہدیہ دس بارہ بم پھینک دیے۔ اس خیال سے کہ شاید جرمن اپنی چھاتہ فوج قاہرہ کے ہوائی اڈے الماذا پر اُتارنا چاہتے ہیں، ہمیں راتوں رات الماذا کی حفاظت کے لیے باہر جانے کا حکم ملا۔ حکم دینے والوں کے حق میں کلمۂ خیر سے مختلف کلمے پڑھتے ہوئے بستر سے اُٹھے۔ وردی پہنی اور سارا کیمپ بیٹل آرڈر میں الماذا کی طرف بڑھا اور ایروڈرم کے گرد خندقیں کھود کر مورچہ گیر ہو گیا۔

رات گزر گئی، لیکن جرمن ہوائی جہاز نہ لوٹے۔ بہرحال ہمیں بتایا گیا کہ جرمنوں کا انتظار جاری رہے گا۔ رات تو کبھی، نہ کسی طرح تارے گن کر گزار دی، لیکن دن بھر کا انتظار بڑا گراں گزرا۔ جرمنوں کو آنا تھا نہ آئے، لیکن انتظار ہفتہ بھر جاری رہا۔ وہ عربی کہاوت ہے کہ انتظار موت سے بھی اشد ہوتا ہے۔ موت کا تو ہمیں بالفعل تجربہ نہ تھا لیکن مزید انتظار سے بچنے کے لیے ہم اس تجربہ پر بھی تیار تھے؛ چنانچہ اسی ہفتے کسی وقت اگر جرمن آجاتے تو ہم بے حد ممنون ہو کر اُن سے لڑتے اور مرتے۔

آخر سات دن کے بعد کسی کو رحم آیا اور ہمیں حکم ملا کہ رات اپنے کوارٹروں میں سو سکتے ہو لیکن صرف آدھ گھنٹے کے نوٹس پر۔ گویا وردی پہن کر ہی بستر پر دراز ہونا تھا۔ ہمیں اتنی رعایت

بھی غنیمت تھی۔ ہمارے اکثر ساتھی سچ مچ وردی میں ہی سوئے، لیکن ہم نے ریشمی پاجامہ زیب بر تن کیا۔ نماز پڑھی اور ایک میٹھی نیند کی ابتدا کی ـــــ لیکن کرنا خدا کا بلکہ جرمنوں کا کیا ہوا کہ اُسی رات المازہ پر پھر ہوائی حملہ ہوا۔ فی الفور الارم ہوا اور آدھ گھنٹے میں ہم پھر مورچوں میں تھے۔ یہ مورچوں میں بیٹھنا بھی قابل برداشت تھا لیکن الارم سُن کر بیدار ہونا، بستر سے جدا ہونا، ریشمی پاجامے کی جگہ خاکی وردی اور اُوپر چمڑا مع پٹھو پہننا، کمر میں پستول لگانا اور سر پہ آہنی خود رکھنا ـــ سراسر ظلم تھا جو ہو رہا تھا۔

اِدھر اہلِ مصر یہ سمجھے کہ انگریز کے دِن گنتی کے ہیں۔ دائیں بائیں دیکھ کر "استبعل یا رومیل" کا نعرہ لگانے لگے۔ انگریزوں نے قاہرہ کے بازاروں میں جا بجا روڈ بلاک لگا لیے کہ رومل یا اُس کے متوسلین ادھر آ ہی نکلیں تو اُن پر انگریزوں کی نارضامندی واضح ہو جائے۔ جب اہلِ مصر کو ذرا تیزی سے آزادی کے خواب آنے لگے تو انگریز اِس لذّتِ خواب میں کسی قدر بد تمیزی سے مُخل ہُوئے۔ پانچ چار ٹینک شاہ فاروق کے العابدین محل کے اِرد گرد کھڑے کر دیے اور شاہ موصوف کو ایک طشتری میں قلم رکھ کر ایک لکیر پہ دستخط کرنے کی زحمت دی۔ شاہ نے نیچے ٹینک دیکھے اور اُوپر جرمن طیارے غائب پائے تو دستخط کر دیے اور بیک جنبشِ قلم ایک حقیر سے کاغذ کو تاریخ میں اور ایک ناچیز سے قلم کو برٹش میوزیم میں جگہ دے دی۔ پھر انگریز کمانڈر سے ہاتھ ملایا۔ اُسے وِسکی پیش کی اور اپنے وزیرِ اعظم علی ماہر پاشا کو الوداع کہی۔ انگریزوں نے اپنی پسند کا وزیر فاروق کو پیش کیا اور اتفاق کی بات کہ فاروق کو نیا وزیرِ اعظم انگریزوں سے بھی زیادہ پسند آیا!!

" تا اب لائے ہی بنے گی غالب   واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

آخر جنرل مانٹگمری العالمین پہنچے اور جرمنوں کی توجہ ادھر ہٹ گئی۔ قاہرہ میں انگریز پھر سر اُٹھا کر چلنے لگے اور ہمارا کیمپ نئے سرے سے اپنے کرنل صاحب کی کرم فرمائی کے لیے محفوظ ہو گیا۔ اِس کرم سے تھوڑا سا حصّہ اِس خاکسار کو بھی ملا اور وہ یوں کہ ایک جیپ میں

بیٹھا ہوائی اڈے کو جا رہا تھا کہ کیمپ کے دروازے پر کرنل صاحب مل گئے۔ مَیں نے حسبِ معمول سلیوٹ کیا تو کرنل صاحب نے بکمال بندہ پروری نہ صرف سلام کا جواب دیا، بلکہ جیپ کو ٹھہرا کر مجھے "ہیلو خان" بھی کہا اور پوچھا:

"کہاں جا رہے ہو خان؟"

عرض کیا: ہوائی جہاز سے خاص ڈاک آرہی ہے۔ اُسے لینے جا رہا ہوں۔"

مُسکرا کر بولے: "شاباش، جہاز کس وقت آتا ہے؟"

عرض کیا: "دس بجے۔"

بولے: "نہیں گیارہ بجے۔"

مَیں نے ادب سے کہا: "شاید آپ کو یاد نہ ہو دس بجے ہی آتا ہے۔"

اِس کے بعد وہی ہوا جو شدنی تھا۔ کرنل صاحب نے جوش میں آکر اپنی ٹوپی زمین پر دے ماری اور جیپ کو اپنی چھڑی سے ضرب لگا کر بولے:

"دس نہیں گیارہ بجے آتا ہے۔"

ظاہر تھا کہ اب شعلے بلند ہوں گے لیکن پیشتر اِس کے کہ مالی والی تاریخ دُہرائی جاتی ڈرائیور نے زبان نکال کر کرنل صاحب کا مُنہ چڑایا، ایکسلریٹر کو دبایا اور جیپ فراٹے بھرتے ہوئے نکل گئی۔ جواب میں کرنل صاحب نے ہم پر تو دانت پیسے، لیکن ڈرائیور کی بدتمیزی پر ہنس دیے اور انہیں ہنسنا ہی چاہیے تھا کیونکہ ہمارا ڈرائیور کوئی سپاہی لہنا سنگھ نہ تھا بلکہ نہایت ہی شوخ و شنگ اے ٹی ایس لڑکی مس مارگریٹ تھی اور کرنل صاحب ہرچند کہ سر کے کھوکھلے تھے، سینے میں دِل رکھتے تھے۔

بہرحال ہمارا قصور معاف ہونے والا نہ تھا اور نہ ہی ہم مستقل طور پر مارگریٹ کی حفاظت میں رہ سکتے تھے؛ چنانچہ ہم آنے والے طوفان کے اِنتظار میں بیٹھ گئے، مگر دُوسرے ہی دِن ایک

ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہماری زندگی میں تو ایک انقلاب سا برپا کر دیا، لیکن کرنل صاحب نے بھی اس میں حصّہ لیا اور لبقول لاہوریاں: "مبدوبدی"

واقعہ یہ ہُوا کہ قاہرہ کے مشرقی مضافات میں جنہیں "المعادی" کہتے ہیں رائل سگنل کور کا ایک بہت بڑا کیمپ اور سکول تھا۔ اِسی سکول کے اِنڈین وِنگ کے افسر کمانڈنگ کیپٹن اُوڑا سنگھ ○ تھے۔ اِتفاق سے اُن کی وطن کو واپسی کا وقت قریب آگیا اور جی ایچ کیو مڈل ایسٹ (قاہرہ)، کو اُن کے جانشین کی حاجت محسوس ہوئی۔ اِسی تلاش میں عباسیہ کیمپ سے فون پہ پُوچھا گیا کہ اگر سگنل کور کا کوئی موزوں سا افسر ہو تو اس کا نام پتہ بتاؤ۔ فون لینے والے کیمپ کے ایڈجوٹنٹ کیپٹن بنگو تھے اور ہمارے یار تھے۔ جواب میں بولے:

"بڑا موزوں آدمی ہے لیکن ہے ذرا سیکنڈ لفٹیننٹ ہی۔ کوئی ڈیڑھ سال سروس ہے۔"

اُدھر جی ایچ کیو کے فون پر کوئی حاتم طائی بیٹھا تھا۔ بولا: "اگر موزوں ہے تو سروس کی فکر مت کرو۔ ہم کپتانی دیں گے لیکن اُس سے کہو کہ معادی جا کر سگنل سکول کے کرنل سے اپنی موزونیت کی تصدیق کرا لائے۔ اگر کرنل صاحب نے ہاں کر دی تو ہم کل اُس کے تقرر کا حکم بھیج دیں گے۔"

بنگو نے یہ سُنا تو بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور چھٹی دے کر ہمیں معادی کیمپ کے کمان افسر کرنل جورڈین کے پاس بھیج دیا۔ بنگو اور ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ مُعاملہ کرنل پیٹرسن سے پوشیدہ رکھا جائے گا۔ ورنہ ہماری کپتانی کے بن کھلے ہی مُرجھا جانے کا اندیشہ تھا۔

معادی میں کرنل جورڈین سے ملاقات ہُوئی تو بڑے شفیق سے بزرگ نکلے۔ اس بات سے خاص طور پر متاثر ہوئے کہ سگنل کور کا ایک افسر رسالے کے کیمپ میں ضائع ہو رہا ہے۔ بولے:

"حکم ملتے ہی یہاں آجاؤ۔"

○ اصل نام ذرا مختلف تھا۔

ظاہر تھا کہ کرنل صاحب کی نگاہ میں ہم موزوں ہیں؛ چنانچہ دوسرے روز ہی سچ مچ ہمارے نئے تقرّر اور کپتانی کا حکم آگیا۔ بنگو نے کرنل پیٹرسن سے بالا بالا ہمیں مومنٹ آرڈر دے دیا۔ مارگریٹ بھی ہماری سازش میں شریک ہو گئی۔ چپکے سے جیپ لے آئی۔ ہمیں اور ہمارے اسباب کو لاد کر معادی پہنچا دیا۔ مارگریٹ کو الوداع کہی تو کسی قدر رنج سا ہوا لیکن دوسرے روز جب معادی کی کھلی فضا میں سانس لیا تو ہماری دنیا لاکھوں مارگریٹوں کے تبسّم سے معمور ہو گئی۔

جب کندھوں پر کپتانی لگائی اور کیپٹن اوڑا سنگھ سے انڈین ونگ کی کمان سنبھالی تو ہمیں مغا جنرل منٹگمری کا خیال آیا کہ انہیں بھی پچھلے دنوں ہی آٹھویں فوج کی کمان دے کر العالمین بھیجا گیا تھا یعنی ذمہ داریاں کچھ ایک جیسی ہی تھیں۔ ذرا سا درجے کا فرق تھا۔ بڑی پھرتی سے اپنے دوستوں کو وطن میں خط لکھے جن کا مدعا فقط یہ تھا کہ اب ہم محض نیم لفٹین نہیں، بلکہ ہمارے کندھوں پر تین تین پھول کھل اٹھے ہیں۔ بارہا تنہائی میں اپنے شانوں کو دیکھا، ستاروں کی کثرت سے کہکشاں نظر آتے تھے۔ حتیٰ کہ آنکھوں میں ہلکا چوندسی آنے لگی اور گردن میں بل پڑنے لگے۔

اب تو باقاعدہ اپنا یونٹ تھا اور ہم آفیسر کمانڈنگ۔ گویا سیاں کے محتاج نہ تھے، خود کوتوال تھے، سو ڈر کس کا؟ بلکہ تھوڑی سی بے قاعدگی کر کے بھی دیکھ لی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ یہاں کسی پیٹرسن کا خوف نہ تھا۔ جدھر جاتے سینکڑوں بازو سیلوٹ میں اٹھ جاتے۔ محسوس ہوتا کہ دیکھنے والے رشک کر رہے ہیں، چنانچہ ہم دل ہی دل میں ہر سیلوٹ کرنے والے کو دعا بھی دیتے کہ نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو۔ پھر آرڈرلی روم ہوتا یعنی ماتحتوں کی شکایات اور فریادیں سننے کے لیے دربار لگتا۔ پھر سرکاری ڈاک دیکھتے اور جی چاہتا تو کوئی خط پڑھ بھی لیتے۔ پھر ٹیلیفون پر لوگوں سے ضروری اور غیر ضروری باتیں ہلا جُلا کر کرتے۔ ہمیں یقین تھا کہ افسری میں کچھ مزا ہے تو ہم لوٹ رہے ہیں۔ یہ لوٹ کوئی ہفتہ بھر جاری رہی تاآنکہ اچانک بنگو کا عباسیہ سے فون آیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا:

"غضب ہو گیا۔ کرنل پیٹرسن کو تمہارے جانے کا پتہ چل گیا ہے، سخت برہم ہے۔ جو اندر جاتا ہے اُسے بیپر ویٹ کھینچ مارتا ہے۔ تمہارے متعلق جی ایچ کیو کو لکھ رہا ہے کہ کپتانی کے قابل نہیں۔ اِسے مزید تجربہ حاصل کرنے کے لیے فی الفور محاذِ جنگ پر بھیجا جائے۔ اب تم جلد ہی جی ایچ کیو سے سُن لو گے۔ ساری اولڈ بوائے۔"

یعنی ہماری حالت کچھ فیضؔ سے ملتی جلتی تھی:

جو کوئے یار سے نکلے تو سُوئے دار چلے

ایک لمحے کے لیے ہمارے کندھوں کی کہکشاں مع کپتانی کے ماند پڑ گئی اور ہمارے تصور میں سیدی رزیغ، جرمن گولے اور بُلی بیف نمودار ہوئے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

قریب تھا کہ ہم لڑکھڑا جائیں لیکن ایک بزرگ کا قول یاد آیا کہ اگر مصیبت آجائے، تو اس شخص کا خیال کرو جو تُم سے بھی زیادہ مصیبت زدہ ہو۔ اِس ضمن میں موزوں ترین شخص نظام سقہ ہی تھا جس نے فقط آٹھ پہر کی سریر آرائی کے بعد آرام سے مشک اُٹھا کر چھڑکاؤ شروع کر دیا تھا اور ہم تو خیر سے متواتر آٹھ دن سے کپتان تھے۔ خدا کا شکر ادا کیا اور ذرا کانپتی کانپتی کپتانی بھی بدستور جاری رکھی لیکن حسبِ توقع دُوسرے دن کرنل جورڈین کا اردلی سلام لے کر آیا۔ اُن کے دفتر میں گیا تو کرنل صاحب نے ایک کاغذ ہماری طرف بڑھایا۔ یہ جی ایچ کیو کا خط تھا۔ پڑھا تو وہی کچھ لکھا تھا جو بنگو نے بتایا تھا۔ رُکتے رُکتے پُوچھا:

"مجھے کب محاذ پر جانا ہے؟"

کرنل جورڈین میرے سوال پر مسکرائے اور ایک دُوسرا کاغذ میری طرف سرکایا۔ یہ جی ایچ کیو کو اُن کی طرف سے جواب جا رہا تھا۔ لکھا تھا:

"یہ افسر میرے ماتحت کام کرتا ہے۔ کپتانی کے لیے موزوں ہے یا نہیں اِس کا فیصلہ

مجھ پر ہے اور وہ یہ ہے کہ موزوں ہے۔ عباسیہ کیمپ کے کرنل صاحب کو میری طرف سے بعد از آداب بتایا جائے کہ دُوسرے یونٹ کے افسروں پر رائے زنی کرنا فوج کا دستور نہیں۔"

ہمارے دماغ سے سیدی رزیغ، جرمن گورے اور بُلی بیف یک قلم غائب ہو گئے اور واپس انڈین ونگ میں جا کر ہم نہایت شان و شدت سے کپتانی کرنے لگے جو نظام سقے کی سریر آرائی سے کہیں زیادہ کھری اور دیرپا تھی۔

سُنا ہے چند دن بعد جب کرنل پیٹرسن کو جی۔ ایچ۔ کیو سے جواب گیا تو موصوف نے اپنا ہیٹ اُتار کر ڈھٹنے کی بجائے کھالیا! ہڑپ کر کے نہیں، لُقمہ لُقمہ! واللہ اعلم بالصّواب۔

۱۵

مڈل ایسٹ سگنل سکول معادی (قاہرہ) میں

صحرا کی لڑائی اور عبا سیہ کی "ماکٹائی" کے بعد معادی کی زندگی ایک خواب کی طرح سہانی زندگی تھی۔ صبح سے دوپہر تک ونگ کا سرکاری کام جو یُوں تو شاید ایسا تُھک محسُوس نہ ہوتا لیکن خود اپنا باس ہونے کی وجہ سے ایک ولولہ انگیز تفریح بن گیا اور دوپہر کے بعد تو بس ہم تھے اور قاہرہ۔ معادی کے اسٹیشن سے ہر آدھ گھنٹے کے بعد ایک مکلف ڈیزل ٹرین چلتی جو دس منٹ میں قاہرہ کے مرکز یعنی باب لُوق اسٹیشن پر پہنچا دیتی اور پھر ہم قاہرہ کی وُسعتوں میں کھو جاتے۔

قاہرہ نوردی اِس اعتبار سے دو آتشہ ہو گئی تھی کہ لفٹیننٹ پی۔ سی۔ ورما جو تھوڑیں ہمارے ہم جماعت تھے، اچانک ایک دِن معادی میں آن وارد ہُوئے۔ یہ بھی سگنل افسر تھے اور محاذ پر ایک برگیڈ کے ساتھ تھے لیکن ہندوستان کی آزادی کے ذرا اُونچی آواز سے حامی تھے جو اُن کے انگریز کمانڈر کو موافق نہ تھا؛ چنانچہ انہیں میدانِ جنگ میں خطرناک سمجھ کر واپس کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ ایسا کر کے برگیڈیئر صاحب نے بڑا کارِ ثواب کیا کہ مَیں معادی میں ہر چند کہ خوش تھا، تنہا دیسی افسر تھا اور ورما سے زیادہ انجمن آرا رفیق ملنا مشکل تھا۔ ورما کسی قدر زیرِ عتاب تھا؛ لہٰذا اُسے کوئی سرکاری کام نہیں دیا گیا تھا۔ اُس کا واحد شغل ہر شام قاہرہ کے کسی مقام پر انجمن آراستہ کرنا تھا۔ کبھی بادیہ یا گراپی میں، کبھی شیپرڈ یا کانٹی نینٹل ہوٹل میں، کبھی انڈین کلب یا جزیرہ کلب

میں اور کبھی انکل تن کے یہاں یا بھابی للّی کے کلب میں ـــــ اِن اجنبی ناموں سے تعارف ابھی تھوڑی دیر میں ہو گا۔

ورما کم بخت نہایت خوش شکل اور شگفتہ مزاج نوجوان تھا۔ کلارک گیبل سے خطرناک حد تک مشابہت رکھتا تھا۔ کچھ خداداد اور باقی اس کی اپنی پیدا کردہ یعنی وہ پتلی لمبی لکیر سی مونچھ اور وہ نیم بدمعاشانہ سی ہنسی جس میں ہونٹ کم اور آنکھیں زیادہ مسکراتی ہیں۔ ورما کی آنکھوں میں ایک شریر اور دلکش سی چمک تھی۔ وہ جہاں سے گزر جاتا، عورتیں دوبارہ دیکھے بغیر نہ رہ سکتیں۔

ایک روز گراپی میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ایک خاتون کچے دھاگے سے کھچی کھچی آئی اور ورما سے کہنے لگی:

"تم کلارک گیبل ہو؟"

ورما تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا اور وہی چشم و لب کی مسکراہٹ کا متحدہ محاذ بنا کر بولا:

"اِس کے متعلق تو مَیں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن جو کچھ پُورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، یہ ہے کہ آپ کا ادنیٰ خادم ہوں۔"

ساتھ ہی وَرما نے خاتون کے لیے اپنی کرسی خالی کر دی۔ محترمہ بیٹھ گئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وَرما کو دیکھ کر اُن کی مرادیں پُوری ہو رہی ہیں۔ معلوم ہُوا کہ بیچاری چار دن سے ورما سے کلام کرنے کی تمنا میں چکرائی پھرتی رہی ہیں اور ارادے باندھتی اور توڑتی رہی ہیں اور آج کشتی خدا پر چھوڑ کر منجدھار میں اُتر آئی ہیں۔ وَرما نے اُنہیں اپنی خوش کلامی سے کنارے پر لا کھڑا کیا اور وہ دُعا دیتی رُخصت ہو گئیں ـــــ ورما کی زندگی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے اور اُس نے بیسیوں لڑکیوں سے اپنی غلامی کے پیمان باندھے، لیکن اپنی ہرجائی محبت کا پول نہ کُھلنے دیا۔ سوائے ایک نازک موقع کے جس کا ذِکر آنے والا ہے۔

ان دنوں قاہرہ میں دیسی افسروں خصوصاً ڈاکٹروں کی خاصی تعداد تھی۔ ان میں سے

ایک میجر وید پرکاش تھے۔ وید درما کی ضد تھے۔ سپاٹ چہرہ جو کسی ایکٹر سے مشابہ نہ تھا۔ مونچھ سیدھی سادی شریفانہ بلکہ کسی قدر لاابالیانہ یعنی کرزن پر مائل پستی رہائش تو بے حد یکجائی۔ ایک جگہ ابتداء کی اور پھر وہیں اِنتہا کردی یعنی شادی کرلی۔ ہم وید کی شادی میں شریک ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ قاہرہ کی زنانہ کلب کا جزوِ بدن بن گئے۔

بات یہ تھی کہ ہماری بھابی لِلّی جو ایک معزز قبطی خاندان کی بیٹی تھیں، خواتین کلب قاہرہ کی سیکرٹری تھیں۔ یہ کلب کامل پاشا چوک میں ایک وسیع عمارت میں واقع تھیں۔ قاہرہ کی اعلیٰ سوسائٹی کی بیشتر خواتین اِس کی ممبر تھیں۔ ہم وید کے شہ بالے تھے اور سکتّر کے دیور، لہٰذا بیباکانہ آتے جاتے تھے۔ بھابی للّی کی بیسیوں سہیلیوں سے بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ان میں عیسائی بھی تھیں اور مسلمان بھی۔ سب معزز گھرانوں سے تھیں اور ایک سے ایک خوش وضع اور خوش پوش۔ لہٰذا وید کو اور مجھے کھٹکا لگا رہتا تھا کہ درما کوئی گُل نہ کِھلائے۔ احتیاطاً ہم نے درما کو قسم کھلائی جو اُس نے ہکلائے بغیر کھالی، لیکن درما کا اپنا دل پابندِ قسم سہی، حسین و جمیل روزی کے دِل پر تو کسی کو اختیار نہ تھا؛ چنانچہ ایک دن روزی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ پہلو سے دِل نکال کر درما کے ہاتھ پر رکھ دیا اور جذبات سے مجبور ہو کر اسے بھری مجلس میں کہہ دیا:

"مجھے تم سے محبت ہے اور سخت محبت ہے۔"

ہم نے مذاق میں اڑانے کی کوشش کی تو روزی نے اپنا دامن اشکوں سے بھر لیا۔

ہم نے بھابی للّی سے رجوع کیا تو روزی کا علاج یہ طے پایا کہ درما "یکے از معشوقات" کو روزی کے سامنے انگوٹھی پیش کرے تاکہ روزی درما کے دِل سے باہر نکال مارے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ ٹونا کامیاب ثابت ہوا اور روزی تیزی سے رُو بصحت ہونے لگی۔

خواتین کی کلب نے ہمیں قاہرہ کے کئی اُونچے گھرانوں سے متعارف کرایا۔ ہمیں خصوصاً مصری پاشا کا گھر کبھی نہ بھولے گا جن کے خوبصورت وِلّا واقع ہلیا پولس میں جانے کا کئی مرتبہ

اِتفاق ہُوا۔ اُن کی دو بیٹیاں حسن و عفت کی تصویریں تھیں۔ ہمیں ماننا پڑا کہ ہر چند کہ نچلے طبقے کے اخلاق جنگ کی نذر ہو گئے تھے اکثر اعلیٰ گھرانوں میں وہی پرانی قدریں تھیں۔ اُن کی بہو بیٹیاں طرحدار بھی تھیں اور وضعدار بھی۔ اُن کی ہم نشینی سے ایمان میں گڑبڑ کی بجائے تازگی آتی تھی۔ ان میں سے اکثر کالجوں میں پڑھتی تھیں۔ ہم سے گھنٹوں گرماگرم بحث کرتیں اور اپنی ملائم سی انگریزی میں (جس میں ٹٹ بٹ تت بت ہو جاتا ہے) بے حد لبھاتیں، لیکن اُن کے سامنے دریا تک دَم نہ مارتا۔

ایک دِن لاہور سے ہمیں اپنے ایک بزرگ نے خط میں لکھا کہ میرے ایک جگری دوست میجر "ن" قاہرہ میں جنرل ہیڈکوارٹر میں کام کرتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ وہ بھی تمہارے چچا ہیں۔ جس قدر جلد ہو سکے اُن سے مِلو اور پھر ملتے رہا کرو کہ بہت نیک آدمی ہیں۔ اب بہت نیک آدمیوں سے گولی کی سی تیزی سے جا مِلنا گستاخی ہوتی ہے؛ لہٰذا میں نے تعمیلِ ارشاد میں کچھ دیر کر دی تو اگلے خط میں لاہور سے ڈانٹ آئی کہ چچا جان سے مِلنے میں تامّل کیوں؟ وطن میں تو تم خاصے سعادت مند بیٹے تھے معلوم ہوتا ہے قاہرہ میں تمہاری صحبت کچھ ٹھیک نہیں۔ چچا جان سے مِلا تو قف مِلو۔

دریا سے ذکر کیا تو بولا: "ٹھیک ہے۔ پہلے پہر چچا جان کے پاس جانا اور اُن کے ساتھ شام کی نماز پڑھ کر گرا پی آ جانا۔"

مَیں نے کہا: "وہ شاید تہجّد کے لیے بھی ٹھہرا لیں۔ چلو اکٹھے چلتے ہیں۔ تمہارے بہانے رخصت جلد مِل جائے گی۔"

ہمارے ایک دوست میجر لال اِتفاق سے انکل "ن" کو پہچانتے تھے۔ مزید احتیاط کے طَور پر اُنہیں بھی ساتھ لے لیا۔ چلنے سے پہلے چچا جان کو فون کر دیا کہ میرے ساتھ دو دوست بھی ہوں گے۔

انکل "ن" نے قاہرہ کے ایک گنجان حصّے میں پانچویں منزل پر فلیٹ لے رکھا تھا۔ ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر ہوگئی اور کوئی رات کے آٹھ بجے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اُن کے دروازے پر جا دستک دی۔ ایک وقفے کے بعد دروازہ کھلا۔ ہمارے سامنے ایک ادھیڑ عُمر کا آدمی ململ کے کُرتے اور ریشمی لنگی میں ملبوس کھڑا تھا۔ پاؤں میں پوٹھوہاری زری جُوتا اور سر سے ننگا۔

میجر لال آہستہ سے بولے: "یہی انکل "ن" ہیں"

مَیں نے برخوردارانہ لہجے میں اپنا اور دوستوں کا تعارف کرایا۔ جواب میں انکل نے ہم تینوں کو اپنے دونوں بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا اور اندر لے چلے۔ ایک گیلری سے گزرے جس کے سِرے پر دروازہ تھا۔ انکل نے دروازہ کھولا تو ہمیں کمرہ اور اُس کی آرائش نظر آئی۔

قاریِ محترم۔ ذرا بُوجھیں کہ ہم نے اپنے نیک چچا کے ڈرائنگ رُوم میں کیا دیکھا۔ جائے نماز؟ تسبیح؟ کیا اُنھوں نے دیواروں پر اسلامی قطعات لگا رکھے تھے کہ روزِ محشر کہ جاں گداز بوَد۔ اوّلیں پرسشِ نماز بُود؟ یا وہاں الماریاں دَھری تھیں جن میں علم و حکمت کے موتی لیعنی ہمارے آبا کی کتابیں رکھی تھیں؟ جی نہیں۔ اِس کمرے کا نقشہ کسی قدر مختلف تھا۔ سارے فرش پر دیواروں تک ایرانی قالین پھیلا ہوا تھا اور کمرے کے عین وسط میں ایک براق چاندنی بچھی تھی جس کے گرد گاؤ تکیے رکھے تھے اور مرکز میں بلُّور کی کُھلے منہ کی صُراحی پڑی تھی جس میں چار نرم و نازک ہاتھ ایک مائع گرا رہے تھے۔ یہ مائع بیئر اور جنجر کی بوتلوں سے نکل کر شینڈی میں تبدیل ہو رہا تھا اور انڈیلنے والے ہاتھ چار حسین لڑکیوں کے تھے جن کے چہروں پر تو تبسم تھا لیکن بدن پر کچھ نہ تھا۔ مہمانوں کو دیکھ کر تعظیماً اُٹھیں۔ اہلاً وسہلاً کہا۔ باادب ایک ایک مہمان کا بازو تھام کر اُسے گاؤ تکیے کے ساتھ بٹھایا یا لِٹایا اور پھر صُراحی سے لبالب جام بھر کر پیش کیا۔

اِس اثنا میں میری برخورداری پسینہ کی صُورت پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہی تھی۔ معاذ اللہ

نگاہ انکل پر پڑی، لیکن اب وہ مہمانوں سے غافل ہو چکے تھے اور اپنے ساقی سے جام پر جام طلب کیے جا رہے تھے۔ انکل کوئی پچاس پچپن کے پیٹے میں تھے۔ ایک جرعہ پیتے اور شعر دُہراتے :

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر

تا سحر گاہ ز کنارِ تو جواں برخیزم

مَیں نے اپنے نیک انکل کو سرگرمِ عمل دیکھا تو میرا پسینہ اور تیز ہو گیا۔ مَیں نے اپنی "دُشمن ایمان و آگہی کے کان میں کہا کہ اگر ہو سکے تو مجھے تھوڑا سا لیمن سکواش پلا دو، ورنہ ساغر کو مِرے ہاتھ سے لینا کہ چلا مَیں۔ لیکن عمر خیام کے گھر میں لیمن سکواش کا کیا کام ؟ جب سحر ہُوئی تو انکل ابھی نہ جوان ہو پائے تھے اور نہ ان کے جاگنے کے ہی آثار تھے۔ چنانچہ انہیں بساطِ ہوائے دِل پر ہی لیٹے چھوڑ کر ہم کیمپ کو سُدھارے اور کیمپ میں آ کر پہلا کام یہ کیا کہ لاہور والے انکل کو خط لکھا کہ ہم نے اپنی نالائقی کی تلافی کر دی ہے اور انکل "ن" کی مُلاقات کی سعادت سے عاقبت سنوار لی ہے۔ چند روز کے بعد لاہور سے جواب آیا کہ شاباش جیتے رہو۔ ہم نہ کہتے تھے کہ صحبتِ صالح ترا صالح کُند ـــــــ

انکل "ن" سے تو ہماری پہلی مُلاقات آخری ثابت ہُوئی، لیکن معادی سے ہر دُوسرے قاہرہ جا ہی نکلتے تھے کیونکہ معادی میں انڈین ونگ کی زندگی کی رفتار ایک نرم خرام ندّی کی مانند تھی جس کی سطح پر کوئی بُلبُلا نہ اُبھرتا تھا اور سچّی بات ہے ایسی بے بُلبُلا زندگی ہمارے مزاج کو راس نہ تھی لیکن اچانک ایک دِن انڈین وِنگ کی خاموش زندگی میں ایک بُلبُلا نہیں ایک غلغلہ پیدا ہُوا اور ہمیں قاہرہ جانے کی نہ حاجت رہی اور نہ ہوش۔ کوئی دس بجے کے قریب اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کرنل صاحب نے فون پر اپنے دفتر میں طلب کیا۔ کرنل صاحب کی آواز میں واضح اِضطراب تھا۔ حاضر ہُوا تو مجھے سامنے بٹھا کر سنجیدہ لہجے میں کہنے لگے :

"کل شام ایک انگریز کارپورل اور ایک انگریز لڑکی معادی کلب کے قریب باغ

میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے کارپورل کو پستول کا نشانہ بنا دیا۔ آج صبح کارپورل ہسپتال میں مرگیا۔ لڑکی کا بیان ہے کہ قاتل شکل و صورت سے ہندوستانی نظر آتا تھا اور اس کے پاس اطالوی ساخت کا خودکار پستول تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قاتل تمہارے ونگ کا جوان ہو۔ ابھی جا کر اپنے جوانوں کو میدان میں "فال اِن" کرو۔ میں دس منٹ میں لڑکی کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔ وہ قاتل کی شناخت کرے گی اور شناخت کے بعد انڈین ونگ کے خیموں کی تلاشی بھی لی جائے گی کہ شاید پستول برآمد ہو سکے۔"

یہ سُن کر اُٹھا تو مجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ نہیں کہ اس بدقسمت کارپورل کی تفریح میں مخل ہونے والے ہم خود تھے بلکہ اس لیے کہ جس پستول سے یہ بدتمیزی کی گئی تھی اُسی ساخت اور حلیے کا پستول ہمارے خیمے میں بھی پڑا تھا ـــــ آپ کا اِس پستول سے تعارف ہو چکا ہے ـــــ اور عین ممکن تھا کہ دُوسرے خیموں کے ساتھ ہمارے خیمے کی تلاشی بھی لی جاتی۔

کرنل صاحب کے دفتر سے نکلا تو اپنے ونگ تک آتے آتے تجویزیں بناتا اور ڈھاتا رہا:

پستول کو نکال کر باہر ریت میں دفن کردوں؟ نہیں کوئی دیکھ لے گا۔

نزدیک کے کنوئیں میں پھینک دوں؟ نہیں کوئی سُن لے گا۔

اپنے دفتر میں الماری کے نیچے رکھ دوں؟ نہیں کوئی سُونگھ لے گا۔

پستول بالکل چھوٹا سا تھا، لیکن اگر سُوئی کے برابر بھی ہوتا تو اضطراب میں اُس کے تسلی بخش چھپاؤ کی کوئی تجویز ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ بہرحال سیدھا خیمے میں پہنچا۔ پستول نکالا۔ سلیمانی ٹوپی کی بے پناہ ضرورت محسوس کی کہ پستول کو پہنا کر سامنے میز پر رکھ دوں اور کوئی دیکھ نہ پائے۔ شناختی پریڈ کا وقت قریب تھا اور کچھ نہ سوجھی تو پستول کو اپنی نکر کی جیب میں ڈال لیا اور شناخت کے لیے چل پڑا۔

ڈنگ کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی تین قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور اتنے میں کرنل صاحب مع شناخت کنندہ حسینہ کے نکڑ سے نمودار ہوئے۔ ہم بحیثیت اوسی اُن کے استقبال کو ذرا آگے بڑھے اور معاً خیال آیا کہ ہم افسر سہی لیکن ہندوستانی ہیں اور کسی نہ کسی زاویے سے قاتل سے ضرور مشابہ ہوں گے۔ ناک اور کان بالعموم ہر ہندوستانی کے ایک ہی سانچے کے ہوتے ہیں اور ہم ہی پہلے ہندوستانی ہیں جن پر اس ٹیک بخت کی نگاہ پڑے گی۔ اگر اُس نے کہہ دیا کہ قاتل سے کچھ ملتا جلتا ہے تو ہمارا کیا بنے گا؟ اس کے بعد مزید ثبوت کے لیے ہمارے خیمے کی نہیں، بلکہ ہماری جیب کی تلاشی کافی ہو گی۔

جی چاہتا کہ کاش، استقبال کے دوران ڈکی سے علیک سلیک بھی ہو جائے مگر ہمارے چہرے پر نگاہ نہ ڈالے یعنی ہمارے چہرے سے کچھ ایسا جلال برسے کہ اُس کی دید کی تاب نہ لا سکے اور گردن سے اُوپر آنکھ نہ اُٹھائے لیکن جب قریب پہنچا تو اس بے باک فرنگن نے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمارے اندر کے راز بھی پا لیے۔ ظاہر تھا کہ ہمارے چہرے سے ابھی جلال کی بارش شروع نہیں ہوئی تھی لیکن اُدھر شناختی پریڈ شروع ہو گئی۔

لیڈی کے ساتھ ساتھ ہم بھی جوانوں کے سامنے سے گزر رہے تھے، لیکن یُوں معلوم ہوتا تھا کہ پستول جیب پھاڑ کر نیچے گرنے کو ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول تھام سکتا تھا لیکن کرنل صاحب کے سامنے جیب میں ہاتھ ڈالنا بدتمیزی تھی؛ چنانچہ جب تک پریڈ ختم نہ ہوئی ہم اپنی جیب کی استقامت کی دُعائیں مانگتے رہے جو بالآخر مستجاب ہوئیں۔ کیونکہ پریڈ ختم ہوئی تو ہمارے جوان بے گناہ ثابت ہوئے۔ خیموں کی تلاشی بھی ناکام رہی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم اسقاطِ جیب کی شرمندگی سے بچ گئے۔ کوئی دس دن بعد قاتل کسی دُوسری جگہ سے پکڑا گیا تو ہم نے اپنے بے گناہ پستول کو جو ناحق انڈر گراؤنڈ زندگی گزار رہا تھا، روشناسِ خلق کیا اور اُسے ٹوپی پہنائے بغیر ڈنکے کی چوٹ میز پر رکھ دیا۔

۱۶

قاہرہ ○ آخری ایّام

۱۹۴۳ء میں اِدھر ہم معادی میں اِنڈین ونگ کی کمان پر چھا رہے تھے اور اُدھر لیبیا میں لارڈ منٹگمری جرمنوں اور اطالویوں کو بھگا رہے تھے اور ہانکتے ہانکتے انہیں ٹیونس اور بزرتہ تک لے گئے تھے۔ آگے سمندر تھا۔ سمجھدار اطالویوں نے سمندر میں کود پڑنے کی بجائے پیچھے دیکھا اور ہاتھ بلند کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر میں بیسیوں قیدی کیمپ اسیروں سے بھر گئے۔ ایک کیمپ ہمارے قریب بلکہ بالکل ہمارے سایۂ عاطفت میں کھولا گیا جہاں سے اطالوی سپاہی ہماری خدمت کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ پرائیویٹ برزینی کو ہمارے خیمے اور اس کے مضافات کی تزئین کی ڈیوٹی ملی۔ یہی ڈیوٹی ہمارا مستقل اردلی سپاہی محمد اقبال بھی کرتا تھا اور ہزار دل سے مگر اُس کا اندازِ کار کچھ دہقانی سا تھا۔ جب برزینی کی آرائش خیمہ دیکھی تو دنگ رہ گئے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے خود لیونارڈو داونچی آ کر ہمارے خیمے کی مونالزا بنا گیا ہو۔ برزینی کی چابکدستی کی تحسین ہم نے وافر سگرٹوں سے کی جو جنگی قیدیوں کے لیے ایک نایاب نعمت تھے۔ چند روز گزرے تو برزینی نے ہمیں دلکش سا سگریٹ لائٹر پیش کیا۔ ہم نے "نہ، نہ، نہ" کی زنجیر کے ساتھ شکریہ واپس کیا تو برزینی آرام سے کہنے لگا:

"لے لیجیے، مَیں نے آپ ہی کی خاطر بنایا ہے۔"

مَیں نے حیرت سے پُوچھا: "تُم نے خود بنایا ہے؟ یہ تو رانسن کے کارخانے کا معلوم ہوتا ہے۔"

بولا: "رانسن مشین سے بناتا ہے مَیں نے اپنے ہاتھ اور اپنی ہتھوڑی سے بنایا ہے۔"

برزینی ایک ہنرمند نوجوان تھا اور بعد میں معلوم ہُوا کہ ہر اطالوی سپاہی کسی نہ کسی ہُنر میں ماہر ہوتا ہے۔ اطالوی سپاہیوں کا یہ معیار دیکھ کر اپنے سپاہیوں کا خیال آیا جو اکثر فنونِ لطیفہ کو چھُوئے بغیر ہی بالغ ہو جاتے ہیں لیکن سوچا کہ ایسا ہونا بُرا بھی نہیں۔ اگر فنونِ لطیفہ ہی ہمارے سپاہیوں کے لیے ذریعۂ عزّت ہوتے تو آج دُشمن افسروں کے لیے سگریٹ لائٹر تیار کر رہے ہوتے۔ سپاہی کا پہلا کام لڑنا اور دُشمن کے ساتھ وہ سلوک کرنا ہے کہ سگریٹ تو کیا پانی تک نہ مانگے اور اس ہنر میں سپاہی بہادر خاں اور نائک پہلوان خاں یکتا تھے اور ہیں۔

۱۹۴۳ء کے اواخر میں جنگ افریقہ سے نکل کر اٹلی جا داخل ہوئی تھی اور برزینی کے وطن کی حالت خاصی پتلی تھی۔ البتہ جرمن بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے اور ہٹلر مسولینی کو کندھے پر اُٹھا کر اہلِ روم کو بتا رہا تھا کہ تمہارا اِل ڈیوچے ہمارے ساتھ ہے لیکن اطالوی اب ہر قیمت پر امن اور سوئیوں کے لیے بیتاب تھے؛ چنانچہ ایک دن اچانک اطالوی فوجوں نے ہٹلر سے آنکھ بچا کر قرینے سے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ خبر ہم تک ایک عجیب انداز میں پہنچی۔

اس شام ہمارے مَیس میں بڑا ڈنر تھا کوئی سو سے زیادہ افسر کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ رسمی ڈنر تھا، خاموشی تھی اور افسر یُوں تن کر بیٹھے تھے کہ کپڑوں کے علاوہ جسم کو بھی کلف لگا کر آ گئے ہوں۔ اچانک ساتھ کے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ کسی بَیرے نے فون لیا تو دُوسری طرف سے مطالبہ ہُوا کہ کوئی افسر آ کر بات کرے۔ مَیں دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ اُٹھا اور جا کر رسیور کان سے لگایا۔ ایک ہیجان خیز سی آواز سنائی دی۔ بولنے والے کیپٹن جارج تھے ہمارے کیمپ کے ڈیوٹی افسر۔ مجھے پہچان کر کہنے لگے:

"خبر سُنی ہے ؟"

"کون سی خبر ؟"

"تو پھر نہیں سُنی اور سُنو : "OLD MUSSO HAS HAD IT" ○

پھر تشریحاً بتایا کہ اِٹلی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ذرا ڈائننگ ہال میں اِعلان کردو۔

مَیں ہال میں واپس آیا تو دروازے میں کھڑے ہو کر دانستہ طور پر ذرا ڈرامائی انداز میں بولا :

"حضرات توّجہ ! ابھی ابھی ڈیوٹی افسر نے خبر دی ہے کہ اِٹلی نے آج سات بجے ہتھیار ڈال دیے ہیں "

میرے مُنہ سے اِس جُملے کا نکلنا تھا کہ وسیع ہال میں ایک غلغلہ بلند ہُوا۔ تمام افسر مع ہمارے وضع دار کرنل صاحب کے کُرسیوں سے اُٹھے۔ جو کُچھ ہاتھ میں آیا : چھُریاں، کانٹے، پلیٹیں، نپکن، چھت کی طرف اُچھال دیا اور خود ناچنے لگے ـــــ انگریز عجیب جانور ہے سنجیدگی کے موقع پر کمبخت برف بن جاتا ہے۔ کیا مجال جو رسوم و قیود سے ہٹ کر بات کرے؟ لیکن تفریح کا مقام ہو تو اِس سے کوئی بے اعتدالی، کوئی بد پرہیزی اور کوئی بے وقوفی بعید نہیں۔ کُچھ دیر بعد ہنگامہ فرو ہُوا تو بیروں نے چھُریاں کانٹے چُن چُن کر دوبارہ آراستہ کیے ۔ کھانا ختم ہُوا تو شراب کے دَور شروع ہُوئے جو رات بھر جاری رہے ـــــ انگریزوں نے تو خیر دُشمن کو شکست دی تھی، ہم نے کیا پایا تھا ؟ غیر ارادی طور پر اس خوشی میں بھی غیر جانبدار ہی رہے۔ موقع پا کر باہر نکلے اور خیمے میں جا کر سو گئے۔

اگلی صبح برزینی سے مُلاقات ہُوئی۔ خیال تھا بے چارے شکست خوردہ برزینی کو ہمدردی پیش کریں گے، لیکن برزینی خوشی سے چہک رہا تھا۔ حیرت ہُوئی اور وجہِ انبساط پُوچھی تو بولا :

○ مسولینی کا بیڑا غرق ہو گیا ہے !

"جنگ ختم ہو گئی ہے۔ اب جلد ہی اپنی سویٹ ہارٹ سے ملوں گا۔"

اور یہ کہہ کر میری میز پر ایک مُسکراتی اطالوی لڑکی کی تصویر رکھ دی اور ساتھ ہی کسی قدر دعوے کے ساتھ کہنے لگا: "یہ میرا انتظار کر رہی ہے۔"

یہ دعویٰ دراصل برزینی کی اپنی تسلّی کے لیے تھا اور حقیقت میں انگریزوں کا گزشتہ رات کا طرب بھی اتنا قومی نہ تھا جتنا ذاتی۔ ہر انگریز کو یہی خیال تھا کہ وہ جو پیچھے انگلستان میں بیٹھی ہے، واقعی انتظار کر رہی ہے یا کسی دُوسرے نے اس انتظار کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انگریزوں کو امریکی سپاہیوں سے خصوصی خدشہ تھا جو ان دنوں انگلستان میں دخل در معقولات دے رہے تھے ——— جنگ میں زخمیوں اور مُردوں کی تعداد کا بڑی احتیاط سے ریکارڈ رکھا جاتا ہے لیکن ان دِلوں کا شمار نہیں کیا جاتا جو طویل جدائیوں اور ازلی مثلث کے کرشموں کی وجہ سے ٹوٹتے ہیں۔

شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

مجھے اس کرب کا اندازہ اس وقت ہُوا جب ایک عرصہ کے لیے مجھے اپنی یُونٹ کے گورے سپاہیوں کی ڈاک سنسر کرنے کی ڈیوٹی دی گئی۔ ہر چٹھی ایک آہ تھی۔ ہر سطر ایک فریاد۔

"میری محبوبہ، مجھے بُھلا نہ دینا۔"

"میری جان، میرا انتظار کرنا۔"

"میری دلرُبا، امریکنوں سے بچ کر رہنا۔"

مسولینی کی شکست میں ہر انگریز کو وہ لمحہ قریب نظر آیا جس سے پیشتر کہ اُس کی محبت پر کوئی غیر ڈاکہ ڈال دیتا۔ بس اتنی سی بات پر یہ اظہارِ طرب تھا لیکن دل کی دُنیا میں یہی تو بڑی بات ہے ——— انگریزوں کا یہ خوف بجا بھی تھا۔ ایک تو برطانوی اخباروں میں انگریز لڑکیوں اور امریکی سپاہیوں کی باہمی مؤانست کے قصے بلکہ تصاویر چھپتی تھیں جنہیں دیکھ کر انگریز

فوجیوں کے دِل چھلنی ہوتے تھے۔ دُوسرے خود قاہرہ میں اِن امریکیوں نے (جو ابھی ابھی نازل ہُوئے تھے) اپنے ڈالروں اور چیونگ گم کے طفیل تمام مصری معشوقاؤں کو انگریزوں سے چھین لیا تھا۔ وہی لڑکیاں جو قاہرہ کی رقص گاہوں اور ریستورانوں میں انگریز افسروں کی ہم نشینی پر کبھی ناز کرتی تھیں، اب جگالی کرتے ہُوئے امریکی سارجنٹوں بلکہ سپاہیوں کی بغل میں جوابی جگالی کرتے ہُوئے چلتیں اور پاس سے گزرتے ہوئے انگریز افسروں کو رحم اور حقارت کے مِلے جُلے جذبات سے دیکھتیں۔ بلکہ کئی شوخ طبع لڑکیاں انگریزوں کے جوشِ رقابت کو بھڑکانے کے لیے اپنے سینوں پر پیتل کے بنے ہُوئے حروف U.S.[○] لگا لیتیں۔ ——— یہ حروف امریکی فوجی اپنے کالر پر لگایا کرتے ہیں ——— انگریزوں سے اور کچھ بن نہ پڑا تو اِن لڑکیوں کو UNSERVICEABLE یعنی ناقابلِ استعمال کہنے لگے کہ برطانیہ کی فوجی لُغت میں U.S. اِسی لفظ کا مخفف ہے اور "کنڈم" مال کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ محض دِل کو جھُوٹی تسلّی دینے کی بات تھی۔ حاشا وہ لعبتانِ مصر کسی زاویے سے بھی ناقابلِ استعمال نہ تھیں۔ پھر جس بلندی پر اُنہوں نے یُو۔ ایس کا بِلّا لگا رکھا تھا، انگریزی پھبتی کی رسائی وہاں تک ممکن ہی نہ تھی۔

انگریزوں اور امریکیوں کی چشمک نے بےشمار لطیفے پیدا کیے۔ انگریز امریکیوں کو جنگی نقطۂ نظر سے اناڑی سمجھتے تھے اور اُن کے لیے اکثر YELLOW یعنی بُزدل کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ امریکی اِس پر ہنس دیتے اور اپنی چھاتیوں پر تمغوں کی طرف اِشارہ کرتے لیکن تمغوں کی عنایت کے مُعاملے میں خداوندانِ امریکہ بہت فیاض واقع ہُوئے ہیں۔ ایک امریکی سپاہی اگر دو سال نوکری کرلے تو اُس کی چھاتی پر قوسِ قزح اُتر آتی ہے۔ چنانچہ انہیں دنوں جب قاہرہ میں جنرل منٹگمری کی فتح لیبیا کے متعلق فلم دکھائی جانے لگی تو انگریزوں نے ازراہِ

○ UNITED STATES کا مخفف

تفنن مشہور کر دیا کہ امریکی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جو امریکی سپاہی فلم DESERT ○ VICTORY دیکھ لے گا اُسے تمغہ دیا جائے گا؛ لہٰذا سینما ٹکٹ کا کونٹر فائل ضائع نہ کیا جائے۔ امریکیوں نے اس مذاق کا جواب بعد میں سولونز کے مقام پر دیا جہاں جرمن گولوں کی بارش میں اُتر کر زورِ بازو سے جرمنوں کو میلوں دھکیل کر پیچھے لے گئے۔

اس کے بعد قیامِ قاہرہ کے دو ہی قابلِ ذکر واقعات ہیں۔ نومبر ۱۹۴۲ء میں لفٹیننٹ ورما کا اور دسمبر ۱۹۴۳ء میں ہمارا اپنا عازمِ وطن ہونا ______ ورما کی ہر حرکت میں ہنگامہ ہوتا تھا لیکن کہنے لگا کہ میری روانگی پرائیویٹ ہوگی۔ تمہارے بغیر کوئی الوداع کہنے نہیں آئے گا۔ میں اپنی جیپ میں اُسے قاہرہ سٹیشن کو لے چلا تو راہ میں کہنے لگا: "ذرا فیفی (FIFI) کو بھی ساتھ لے لیں۔ میں نے اُس سے وعدہ کر رکھا ہے۔"

فیفی ورما کی چہیتی دوست تھی؛ چنانچہ فیفی کو بھی ساتھ بٹھا لیا لیکن اسٹیشن پر پہنچے تو دیکھا کہ تین اور فیفیاں علیحدہ علیحدہ کھڑی ہیں۔ ورما کو علم نہ تھا کہ اُس کی باقی معشوقائیں بھی اُسے الوداع کہنے آئیں گی۔ اُدھر ہر ایک یہی سمجھے بیٹھی تھی کہ وہی ورما کی واحد دوست ہے جو خدا حافظ کہنے کو پہنچی ہے۔ چنانچہ جونہی اُنہوں نے ورما کو دیکھا، مختلف سمتوں سے اُس کی طرف بڑھیں۔

وہ جو سب سے پہلے پہنچی، ورما سے لپٹ گئی اور تڑاخ سے ورما کے رُخسار پر ایک باآواز بوسہ داغ دیا۔ اصلی فیفی سے یہ دیکھا یا سُنا نہ جا سکا تو اُس نے بوسہ گیر فیفی کے ایک تھپڑ لگا دیا اور اُس سے گُتھم گُتھا ہوگئی۔ ورما انہیں علیحدہ کرنے لگا، تو ایک تیسری فیفی آگے بڑھی اور ورما کو اپنی طرف کھینچ کر بولی کہ "جانے دو ان جھگڑالو بلیّوں کو، اب مجھے الوداع کہنے دو۔" لیکن بیچاری الوداعی رسوم کی ابتداء بھی نہ کر پائی تھی کہ آخری اور چوتھی فیفی نے حقِ شفعہ

○ یعنی صحرائی فتح۔ یہ جنرل منٹگمری کی فتوحات کے متعلق انگریزی فلم تھی۔

کے طور پر ورما کو پیٹی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ غریب ورما میدانِ جنگ سے تو سالم واپس آ گیا تھا لیکن میدانِ محبت میں اُس کے پُرزے اڑنے لگے۔ دیکھنے والوں کو رحم آیا تو منہ زور فیفیوں کو یکے بعد دیگرے لگام دی اور ورما کو بمشکل ریل کے ڈبے تک پہنچایا۔

ورما ڈبے میں بیٹھا ہی تھا کہ اُس فیفی نے جو سب سے پہلے سنبھلی اپنی انگوٹھی اتار کر ورما کے منہ پر دے ماری۔ یہی حرکت دُوسری اور پھر تیسری فیفی نے کی اور پلیٹ فارم سے باہر چل دیں۔ ورما ان نبرد پیشہ معشوقوں کی قطار کو جاتے دیکھ کر غالبؔ کی ہمنوائی میں کہہ سکتا تھا:

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

مگر وہ جو اصلی فیفی تھی اُس کی محبت اُس کے جذبۂ رقابت پر غالب آئی۔ لپک کر ڈبے میں پہنچی۔ اگرچہ خود بھی خستہ تن تھی لیکن بڑھی اور رنجور مسافر کے سر کو اپنی آغوش میں لے کر اُس پر گھنی پلکوں کا سایہ کر دیا۔ غریب ورما نے قدرے آسودگی محسوس کی اور آنکھ کھولی۔

بیٹھ جاتا ہُوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

لیکن ایک بات واضح تھی کہ غریب الوطنی میں اتنے وسیع پیمانے پر عاشقی کرنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد گاڑی سویز کو روانہ ہونے لگی تو فیفی نے ڈبے سے اُتر کر ایک نذر رومال ہلانا شروع کیا۔ ہم نے یہ منظر دیکھا تو ہمیں اپنے دوست کی جُدائی کے علاوہ بیکسیٔ عشق پر بھی بے اختیار رونا آیا۔

کوئی مہینہ بھر بعد اسی ٹرین سے ہم عازمِ وطن ہُوئے۔ خدا جانے یہ افسوس کا مقام ہے یا فخر کا کہ ہم نے کسی فسٹ ایڈ کے استعمال کے بغیر قاہرہ کو الوداع کہا۔

۱۷

مراجعت بہ وطن

۲۳ دسمبر ۱۹۴۲ء کو جب ہمارا جہاز ایسکینیس (ASCANIUS) سویز کی بندرگاہ سے بحیرہ قلزم کو روانہ ہوا تو ہم اس کے سینکڑوں انگریز مسافروں میں تقریباً واحد دیسی تھے لیکن جس خوشی سے یہ واحد دِل مچل رہا تھا وہ اِن سینکڑوں انگریزی دِلوں کو میسّر نہ تھی۔ وجہ صاف تھی کہ ہم جنگ سے وطن کو لوٹ رہے تھے اور انگریز وطن سے جنگ کو جا رہے تھے یعنی برما کے محاذ پر۔ اس روز ہمارے لیے پُورے اڑھائی برس کے بعد وطن کی دید کا خیال کس قدر نشاط انگیز تھا! اِتفاق سے اس سمندری سفر میں ہماری تفریح کے سامان ہماری توقع بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ نکلے لیکن مراجعتِ وطن کی مسّرت اِن عارضی خوشیوں سے بالا اور برتر رہی۔

ہمارے ہم سفروں میں خاصی تعداد خاکی پوش انگریز لڑکیوں کی بھی تھی جو ہندوستان اور برما میں مختلف جنگی خدمات کے لیے جا رہی تھیں یعنی کچھ نرسیں، کچھ ڈاکٹر، کچھ سیکرٹری وغیرہ۔ اگرچہ اِن میں سے کئی ایک خاکی وردی میں بھی خورشید و ماہ لگتی تھیں، لیکن وہ جن کے دم سے یہ دہ روزہ سمندری سفر ایک گلگشت میں بدل گیا یہ باوردی اجرامِ فلکی نہ تھیں بلکہ انسا ⭘ (ENSA) کے باکمال ایکٹر اور باجمال ایکٹریسیں جو اِسی جہاز میں برما کے محاذ پر اپنے برٹش ٹامیوں کو تفریح بہم

⭘ انٹرٹینمنٹس نیشنل سروس ایسوسی ایشن

پہنچانے جارہی تھیں۔ جنگی خدمت کے سلسلے میں یہ برطانوی تھیٹر کی پیش کش تھی۔

مسلسل جنگ اور مورچہ گیری سے سپاہی ایک رُوحانی فاقے کا شکار ہو جاتا ہے جو دُشمن کی گولی سے بھی مہلک تر ہوتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے بیچارے کو جس دل پہ ناز ہوتا ہے وہ دل نہیں رہتا۔ یہ انسا کمپنیوں کے تماشے اِسی بے دِلی کا درماں تھے۔ جنگ میں سپاہی کے لیے عورت کی دید سے بڑھ کر کوئی دوائے دل نہیں اور انسا کی ایکٹریسیں اس نکتے سے آشنا تھیں یا آشنا کر کے بھیجی جاتی تھیں۔ چنانچہ جب کبھی دیدارِ عام کا اہتمام کرتیں تو کچھ چھپا کر نہ رکھتیں۔ اُن دنوں ٹاپ لیس سُوٹ کا رواج نہ تھا تاہم کسی سپاہی نے انسا کی ایکٹرسوں سے یہ شکایت نہ کی کہ

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

یہی رعایتیں اِس سمندری سفر میں بھی روا تھیں بلکہ کرسمس کے موسم کی وجہ سے اتر کر دی گئی تھیں۔ اِس موسم میں انگریز پاسبانِ عقل کو تنہا ہی نہیں چھوڑتا بلکہ دھکا دے کر اُسے سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔ چنانچہ پورے سفر میں صبح سے شام تک تفریحات کا سلسلہ تھا کہ ختم نہ ہونے پاتا تھا۔ جرمن آبدوزوں کا خطرہ تھا لیکن اس کا احساس سوائے سنتری کے کسی کو نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ جرمن آبدوزوں کے کپتانوں کو اگر ہمارے جہاز کے حالاتِ دروں کا علم ہوتا تو تارپیڈو بھیجنے کی بجائے خود کھنچے آتے۔ بہرحال سارے سفر میں دُشمن کی آبدوز کے متعلق صرف ایک ہی الارم ہوا اور الارم ہوتے ہی اہلِ جہاز نے پینے، ناچنے اور گانے کی رفتار اور تیز کر دی تاآنکہ "آل کلیئر" کا سگنل ملا اور سکون کے وقفے کا اعلان ہُوا۔

سفر کی ایک رات یعنی ۳۱ دسمبر کی رات بھُولنے کی نہیں۔ سالِ نو کے خیر مقدم کی تقریب تھی۔ اُس شب عقل کے ساتھ شرم کو بھی غرقِ دریا کر دیا گیا اور دِلوں کو جُملہ رسوم و قیود سے سپیشل چھُٹی ملی۔ نیم شب کی ساعت آئی تو اہلِ جہاز کے جنون کا سلسلہ اس قدر دراز ہو چکا تھا کہ دامن کے چاک اور گریبان کے چاک کا فاصلہ ناپید تھا۔ اس بے حجابی میں خواتین نے دُوسرا

تمبر لینا گوارا نہ کیا۔

مَست کب بندِ قبا باندھتے ہیں !

۴ جنوری ۱۹۴۴ء کی صبح کو ہمارا جہاز آہستہ آہستہ بمبئی کی گودی میں داخل ہُوا۔ میں ایک مختصر سی نیند سے جاگا تو پورٹ ہول سے خشکی نظر آئی۔ ایک بیتابی کے عالم میں کپڑے پہنے، عرشے پر پہنچا۔ ارضِ ہند پر نگاہ پڑی تو آنکھوں میں دفورِ مسّرت سے آنسو چھلک اُٹھے اور جب بالآخر خاکِ وطن ○ پر پاؤں رکھا تو خُدا جانے کتنی دیر احساس رہا کہ پاؤں کی بجائے جبین کیوں نہ رکھ دی۔

بمبئی میں ہمیں ٹرانزٹ کیمپ میں ٹھہرایا گیا۔ یہ وہی کیمپ تھا جہاں اڑھائی سال پہلے ہماری دُعا کو کسی بابو مزاج فرشتے نے محض ٹائپ کی غلطی کی وجہ سے خُدا تعالیٰ تک جانے سے روک دیا تھا اور ہمارا سمندر پار کا سفر نہ ٹل سکا تھا۔ بہرحال اب خوش تھے کہ نہ صرف جنگ سے بچ کر آ گئے تھے بلکہ کسی قدر سچا لہو لگا کر انگریزی غازی بھی بن چُکے تھے اور طبیعت میں ایک قسم کی خان بہادری محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ کیمپ کے دفتر میں داخل ہُوئے تو اندر اس بے تکلفی سے قدم رکھا گویا صاحبِ خانہ ہمیں ہیں اور انگریز کمانڈانٹ نے بھی ہمیں خوش آمدید کہا تو اِس تپاک سے گویا ملک معظّم نے ذاتی طور پر ہماری خاطر ہدایات بھیجی ہوں۔ مُلاقات کے دوران ہمیں کمانڈانٹ صاحب نے سگنل ٹریننگ سنٹر سیالکوٹ میں تقرر کا حکم نامہ دیا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے ایک ماہ کی رُخصت کا مژدہ بھی سنایا اور اسی شب فرنٹیر میل سے ہماری نشست کا انتظام بھی کر دیا۔

دُوسرے روز لاہور پہنچے۔ ہماری منزل تو آگے چکوال تھی جہاں سے اُتر کر اپنے گاؤں بل کسر ⊖

○ اُس وقت پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

⊖ بل کسر ایک دلکش سا قصبہ ہے جو چکوال سے بارہ میل مغرب میں واقع ہے اور اپنے تیل کے چشموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک تیل کے چشمے بل کسر کی وجہ سے مشہور ہیں۔

جانا تھا لیکن گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر رُکی اور ہم نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ہمیں وہی کالج کے دنوں کے مانوس درو دیوار نظر آئے۔ وہی رس بھری پنجابی آوازیں کانوں میں پڑیں اور وہی جھاگ بھری قمیصیں اور شلواریں دکھائی دیں۔ ایک غیبی طاقت نے ہمیں لاہور اترنے پر مجبور کر دیا۔ اسٹیشن سے نکل کر چلے تو پہلی دفعہ محسوس ہُوا کہ لاہور کے کُوچوں میں چلنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے لاہور ٹھہرے۔ ٹھہرے کیا، اپنے آپ کو لاہور کے سپرد کر دیا اور یوں محسوس ہُوا جیسے ہولے ہولے لاہور ہماری سہ سالہ اجنبیت کو دھو کر ہماری باضابطہ تطہیر کر رہی ہے۔

دُوسرے روز گھر پہنچے تو چھوٹوں کو بڑا پایا اور بڑوں کو اور بڑا لیکن گاؤں کی بڑی خبر یہ نہ تھی کہ ہم نے انہیں کیسا پایا بلکہ یہ کہ ہم خود کیسے پائے گئے۔ خبر مشہور ہو گئی کہ کپتان آگیا ہے ـــ محمد خان آگیا ہے۔ کتنا دُبلا پتلا تھا، اب دیکھو کیا جوان نکلا ہے۔ صاحب بن گیا ہے۔ سگرٹ بھی پیتا ہے۔ سکوٹ میں کھانا کھاتا ہے۔ نوکری پہرہ بھی معاف ہے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے چلتے کام چھوڑ کر ملاقات کو آنے لگے۔ ہم نے پہلے دو دن میں کوئی ایک ہزار معانقے کیے ہوں گے اور بس اتنی ہی ہمارے گاؤں کی مردانہ آبادی تھی۔ چھاتی دُکھنے لگی لیکن دل کو ایک عجیب سُکھ حاصل ہوا۔ مہینے بھر میں صرف چند روز اپنے گھر سے کھانا کھایا اور وہ بھی والدہ کے اصرار پر کہ مجھے اپنے بیٹے کو جی بھر کر دیکھ لینے دو اور جب بہت دیر دیکھ چکیں تو وہی کچھ کہا جو صرف ماں ہی کہہ سکتی ہے: "بیٹا، اب ساری فوج میں تم ہی بڑے افسر ہو نا؟"

میں والدہ کو دیکھتا اور سوچتا کہ اگر اس پیکرِ محبت کا وجُود نہ ہوتا تو کیا مجھے وطن کی واپسی کا یہی اشتیاق ہوتا؟ بغیر کسی جھجک کے جواب دیا: "جی ماں! ایک آدھ چھوڑ کر سب میرے ماتحت ہیں۔" اور ماں کی دُنیا آباد ہو گئی۔ ویسے سچ یہ تھا کہ ایک آدھ نہیں، بلکہ ایک لاکھ چھوڑ کر بھی ہمیں اپنے ماتحت ڈھونڈنے کے لیے چراغ بلکہ سرچ لائٹ کی ضرورت تھی لیکن وہ سچ کس کام کا جس سے ماں کا دِل دُکھے؟

۱۸

سیالکوٹ میں ایک سال

مہینے کی چھٹی پل بھر میں گزر گئی۔ سیالکوٹ کی تیاری کی۔ معادی کے سگنل سکول میں ہم نے جس کیپٹن اُودڑا سنگھ کی جانشینی کی تھی وہ اِن دنوں سگنل ٹریننگ سنٹر سیالکوٹ میں متعین تھے انہیں تار دیا کہ پہلے روز آپ کے یہاں ٹھہروں گا اور روانہ ہُوا۔

اُودڑا سنگھ قیامِ قاہرہ کے دِنوں میں اپنی بیوی کی بدصُورتی کے قصّے سنایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ مقابلہ حُسن کرانے والے کبھی بدشکل خواتین کا مقابلہ بھی کرا ڈالیں تو مسز اُودڑا سنگھ کے ملکہ منتخب ہونے کا نہایت قوی اِمکان ہے اور پھر اپنی بیوی کے حق میں ایک غائبانہ آنکھ مار کر شرارتاً یہ مصرع الاپتے:

جتھّے لچھّی پیر رکھ دی، اُو تھے اُگ دا سرُو دا بُوٹا ○

مَیں یہ سمجھ کر مُسکرا دیتا کہ شاید یہ سردار جی کی دل لگی کا انداز ہے ورنہ سردارنی بالکل بے قصُور ہوگی۔

لیکن سیالکوٹ پہنچا اور بھابی جان کو دیکھا تو کیپٹن اُودڑا سنگھ کی خوش گوئی کے علاوہ اُن کی مظلومیت اور نفس کشی پر بھی یقین آگیا۔ ظاہر تھا کہ محترمہ کج رُخانِ جہان میں بہت اُونچا

○ جہاں لچھی پاؤں رکھتی ہے وہاں سرو کا پَودا اُگ آتا ہے۔

مقام رکھتی ہیں۔ ذاتی کشش کا یہ عالم تھا کہ اگر موصوفہ رُخِ روشن کے سامنے شمع کی بجائے بھینس کھڑی کر کے پروانے کو دعوتِ انتخاب دیتیں تو پروانہ بے تحاشہ بھینس سے چمٹ جاتا۔ ویسے کیپٹن صاحب کو ایک اطمینان تھا کہ اگر کسی وجہ سے اُنہیں محترمہ کو شہر یا بَن میں تنہا بھی چھوڑنا پڑا تو اُن کی عصمت کا بال بیکا نہ ہوگا۔ کپتان صاحب دوست پرور آدمی تھے۔ ہر نئے دوست کو گھر لے جانے سے پہلے آنے والے صدمے سے آگاہ کر دیتے تھے کہ اچانک تعارف سے غریب کا دل فیل نہ ہو جائے۔ میں تو ایک سال سے اِس حادثے کی تیاری کیے بیٹھا تھا، لہٰذا میرا دل فی الحال متحرک تھا۔

بعد میں جب مسز اُوڑا سنگھ سے مزید واقفیت ہُوئی تو معلوم ہوا کہ کپتان صاحب اتنے بدنصیب نہ تھے جتنے ہم سمجھتے تھے۔ مسز اُوڑا سنگھ نے تقسیمِ حُسن کے وقت بیشک شدید غفلت برتی تھی لیکن عقل بٹتے وقت اِس خاتون نے مستعدی کے علاوہ کسی قدر سکھا شاہی سے بھی کام لیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دنیوی مُعاملات میں افلاطون کو بھی دو چار کام کی باتیں بتا سکتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ماجھے کی صحت مند جٹی تھی۔ عقل اور صحّت کی اِس نادر آمیزش نے ایک اور قسم کا حُسن پیدا کر دیا تھا جو حُسنِ صورت سے کہیں زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ چنانچہ بعد میں مسز اُوڑا سنگھ کے احترام میں اُن کی شکل کبھی حائل نہ ہُوئی۔

دُوسرے روز دفتر گئے۔ کمانڈانٹ صاحب سے مُلاقات ہوئی۔ بولے:

"اچھّا ہوا تُم وقت پر آ گئے۔ کیپٹن رینر (RAINER) آج ہی رُخصت ہو رہا ہے۔ اس سے چارج لے لو۔"

مَیں سمجھا کوئی کمپنی ملے گی اور مزے سے کمان کریں گے، مگر رینر کے پاس پہنچا تو کوئی گز بھر لمبے اور اتنے ہی چوڑے رجسٹر، بہی کھاتے، رسیدیں اور کچھ نقدی اٹھا لایا اور میرے حوالے کرتے ہُوئے بولا:

○

"WITH LOVE TO THE NEW ACCOUNTS OFFICER"

مجھے معلوم تھا کہ فوج میں لڑنے کے علاوہ بیسیوں قسم کے دُوسرے پاپڑ بھی بیلنے پڑتے ہیں لیکن ایک لاغر سی اُمید تھی کہ ابھی اِن حسابانی پاپڑوں سے ذرا محفوظ رہوں گا، لیکن اب جب کہ بیلنا ہاتھ میں تھا اور پاپڑ سامنے رکھے تھے کوئی مفر نہ تھا۔ چُپکے سے چارج پر دستخط کر دیے اور سگنل ٹریننگ سنٹر کے اکاؤنٹس افسر بن گئے۔

رجسٹر کے اندر جھانکا تو معلوم ہوا کہ اکاؤنٹس افسری تو سراسر علم دریاؤ ہے۔ مثلاً یہ کہ اِس میں کوئی جادُو ہے جس کا نام ڈبل اِنٹری ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سنڈری کریڈیٹر کہلاتے ہیں اور کبھی سنڈری ڈیٹر بن جاتے ہیں۔ حیران ہو کر سوچا کہ الٰہی یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں اور یہ ہنگامہ اَے خدا کیا ہے۔ لیکن قصّہ مختصر اکاؤنٹنگ کے جُملہ اسرارِ نہاں ہم پر آخر تک آشکارا نہ ہو سکے۔ ہفتہ بھر کی بے نتیجہ جمع تفریق کے بعد اپنے دِل سے کہا کہ میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟ بہی کھاتے اُٹھا کر سیدھا خداوندِ سنٹر کے پاس پہنچا اور عرض کی کہ اکاؤنٹس افسری اِس خاکسار کے بس کا کھیل نہیں۔

خداوند نے مُسکرا کر فرمایا: "بغیر بس کے ہی کھیلو۔"

اور ہمارا کندھا تھپکا کر رجسٹر ہمارے حوالے کیے۔ واپس دفتر میں آیا اور اپنے یُونٹ اکاؤنٹنٹ جگدیش لال سے پُوچھا:

"میاں! بغیر بس کے اکاؤنٹس کیسے کھیلے جاتے ہیں؟"

مُسکرایا اور بولا: "جیسے آپ سے پہلے رینز صاحب کھیلتے تھے۔"

اِس کے بعد جگدیش لال رجسٹر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد مکمل کر لایا اور بولا: "جہاں ضرب کا نشان ہے ذرا دستخط کر دیں۔" دستخط ہو گئے تو کہنے لگا:

○ نئے اکاؤنٹس افسر کی خدمت میں محبّت کے ساتھ

"آج کا کام ختم سمجھیں۔"

خدا کا شکر ہے جگدیش لال دیانتدار آدمی تھا جس کے سہارے ہم نے سال بھر نمایاں کامیابی کے ساتھ اکاؤنٹس افسری کی۔ پھر اچانک ایک نئے کپتان صاحب سنٹر میں تشریف لے آئے اور ہم نے اپنے پیش رُو کی تقلید کرتے ہُوئے تمام تر رجسٹر اور بہی کھاتے مع اپنی بے پایاں محبّت اور خلوص کے اُن کے سپُرد کر دیے اور کلمۂ شکر پڑھا۔ ویسے اگر آپ سنٹر کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ہماری اکاؤنٹس افسرانہ خدمات کا ذکر سنہری الفاظ میں رقم ہو گا۔

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھُلا

سیالکوٹ کی زندگی میں محاذِ جنگ کی تکالیف نہ تھیں لیکن جنگ کے تکلفات تمام تر موجود تھے۔ مثلاً بغیر وردی کے گھر سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ کلب جاؤ تو وردی میں اور بازار جاؤ تو وردی میں۔ سفید شریفانہ کپڑے پہن کر باہر نکلنے کو دل ترس گیا تھا چنانچہ کئی مرتبہ رات کو گھر کی تنہائی میں سُوٹ پہنا، آئینے میں دیکھا، دو حسرت کی آہیں بھریں۔ سُوٹ اتار کر صندوق میں بند کر دیا اور مُنہ بسور کر پھر خاکی وردی پہن لی۔ گویا اپنی کپتانی کا اشتہار زیبِ تن کر لیا۔

زندگی کی بے شمار چھوٹی چھوٹی خوشیاں صرف گمنامی میں ہی میسّر آ سکتی ہیں۔ مثلاً چوک میں کھڑے ہو کر سلاجیت بیچنے والے کا لیکچر سُننا اور علی الاعلان نسخہ بنوانا؛ بندریا کا ناچ دیکھنا اور کھلکھلا کر ہنسنا؛ اُستاد گام کی دُکان سے سرِ بازار کباب کھانا اور اپنی آسودگی کی تصدیق ایک برہنہ ڈکار سے کرنا، سکینڈل پوائنٹ پر کھڑے ہو کر ڈنکے کی چوٹ دِل کی دھڑکن سُنانا اور اور گالی کھا کر بے مزا نہ ہونا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوچۂ دلدار کے چکر کاٹنا اور شکل وصُورت

سے یُوں دکھائی دینا جیسے خدمتِ خلق کے لیے مارے مارے پھر رہے ہوں ـــــ لیکن فوجی یونیفارم پہنی ہو جو کلف سے کڑکڑا رہی ہو اور کپتانی کا آبگینہ شانوں پر اُٹھا رکھا ہو تو پہلا کباب کھاتے ہی، پہلی دھڑکن دھڑکتے ہی اور پہلا چکر کاٹتے ہی یہ آبگینہ چُور سمجھیں اور اگر کورٹ مارشل کی نوبت آگئی جو ضرور آنی چاہیے تو پھر کپتانی ہی کا فور سمجھیں۔ چنانچہ ہم فقط ان خوشیوں کی ہی تمنّا کر سکتے تھے جن تک باوردی رسائی ممکن تھی۔ سوائے اس کے کہ کوئی خوشی یا ناخوشی از خود غریب خانے پر آدستک دے۔

اور کرنا خُدا کا کیا ہُوا کہ ایک دن ہمارے بنگلے کے صحن میں ایک تانگہ آکر رُکا۔ تانگے میں سامنے کی نشست پر کوچوان کے علاوہ ایک خاصی معمر خاتون سوار تھیں۔ تانگے سے اُترے بغیر مجھ سے مخاطب ہوئیں :

"تُم ہو نا کپتان ؟"

عرض کیا : "جی ہاں، ارشاد ؟"

اور حیران تھا کہ خدا جانے آج کس بلا نے خانۂ انوری کو انتخاب کیا ہے۔ بڑی بی نے جواب میں بے تامّل پتھّر دے مارا :

"تو شرم نہیں آتی ؟ اس بچّی کا دل توڑ دیا۔"

یہ کہہ کر محترمہ نے ایک دِلسوز سی آہ بھری اور پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ بچّی بیٹھی تھی۔ مَیں نے اِس بچّی کو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا لیکن اب دیکھا تو ایسی بچّی بھی نہ تھی۔ کوئی اٹھارہ سال کا سِن، شکل کی شریف مگر آنکھوں کی شریر۔ وہی کانونٹ سکول کی آزادی اور خود اعتمادی کی مہر لگی ہُوئی۔ خیر، کوئی بھی ہو، ظاہر تھا کہ غلط فہمی کا مُعاملہ ہے لیکن اُدھر بی امّاں کی نگاہِ غضب میرے جسم و جان کے ساتھ دِل و وجود کو بھی چیر کر پار ہو رہی تھیں۔ چنانچہ مَیں نے بچّی صاحبہ کی خدمت میں خاموش اپیل کی کہ آپ ہی امّاں حضور کا مغالطہ دُور کر دیں،

لیکن چھوٹی محترمہ نے جواب میں غیر جانبداری سے مسکرا دیا اور تماشہ دیکھنے لگیں۔ بڑی بی نے برسنا جاری رکھا۔

" دو دن سے انتظار کر رہے ہیں۔ اب آتا ہے، اب آتا ہے۔ یہ ہوتے ہیں لچھن ہونے والے دامادوں کے؟ کہاں ہے تمہاری امّی؟"

تو یہ بات تھی! ہم نے بی امّاں سے آنکھ بچا کر بچی کو صاف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پُرزور غیر تحریری احتجاج کیا۔ جواب میں چھوٹی بی نے فقط انگریزی میں شانے سکیڑے اور آسمان کو تکنے لگی۔ گویا کہتی ہو: " یہ معرفت کا معاملہ ہے مجھ سے مت پوچھ۔ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی۔" ہم نے ایک لمحے کے لیے من میں ڈوبنا شروع کیا تو چھوٹی بی نے ہماری سادگی پر ایک ہلکا پھلکا قہقہہ لگا دیا۔ یوں جیسے غلطی سے طبلے پر تھاپ پڑ جائے۔ اِس پر بڑی بی چونک پڑیں اور بولیں:

" اری چھوکری تو ہنس رہی ہے! ابھی تو رو رہی تھی۔"

" نانی جان، یہ کیپٹن ظفر نہیں ہیں، کوئی اور ہیں۔" بچّی نے ہنسی کو آدھا روکتے ہوئے کہا۔

" کوئی اور ہیں؟ پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہائے میں نے کتنی غلطی کی۔"

بچّی بولی: " کوئی بات نہیں نانی جان، یہ بھی ہنس رہے ہیں۔"

مَیں ہنس تو نہیں رہا تھا؛ البتہ ہنسی روکنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا۔

نانی جان بولیں: " بیٹا معاف کرنا، میری نظر کمزور ہے۔"

نانی جان کی نظر بے شک کمزور تھی لیکن آپ کی زبان ماشاءاللہ خاصی شہ زور تھی جسے آسانی سے معاف نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اب ہم بھی سراغ پا چکے تھے لہٰذا معاف کرنا ہی پڑا۔ اور سُراغ یہ تھا کہ یہ خواتین ہمارے دوست ظفر کی منگیتر اور منگیتر کی نانی تھیں اور یہ ڈرامہ ظفر اور ہماری ہونے والی بھابی کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہم نے ظفر کی برات میں شمولیت کی یہ شرط

رکھی تھی کہ ہمیں بھابی جان پیشگی دکھائی جائیں۔ سو ہمیں بھابی جان تو دکھادی گئیں لیکن اس انداز سے کہ ہمارا نانی جان سے بلوہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بے چاری نانی جان کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اِس ڈرامے میں اُن کا کردار محض قربانی کی نانی کا ہے۔

ایک اور بلا خانۂ انوری کی بجائے انوری کے راستے میں آ نمودار ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں سینئر افسر اکثر انگریز ہی ہوتے تھے۔ ہندوستانی زیادہ تر لفٹین تھے یا کپتان۔ کوئی بھولا بھٹکا میجر بھی نظر آجاتا تھا لیکن کالا لفٹیننٹ کرنل کالے گُلاب کی طرح تقریباً ناپید تھا۔ ایک روز دوپہر کی چھٹی کے بعد سائیکل پر میس کو جا رہا تھا کہ سڑک پر سامنے سے ایک اور سائیکل سوار آتا دکھائی دیا۔ پاس سے گزرا تو لفٹین سا نظر آیا جس کے کندھے پر دو پھول ہوتے ہیں۔ ابھی چند گز ہی آگے نکلا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی:

"HEY, COME HERE" (" ارے۔ اِدھر آؤ ")

مُڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اِس گستاخ ندا کے منادی ہم ہی ہیں۔ حیران کہ یہ صاحب خود کیوں نہیں آجاتے۔ بہرحال ہم ہی بیس قدم پیچھے چل کر اُن تک گئے اور دیکھا کہ اُن کے کندھے کے دو پھولوں میں سے ایک تاج ہے۔ یعنی جناب لفٹیننٹ نہیں لفٹیننٹ کرنل ہیں۔ معاً ہمارا ہاتھ سیلوٹ میں اُٹھ گیا اور سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے ہم مؤدبانہ کرنل صاحب کے سامنے اٹن شن ہو گئے۔

اِرشاد ہُوا: "جب ہم سامنے آرہے تھے تو سیلوٹ کیوں نہیں کیا تھا؟"

کرنل صاحب نے ذرا غیر متوقع پتھر کھینچ مارا تھا۔ فوج میں سینیئر افسر کو سیلوٹ نہ کرنا جُرم ہے اور اسے جونیئر سے بازپرس کا حق ہے۔ لیکن تجربہ کار افسر اس حق کو عقلمندی سے استعمال کرتے ہیں۔ یعنی جہاں ضبط کا تقاضا ہو سختی سے گرفت کرتے ہیں، لیکن جہاں یہ فروگزاشت اتفاقاً یا سہواً ہو جائے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ کرنل صاحب کوئی دُوسری قسم کے سینیئر

تھے۔ مَیں جواب دینے میں ذرا جھجکا تو آواز بلند کرتے ہُوئے بولے:

"بولو، سیلوٹ کیوں نہیں کیا تھا؟"

عرض کیا: "میں آپ کا رینک نہیں پہچان سکا تھا۔"

کرنل صاحب رُعب اور فخر سے چُور ہو کر اپنے دائیں کندھے کے تاج کی طرف ترچھی نگاہ کرتے ہوئے بولے:

"تمہیں تاج اور پھول میں فرق نظر نہیں آتا؟"

عرض کیا: "آتا ہے مگر سائیکل تیزی سے جا رہے تھے، اس لیے پہچان نہ سکا۔"

ارشاد ہُوا: "اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم سوائے انگریز کے کسی اور کو سیلوٹ نہیں کرتے۔"

یہ کرنل صاحب کی زیادتی بھی تھی اور بے ربطی بھی۔ مجھے کچھ اندازہ ہونے لگا کہ لفٹیننٹ کرنل سہی، مگر عالمِ بالا میں کچھ بدامنی ہے۔ بہرحال اُدب اور سکُون سے عرض کیا:

"جناب، یہ مطلب تو نہیں نکل سکتا۔"

جب مَیں یہ کہہ رہا تھا تو پاس ہی سے ہمارے یُونٹ کا ایک انگریز کپتان سائیکل پر سوار گزرا جس نے حسبِ عادت ہمیں آنکھ ماری جو یقیناً کرنل صاحب کو بھی لگی لیکن اُس نے کرنل صاحب کو سیلوٹ وغیرہ نہ کیا۔ کرنل صاحب نے مُجھ سے مکالمہ جاری رکھا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارا ڈسپلن ٹھیک نہیں ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

نام عرض کیا لیکن کرنل صاحب نام سے زیادہ یہ چاہتے تھے کہ ڈرے، کانپے اور معافی مانگے۔ جب ایسا نہ ہُوا تو آپ نے ذرا زیادہ خوفناک حربہ استعمال فرمایا اور بولے:

"اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ؟"

شناختی کارڈ ہر وقت ہر افسر کے پاس ہوتا ہے۔ جیب سے نکال کر ادب سے پیش کیا، یَن کانپنے سے پرہیز کیا۔ آپ نے کارڈ دیکھا۔ پھر اپنی نوٹ بُک میں کچھ کوائف

نقل کیے اور کارڈ واپس کرتے ہُوئے بولے :

"تمہاری رپورٹ سب ایریا کمانڈر کو کی جائے گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

عرض کیا: "سَر، میں بھی کچھ عرض کر سکتا ہُوں؟"

فرمایا: "بولو۔"

"سَر، جب آپ نے سائیکل رُکوا کر مجھے بیس قدم پیچھے طلب فرمایا تھا تو مَیں نے آ کر آپ کو سیلوٹ کیا تھا، لیکن آپ نے اُس کا جواب نہ دیا۔ میرے سیلوٹ میں کوئی نقص تھا؟"

بولے: "ہم نے جواب نہیں دیا تھا؟ ہمیں خیال نہیں رہا ہوگا۔"

عرض کیا: "ایسا ہی ہو گا مگر ابھی ابھی ایک انگریز کپتان بغیر سیلوٹ کیے گزرا لیکن آپ نے اُسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ سَر، گستاخی معاف، کیا آپ صرف کالے کپتانوں کو ہی پکڑتے ہیں؟"

کرنل صاحب کے چہرے پر واضح گھبراہٹ تھی لیکن زبان میں دَم تھا۔ بولے :

"یہ تمہارا بزنس نہیں۔"

مَیں نے کہا: "سَر، شاید آپ کو علم ہے یا نہیں، سب ایریا آرڈرز کی رُو سے سائیکل پر جاتے ہُوئے سیلوٹ کرنا لازم بھی نہیں۔"

کرنل صاحب کو اِس سوال کا صحیح جواب نہیں آتا تھا۔ اِضطرار میں بولے :

"یہ ہمارا بزنس ہے۔"

عرض کیا: "مجھے بھی اس واقعہ کی رپورٹ اپنے کمان افسر کو کرنا ہو گی۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو کیا میں بھی آپ کا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہُوں؟"

اب اگر کوئی پختہ قسم کا جاندار سا کرنل ہوتا تو پہلے تو سیلوٹ پر جھگڑنے کی طفلانہ حرکت ہی نہ کرتا اور اگر کر بیٹھتا تو پھر ایک پکڑے ہُوئے کپتان کی یہ جرأت نہ ہوتی کہ اُلٹا شناختی کارڈ

مانگتا لیکن ہمارے دیسی بھائی بظاہر نومولود سے لفٹیننٹ کرنل تھے اور غالباً اسی خاکسار پر پہلی مرتبہ کرنیلی آزمارہے تھے۔ یُوں تو کیا ہی اچھا ہوتا کہ کرنل صاحب ہمارے پاس سے گُزرتے ہُوئے مُسکرا کر ہاتھ ہلاتے اور ہم اپنے ہموطن کے اوجِ طالع اور نگاہِ التفات پر فخر کرتے ہُوئے جوابی ہاتھ ہلاتے، لیکن اب کرنل صاحب گرفت میں تھے تو یہ کمبل کا قصُور نہ تھا، خود آپ نے اسے ذرا تنگ لپیٹا تھا۔ کسی قدر جھُنجھلا کر بولے۔

"اگر تمہارا کارڈ دیکھنا ضروری ہے تو یہ رہا کارڈ۔"

کارڈ دیکھا تو لکھّا تھا: "لفٹیننٹ کرنل ڈی سُوزا۔ یُونٹ: ملٹری ہسپتال"۔ گویا آپ ڈاکٹر تھے۔ اب لازم نہ تھا کہ آپ کا نام پتہ یاد رکھنے کے لیے ہم بھی نوٹ بُک کا سہارا لیتے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی ضیافتِ طبع کے لیے ہم نے کسی قدر اہتمام کے ساتھ جیب سے نوٹ بُک نکالی پھر ذرا خوش خطی سے کرنل صاحب کے کوائف لکھے اور آخر کار سلیقے سے کارڈ تہہ کر کے آپ کے ہاتھ میں دے دیا اور عرض کیا:

"مجھے جانے کی اجازت ہے؟"

کرنل صاحب نے جانے کی اِجازت تو دے دی، لیکن اُن کے دِل سے بے آواز پکار اُٹھ رہی تھی کہ خُدا کے لیے مت جاؤ۔ ہم سے گھر میں ہی صلح کرلو۔

مَیس میں پہنچا تو کھانے کی میز پر اِس حادثہ کا ذکر کیا۔ سامعین زیادہ تر لفٹیننٹ اور کپتان ہی تھے۔ گویا جُونیئر افسروں کی برادری تھی۔ ہمارے کارنامے پر خاصا فخر کیا گیا اور باقاعدہ فتح منائی گئی۔

پچھلے پہر اپنے کمرے میں لیٹا تھا کہ کیپٹن چکرورتی آنکلا اور بولا: "چلو تمہیں چائے پلائیں۔" ہم فوراً ساتھ ہولیے کیونکہ چکّی کی ٹی پارٹی ہمیشہ پُرلطف ہوتی تھی۔ اس کے نِصف مہمان صنفِ نازک سے ہونے کے علاوہ سچ مُچ نازک بھی ہوتے تھے جن کی ہم نشینی چائے

کو خوشگوار ذائقہ بخشتی تھی۔

پوچھا: "آج کس کو بلایا ہے؟"

بولے: "یہ سرپرائز ہی رہے گی۔"

تھوڑی دور گئے تو جیپ بجائے ریستوران کے ایک بنگلے میں داخل ہو گیا اور اندر جا کر بے تکلف ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں صاحبِ خانہ تشریف لائے۔ جی ہاں، یہ لفٹیننٹ کرنل ڈی سوزا ہی تھے۔ جیکی نے باہم تعارف کرایا:

"میرا دلی دوست محمد خاں۔ میرے کرم فرما کرنل ڈی سوزا۔"

ابتدائی مزاج پرسیوں کے بعد چائے آگئی اور اِس تکلف کے ساتھ کہ ریستوران بھول گیا۔ پھر کرنل صاحب کا اندازِ تواضع: چائے پلائی تو شکر گھول دی۔ باتیں کیں تو اَمرت گھولنے لگے۔ آخر اُٹھے تو کرنل صاحب نے آئندہ ملاقات کے وعدے پر اصرار کیا۔ قِصّہ مختصر باہر نکلے تو معلوم ہُوا جیسے دل کا ایک ٹکڑا کرنل صاحب کے گھر چھوڑ چلے ہیں۔

واپسی پر معلوم ہوا کہ اِس منصُوبے کا خالق جیکی ورتی تھا جس کی کرنل صاحب سے پُرانی دوستی تھی۔ رہا وہ سیلوٹ کا مُعاملہ تو خُدا جانے وہ کن دو آدمیوں کے درمیان ہُوا تھا۔ سوائے اِس کے کہ جب دو چار مُلاقاتیں اور ہو چکیں تو کرنل صاحب اور ہم نے اپنی نوٹ بُکوں میں سے ایک ایک صفحہ بطور تعویذ ایک دُوسرے کو پیش کر دیا۔

سیالکوٹ کی زندگی میں قاہرہ کا سا تنوع نہ تھا لیکن اس کی محدُود دلچسپیاں تمام تر ہماری زد میں تھیں:

———— وہ باکھلے کلب کی مخلوط پارٹیاں اور مشکوک مُلاقاتیں، وہ برج اور فلاش کی مشتبہ نشستیں جن میں سیالکوٹ کے کارخانہ دار اور اُن کی بیویاں مقامی افسروں اور اُن کی بیگمات کے آگے ہر شب سینکڑوں رُوپے ہار جاتیں اور قدرتِ الٰہی سے یہی ہار دُوسرے روز

ہزاروں کی جیت میں بدل جاتی۔

——— وہ سگنل میس کی رجمنٹل نائٹ کی تقریبات جو رسمی ڈنر کے آہنی قواعد اور شاہی ٹوسٹ کی مقدس رسوم سے گزر کر بھنگڑے اور لُڈّی پر جا ختم ہوتیں اور آخری منازل میں ڈھولک کرنل صاحب کے گلے میں ہوتی اور الغوزہ ایڈجوٹنٹ صاحب کے مُنہ میں۔

——— وہ مغربی رقص کی خاص راتیں کہ سفید جوڑے شب بھر چلتے اور تھرکتے، تھرکتے اور چلتے۔ لیکن دیسی افسر دیوار سے لگ کر وال پیپر بنے رہتے کہ اکثر تو ناچنا ہی نہ جانتے تھے اور جو جانتے تھے اُن کی التجائے رقص بد دماغ میمیں دردِ سر کے بہانے ٹال دیتیں۔ حالانکہ اگلے لمحے میں ہی کسی انگریز کے بازوؤں میں ناچتے ہُوئے مجسم اسپرو بن جاتیں۔ اس ہتک پر ہم تمام لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں قومی پیمانے پر اپنی غلامی کا رونا روتے کہ گوری میموں تک رسائی نہ تھی اور کالی بیگمات ابھی رقص کے میدان میں اُتری نہ تھیں۔ زمیں سخت تھی، آسماں دُور تھا۔

——— وہ ملٹری ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر مس جیننگ جس کے سٹاف سرجن لگنے کے بعد چھاؤنی کے نصف سے زیادہ افسروں کو دردِ دل کے دَورے پڑنے لگے اور ہائے دل پُکارتے پُکارتے اس کے پاس جا پہنچے، لیکن مرض شناس خاتون نے اُن کے دِلوں کو ٹٹولے بغیر سوڈا بائی کارب کی پُڑیا تھما دی اور واپس کر دیا۔ اور وہ اِس خاکسار سے تمام افسروں کی رقابت کہ جہاں مس جیننگ کو دُوسرے مریضانِ دل کی پروا نہ تھی، ہمارے لیے اُس کا دِل مہر و وفا کا باب تھا۔ اگرچہ اس کی وجہ بالکل صاف ستھری، غیر پوشیدہ اور پڑتال کے لیے کُھلی تھی اور وہ یہ کہ ولایت سے ہندوستان آتے وقت جہاز میں مس جیننگ ہماری ہم سفر ہی نہ تھی بلکہ اُردو میں ہونہار بروے کی طرح ہماری چکنی چکنی شاگرد بھی تھی۔ سو قدرتی امر تھا کہ اگر اُستاد کے دُشمنوں کی طبیعت کو کچھ ہو جاتا ——— اور اکثر کچھ ہو جاتا تھا ——— تو سعادت مند شاگرد

سٹیتھوسکوپ اٹھائے خدمتِ استاد کو حاضر ہو جاتی۔ بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

لیکن سیالکوٹ کی زندگی کی حقیقی مسرّت اگر کہیں ملی تو وہ مس جیننگ کے اِلتفات یا ڈاکٹر ڈی سوزا کی عنایات میں نہ تھی اور نہ ہی مخلوط کلبوں یا شکوک پارٹیوں میں بلکہ لفٹننٹ کیلاش ناتھ تلواڑ اور اُن کی خوش اطوار بیوی کے دولت کدے پر۔ خدا جانے ان دونوں نے مِل کر دلنوازی کے سلیقے پر کہاں سے چھاپہ مارا تھا کہ کیلاش کی صحبت میں بیٹھو تو قلب تسخیر کر لیتا تھا اور بھابی ساوتری سے کلام کرو تو جادو ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں لوگ یا تو پیدائشی مہمان ہوتے ہیں یا پیدائشی میزبان۔ یہ میاں بیوی پیدائشی میزبان تھے۔ بجز اہم پیدائشی مہمان تو نہ تھے، فقط یہ کہ تنہا افسروں کو اپنے شادی شدہ دوستوں سے تواضع کی کچھ توقع ہوتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بھری چھاؤنی میں اس ساری تواضع کی ذمہ داری اس واحد جوڑے نے لے رکھی تھی۔ اگر بقول ابو بن اُدہم خدا واقعی ان لوگوں سے پیار کرتا ہے جو اس کے بندوں سے پیار کرتے ہیں تو خدا کی فہرست میں ۱۹۴۴ء کے بعد ابو بن اُدہم سے اُوپر بھی دو نام ہوں گے۔

قیامِ سیالکوٹ کے آخری دِنوں میں ایک کرنل صاحب جی۔ ایچ۔ کیو دہلی سے تشریف لائے اور مجھے حاضری کا حکم ہوا۔ حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ فوج کے محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ افسر ہیں اور چونکہ ہمارے سرکاری اعمالنامے میں تعلیم کے خانے میں میٹریکولیشن کے علاوہ کچھ اور بھی لکھا ہے، اِلٰہذا وہ ہم سے پُوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہم سِگنل کور کو چھوڑ کر ایجوکیشن کور میں آنا چاہیں گے۔ سبز باغ کی سیر کراتے کراتے جناب کرنل صاحب نے باغ کے ایک کونے میں ہمیں میجری کی جھلک بھی دکھلائی۔ دل ہی تو تھا، کمبخت شوقِ میجری سے بھر آیا۔ لیکن ہر چند کہ میجری کی کشش بے پناہ تھی، تاہم سِگنل کور سے ترکِ وفا کا تصوّر بھی بے حد جاں گداز تھا۔ چنانچہ ہم نے اقرار تو کر لیا لیکن کچھ ایسا مبہم اور معمّہ نما سا کہ وقت آنے پر یہ معنی بھی

نکل سکیں اور وہ بھی، اور شارحین کا کسی ایک مطلب پر اتفاق نہ ہو سکے۔ چنانچہ کرنل صاحب ہمارا یہ وعدہ لے کر رخصت ہو گئے ـــــ دس دن بعد ہمارا تبادلہ اچانک ایسٹرن کمانڈ میں ہو گیا اور فروری ۱۹۴۵ء میں ہم عازم کلکتہ ہوئے، گویا ہمارا کرنل صاحب سے کیا ہوا وعدہ اور پیچیدہ ہو گیا۔

۱۹

ویکائی سگنل سکول کی کمان ○

کلکتہ پہنچ کر چیف سگنل افسر بریگیڈیئر ہرسٹ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ بریگیڈیئر صاحب نے خیریتِ مزاج کے بعد ہم سے گزشتہ تجربے کے متعلق سوالات پُوچھے۔ جواب میں ہم نے اپنے اعمالنامے کے چیدہ چیدہ گوشوں سے پردہ سرکایا۔ اعمالنامے میں ایک جگہ رقم تھا کہ اس شخص نے قاہرہ میں مردوں کے علاوہ چند یہودی لڑکیوں کو بھی سگنل کی تربیت دی ہے۔ اِس انکشاف پر بریگیڈیئر صاحب پھڑک اُٹھے۔ مجھ سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور کسی کو مخاطب کیے بغیر بولے :

"JUST THE MAN" ◒

خدا جانے آپ کب سے اِس خاکسار ایسے یگانۂ روزگار کی تلاش میں تھے۔ اسی خوشی میں آپ نے فون اٹھایا اور رانچی سے کسی کرنل جونز کو فون پر طلب کیا۔ کرنل جونز لائن پر آئے تو بریگیڈیئر صاحب بولے :

"ٹونی، تمہارا مسئلہ حل ہوگیا ہے یعنی تمہاری لڑکیوں کا۔"

"لڑکیوں کا مسئلہ؟" میں نے دل میں کہا: "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ اِس خاکسار

○ WAC (I) SIGNAL SCHOOL یعنی زنانہ کور کا سگنل سکول

◒ بالکل وہی جس کی ضرورت تھی۔

اور کرنل جونز کی لڑکیوں میں کیا ربط ہے؟ پھر مسئلہ بھی ایک لڑکی کا نہیں، لڑکیوں کا ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور شرع نے کڑی حدیں مقرر کر رکھی ہیں۔"

دونوں انگریزوں کی گفتگو شروع ہو گئی۔ میں صرف برگیڈیئر صاحب کی باتیں سُن سکتا تھا۔

"ہاں ہاں، صحیح آدمی مل گیا ہے، یہ بیٹھا ہے کیپٹن خان۔"

"تجربہ؟ ارے میاں، سینکڑوں یہودی لڑکیوں کو ہینڈل کر چکا ہے، تمہاری لڑکیاں اُن سے زیادہ منہ زور نہیں ہو سکتیں۔ ہاہاہا۔"

ایسا کرتے ہوئے برگیڈیئر صاحب نے میری طرف اِس توقع سے دیکھا کہ مَیں بھی ہاہاہا میں اُن کا ساتھ دوں لیکن مَیں صرف خفیف سی ہی ہی کر سکا۔ مَیں نے کبھی سینکڑوں یہودنوں کو "ہینڈل" نہیں کیا تھا۔ فقط دس لڑکیاں تھیں اور اُنہیں بھی ایک فاصلے پر کھڑے ہو کر سبق دیا تھا۔ ہینڈل کرنا محاورۃً بھی نا واجب طور پر دُور رس بات تھی۔ برگیڈیئر صاحب بظاہر اُن لوگوں میں سے تھے جو یک لخت مزے میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ اب آپ کرنل جونز کو ہمارے کوائف نہیں بتا رہے تھے، ہمارے متعلق شاعری کر رہے تھے۔

"ہاں ہاں، بالکل آسانی سے، نوجوان آدمی ہے۔ کتنی چھوکریاں ہیں تمہاری؟"

"تین سو ساٹھ؟ پانچ اور کیوں نہیں رکھ لیتے، کیلنڈر مکمل ہو جائے گا۔ ہاہاہا۔"

"خدایا تین سو ساٹھ لڑکیاں۔" ہم نے دل ہی دل میں سوچا۔ "ہمارا کیا استعمال ہونے والا ہے؟"

برگیڈیئر صاحب بدستور سخن طراز تھے:

"شادی؟ ہاں ہاں، شادی شدہ ہے۔" (اور بجائے اِس کے کہ ہم سے تصدیق کرالیں، ہمیں آنکھ مار کر خاموش کر دیا) لیکن شادی نہ شادی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاہا۔"

(ہمیں دُوسری آنکھ ماری)

بالکل بے ارادہ طور پر ہمارے ہونٹ بھی کھل گئے جسے بریگیڈیئر صاحب نے اپنی داد سمجھا۔ بولے:

"ٹونی۔ تم خان سے مل کر بہت خوش ہو گے۔ بڑا نائس فیلو ہے۔"

ہماری ستائش ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے سامنے جُھک کر آداب عرض کہوں یا بیٹھے بیٹھے دندکیڑ○ طاری کر لُوں ——— گفتگو جاری تھی:

"آج ہی شام کی گاڑی سے چل پڑے گا اور کل تمہارے پاس ہو گا۔"

ٹیلیفون بند ہُوا تو بریگیڈیئر صاحب ہم سے مخاطب ہُوئے اور بولے:

"یہ کرنل جونز تھے۔ کے۔ ایل آف سی سگنل رانچی کے کمان افسر۔ جونز کی زیرِ نگرانی جمشید پور میں ایک بہت بڑا ویکائی یعنی لڑکیوں کا ٹریننگ سکول ہے۔ وہی ٹاٹا کی جگہ یہ سکول غریب جونز کے لیے دردِ سر بن گیا ہے۔ کوئی افسر وہاں مہینے سے زیادہ نہیں ٹھہرتا لیکن مجھے یقین ہے کہ تُم اپنے بے مثال تجربے کی بنا پر ———"

افسروں کی بے ثباتی کے متعلق مجھے ٹیلیفون کی گفتگو سے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ باقی زبانی بتا دیا گیا۔ چنانچہ دُوسرے دن میں اپنے بے مثال تجربے سمیت رانچی پہنچ گیا۔ کرنل جونز سے مُلاقات ہُوئی تو اُنہیں بھی بریگیڈیئر صاحب کی طرح خوش مزاج پایا لیکن ذرا زیادہ

○ دندکیڑ چکوال کی زبان میں زور سے دانت بھینچنے کو کہتے ہیں۔ مارٹو چکوال کا مشہور بھانڈ تھا۔ تماشہ شروع کرنے سے پہلے حاضرین کو مخاطب کر کے باآوازِ بلند کہتا: "ہندو رام، مسلمان کلمہ اور جملاہے دندکیڑ۔" اس کے بعد حاضرین سے جلاہے پہچاننا کچھ مشکل نہ ہوتا تھا کیونکہ چار و ناچار بیچارے دانت بھینچے بیٹھے ہوتے تھے۔

'K' L OF C SIGNALS

حقیقت پسند۔ بولے:

"خان۔ ویکائی سگنل ٹریننگ سکول کی کمانڈیوں تو دل کش ہے لیکن ذرا TRICKY ہے، لیکن خیر تمہارے بے مثال تجربے ___"

اگلے روز جمشید پور پہنچا۔ سیدھا دفتر میں گیا۔ وہاں ایک اُدھیڑ عمر کی اینگلو انڈین خاتون مسز پلیٹر تشریف فرما تھیں۔ آپ نے کپتانی لگائی ہوئی تھی۔ معلوم ہُوا ہماری نیابت کا کام کریں گی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ تین سو ساٹھ لڑکیوں میں سے ایک سَو برٹش ہیں، ایک سَو اینگلو انڈین، ایک سَو ہندوستانی اور ساٹھ گورکھا۔ گویا اچھی خاصی زنانہ اقوامِ متحدہ تھی۔ بطور آفیسر کمانڈنگ سکول کے اندر ضبط، تربیت وغیرہ کی ذمہ داری ہماری تھی لیکن ہوسٹل کے معاملات کے لیے مسز پلیٹر جواب دہ تھی۔ یہ معلوم ہُوا تو ہمارا آدھا دردِ سر ہلکا ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ لڑکیوں کے نازک مسائل کی جائے پیدائش ہوسٹل ہی ہوتا ہے۔ کلاس میں ہوتا ہی کیا ہے؟ سبق؟ اگر کوئی لڑکی سبق بھول گئی تو آفت نہیں آ جائے گی۔ جی چاہا تو ذرا غصّہ ہو لیں گے ورنہ معاف کر دیں گے۔

ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک صبح سارجنٹ رالبن آیا۔ سیلوٹ سے ظاہر تھا کہ کسی کی شکایت لے کر آیا ہے۔ بولا:

"سَر، گزشتہ رات کارپورل کلونت کور کو ایک خفیہ چٹھی DECIPHER ○ کرنے کو بھیجی گئی۔ مگر اُس نے اِنکار کر دیا اور کہلا بھیجا: "جو کچھ کرنا ہے کر لو، کیپٹن خان مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

کلونت کور نے ایک حد تک دُرست کہا تھا۔ صرف دو روز پہلے اس کے والد جو جمشید پور میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، مجھے ملنے آئے تھے اور کلونت کور کو بھی ساتھ لائے

○ پوشیدہ اشارات و اعداد سے مطلب نکالنا۔

تھے۔ کلونت کور ایک دراز قد، جواں سال اور دلآویز سکھ لڑکی تھی۔ اس کے نیم وا رسیلے ہونٹ ہر لحظہ مسکراہٹ پر تُلے رہتے تھے۔ وہ جتنی حسین تھی، اتنی ہی لاڈلی تھی لیکن اب فوجی ضبط کا معاملہ تھا۔ چنانچہ کلونت کور کو دفتر میں طلب کیا۔

کلونت کور آئی تو ہمارے دفتر میں اس بے تکلفی سے داخل ہوئی جیسے چائے پر مدعو ہو اور ابھی اس نے ہمارے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ہم اس کی خوشبو کے نصف قطر میں آ گئے۔ اِن حالات میں بے لاگ افسری آسان کام تو نہ تھا لیکن ہم ثابت قدم رہے۔ کلونت کور نے رابسن کو کھڑے دیکھا تو ذرا ٹھٹکی اور اس پر ایک قہر آلودہ نگاہ ڈالی۔ پھر اپنی خود رَو مسکراہٹ کا رُخ ہماری طرف موڑا، لیکن ہم اس وقت کرسئ عدالت پر بیٹھے تھے۔ کسی جوابی مسکراہٹ کے بغیر خالص فوجی انداز میں کہا:

"کارپورل کلونت کور۔ سارجنٹ رابسن نے رپورٹ کی ہے کہ تم نے کل شام خُفیہ چٹھی کا صاف زبان میں ترجمہ کرنے سے اِنکار کر دیا۔ ایسا کیوں ہُوا؟"

کلونت کور جھٹ پنجابی میں بولی: "حرامی جھُوٹ بکدا اے۔"

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اِس غیر متوقع اور غیر فوجی جواب پر ہم نے ہنسی کو کیسے دبایا اور فوجی ضبط کی بحالی کے لیے کس مشکل سے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی کے آثار پیدا کیے۔ سنبھلنے میں خاصی دیر لگ گئی لیکن آخر کہا:

"کارپورل کَور۔ انگریزی میں بات کرو اور ٹھیک اٹن شن کھڑی ہو جاؤ اور میرے سوال کا جواب دو۔"

کلونت کَور کو مجھ سے ——— یعنی ایک ہم وطن سے اور خصوصاً پرسوں کی ملاقات کے بعد ——— ایسے ٹھیٹ سرکاری سلوک کی توقع نہ تھی۔ کلونت کَور نے تو رابسن سے اِس اُمید پر ٹکر لی تھی کہ ہم اس کے ہیں ہمارا پُوچھنا کیا؟ لیکن اب "اُس" نے ہی لاج نہ رکھی تو

پژمُردہ سی ہو کر رہ گئی اور نگاہیں نیچی کر لیں۔ مَیں نے سوال دہرایا۔

"پلیز، بتاؤ کہ سارجنٹ کا حکم کیوں نہیں مانا؟"

کلونت کَور بدستور خاموش تھی۔ اُس کی نگاہیں زمین میں گڑی تھیں۔ عدالت نے سوال جاری رکھے:

"تو کیا اِس کا یہ مطلب ہے کہ تمہیں اپنے قصور کا اعتراف ہے؟"

میرا یہ کہنا تھا کہ کلونت کَور کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ مَیں نے سارجنٹ کو باہر جانے کا اِشارا کیا۔ اُس کا دروازے سے نکلنا تھا کہ کلونت کَور زار زار رونے لگی۔ اب عدالت کے سامنے یہ سوال نہ تھا کہ مُلزمہ قصوروار ہے یا نہیں بلکہ یہ کہ مُلزمہ عدالت کا قصُور معاف کر کے رونا بند کرے گی یا نہیں، لیکن آنسوؤں کی رفتار سے واضح تھا کہ ملزمہ کا عدالت کی جاں بخشی کا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم نے کلونت کَور کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ اِس سلسلے میں کُرسیٔ عدالت خالی کر کے مُلزمہ کو پیش کی اور اُسے ضبط کی تلقین کرنے لگے۔

تلقین کے دوران ہمیں گزرا ہُوا زمانہ یاد آیا جب ہم مَردوں کی کمانڈ کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ جب کسی قصور پر دَھر لیے جاتے تھے تو تازہ وردی پہنے رائٹ لفٹ کرتے کرۂ عدالت میں داخل ہوتے۔ دو سوالوں کے بعد اکیس روز کی قید کا حکم سُنتے تو پھُرتی سے سیلوٹ کرتے۔ رائٹ لفٹ کرتے کرۂ عدالت سے باہر نکلتے اور تین ہفتے کوارٹر گارڈ میں گزار کر ہنستے کھیلتے یُونٹ کی زندگی میں اس طرح شامل ہو جاتے جیسے سینما دیکھ کر آئے ہوں۔ کہاں وہ سپاہیوں کی کمانڈ اور کہاں ان دیکائیوں کی ناز برداری کہ

ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مِس کَور کے لیے چائے کی پیالی منگوائی۔ اگرچہ حقیقی ضرورت عرق گاؤزبان مع خمیرہ مرواریدکی تھی۔ مِس کَور نے دو گھونٹ چائے کے پیے۔ اس کی سسکیوں میں ذرا افاقہ

ہوا تو ہر دو جہاں سے عموماً اور ہم سے خصوصاً خفا ہو کر چل دی۔

اب ہم پر روشن ہونے لگا کہ ہمارے پیشرو صاحبان اِس سکول میں ایک مہینہ سے زیادہ کیوں نہیں ٹھہر پاتے تھے اور یہ ابھی ابتداء تھی۔

لڑکیوں کی تعداد کے پیشِ نظر سکول میں شبینہ کلاسیں بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک شام ہم نے وائرلیس کی کلاس کا چکّر لگایا جس میں پندرہ بیس اینگلو انڈین لڑکیاں زیرِ تربیت تھیں۔ دروازے پر پہنچے تو ایک چھوٹے سے کُتّے نے باریک مگر مصمم سی بھونک سے ہمارا راستہ روکا۔ ہم ابھی اُس پر واضح کر رہے تھے کہ برخوردار کتّے یُونٹ میں ہی یونٹ کے کمان افسر پر نہیں بھونکتے کہ کمرے سے زنانہ سرگوشیوں بلکہ بھاگ دوڑ کی آواز آئی اور جب دروازے کے اندر قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکیاں اپنی آرائش کی چیزیں ——— لپ سٹک، پاؤڈر، نیل پالش، آئینہ ——— تیزی سے اِدھر اُدھر چھپا رہی ہیں۔ آخر جب ہمارے احترام میں یکبار سیٹوں پر بیٹھ گئیں تو معلوم ہُوا کہ ہماری ہونہار طالبات آرائش کے مختلف مراحل سے گزر رہی ہیں۔ کسی کے بالوں میں کرلر لگے ہوئے ہیں۔ کسی کے ایک ہونٹ پر سُرخی ہے لیکن دُوسرا فی الحال ابلق ہے۔ کسی نے اپنے چہرے کے لیے کریم نکالی تھی لیکن ہمارے دخل در معقولات کی وجہ سے وائرلیس سیٹ کے عارض ہی پلیج کر دیے ہیں۔

تو یہ تھی ہماری وائرلیس کی کلاس: کوئی کہنہ سال اور پکّے دل کا کرنل ہوتا تو یہ منظر دیکھ کر غصّے سے لاوا بن جاتا اور ساتھ ہی طالبات کو بھی بھسم کر دیتا۔ لیکن ہمارے پہلو میں ابھی ملائم اور جُونیئر سا دل تھا۔ چنانچہ ہمارا پہلا ردِّ عمل تو ایک بے پناہ قہقہہ تھا جسے ہم نے چھینکوں اور کھانسی کی شکل میں خارج کیا۔ پھر اپنی کمان افسری کا تمام تر رعب چہرے پر اکٹھا کر کے کلاس سے پُوچھا:

"لڑکیو، تمہارا اُستاد سارجنٹ رابن کہاں ہے؟"

یہ پُوچھ ہی رہا تھا کہ مقابل کے دروازے سے باہر برآمدے میں سارجنٹ رالبسن دکھائی دیا۔ کمرے سے نکلنے کے لیے اچھا بہانہ تھا۔ باہر جا کر رالبسن سے پُوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ سارجنٹ رالبسن نہایت سکُون سے قصّہ بیان کرنے لگا

"سر! آج یہ لڑکیاں گورے سپاہیوں کے کیمپ میں ڈانس پر مدعو ہیں۔ کلاس ختم ہونے کے بعد انہیں براہِ راست وہاں جانا ہے۔ لہٰذا آرائش کا سامان لے کر یہاں آگئی ہیں۔ کلاس میں آیا تو مَیں نے بھی وہی کچھ دیکھا جو آپ نے دیکھا۔ مجھے بھی آپ کی طرح ہنسی اور غُصّہ مِل جُل کر آئے لیکن لڑکیوں نے مجھے وہ کہا جو آپ کو نہیں کہا۔ یعنی یہ کہ اگر جان کی اَمان چاہتے ہو تو برآمدے میں کھڑے ہو کر چوکیداری کرو۔ دُوسری طرف مس سونیا نے اپنا کتا کھڑا کر دیا۔ شاید آپ کی اس بدتمیز سے مڈبھیڑ ہوئی ہو۔ مَیں ایک کلونت کور سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ بیس سونیاؤں سے کیا اُلجھتا؟ آپ کو رپورٹ دینا بھی مناسب نہ سمجھا کہ کلونت کور کے بعد آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ اِس وقت آپ کے لیے بیس لڑکیوں کی اشک شوئی اور چائے نوشی کا انتظام ذرا مشکل تھا۔"

گویا سارجنٹ رالبسن کو کلونت کور کے قصّے کا آدھا نہیں، پُورا علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ کیا گزری تھی قطرے پہ گُہر ہونے تک۔ ہم نے سوچا کہ اگر ان بیس اینگلو انڈین قطروں نے بھی گُہر ہونا شروع کر دیا تو ہماری کپتانی چائے دانی بن کر رہ جائے گی۔ چنانچہ ناچار اپنی راؤنڈ کے خاتمے کا اعلان کیا اور سامنے ہنستی کھیلتی سونیا کو دیکھ کر اپنی بے بسی کا اقرار کیا۔

تری دُنیا میں مَیں مجبور و محکوم

مری دُنیا میں تیری پادشاہی

دو دن خیریت کے گزرے۔ تیسرے دن مقامی فوجی ہسپتال سے ڈاکٹر کا فون آیا۔

"آپ ہی او۔ سی دیکائی سکُول ہیں؟"

"جی ہُوں۔"

"آپ کے سکول کی دو لڑکیوں نے آج صبح SICK REPORT ○ کیا ہے۔"

"کیا ہوگا۔ خیریت تو ہے؟"

"یُوں تو خیریت ہے۔ صرف ان میں سے ایک کے بچّہ ہونے والا ہے۔ یہ مس جُولیا ہے۔"

خدا جانے میں یہ سُن کر کرسی سے اُڑ کر چھت کو کیوں نہ جا لگا۔ میں نے کہا۔

"کیا فرمایا آپ نے؟ بچّہ یعنی ۔۔ یعنی یہاں تو سب لڑکیاں غیر شادی شُدہ ہیں۔"

"جی ہاں۔ جبھی تو آپ کو بتا رہا ہُوں۔ ورنہ یہ خوش خبری براہِ راست مُنّے کی ماں کو سناتا۔ لڑکی سکول پہنچے تو مناسب ایکشن لیں۔"

"مناسب ایکشن؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

اضطرار میں بھاگ کر مسز پلیٹر کے پاس پُہنچا اور کہا:

"مسز پلیٹر غضب ہو گیا۔ مس جولیا کے بچّہ ہونے والا ہے۔"

مسز پلیٹر چھُوٹتے ہی بولی:

"تو پھر روکو اُسے۔" اور یہ کہہ کر مُسکرا دی۔

مسز پلیٹر کی رگِ ظرافت محض میرا ذاتی اضطرار دیکھ کر پھڑک اُٹھی تھی ورنہ بچّے کی آمد ہم دونوں کے لیے مساوی طور پر مضر تھی اور کچھ یہ بھی کہ ہماری کمانڈ میں یہ پہلا حادثہ تھا لیکن مسز پلیٹر کی تو یہ کیفیت تھی کہ

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

رجسٹر میں کوائف دیکھے تو معلوم ہُوا کہ جُولیا کے والدین جمشید پور میں ہی رہتے ہیں

○ اپنی بیماری کی ڈاکٹر کو خبر کرنا۔

میجر صاحب اب بھولی باتیں کر رہے تھے۔ عرض کیا:

"ایک احتیاطی تدبیر تو خود سرکارِ برطانیہ نے کی ہے۔ یعنی لڑکیوں کے ہوسٹل کے سامنے میں انگریز سپاہیوں کا رخصتی کیمپ کھول دیا ہے۔"

میجر صاحب بولے: "سرکاری پالیسی پر نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔"

عرض کیا: "تو پھر قدرت کی پالیسی پر بھی راضی رہنا چاہیے۔"

قصّہ مختصر میجر شاہانی ناخوش لوٹے اور رانچی جاکر کرنل جونز سے ہماری شکایت کر دی۔ ہمیں رانچی طلب کیا گیا اور ہم بہ ہزار شوق و بُجملہ سامان چل پڑے کہ شاید اس کمانِ نسواں سے امان ملے لیکن کرنل جونز نے قصّہ سنا تو بولے:

"تمہارا کام لڑکیوں کو سگنل کی تربیت دینا ہے۔ سو وہ اطمینان بخش ہے۔ ان کی اخلاقی نگرانی مسز پیٹر کا کام ہے اور جمشید پور کے حالات کے پیشِ نظر یہ بھی معقول ہے۔ باقی رہا میجر شاہانی تو وہ JITTERY (ڈرپوک) ہے۔"

یہ تو ٹھیک تھا لیکن میں خود بھی اِس زچہ و بچہ کی دیکھ بھال سے رخصت چاہتا تھا عرض کیا:

"کیا ممکن نہیں کہ مجھے رانچی میں ہی کوئی مردانہ کام دے دیا جائے؟"

بولے: "نہیں ایک سال تک ممکن نہیں۔"

بڑی مایوسی ہوئی۔ سوچا، کون جیتا ہے اِن دیکائیوں کی زُلف کے سَر ہونے تک۔ اگر سال بھر اِن کی نگرانی کرتے رہے تو ہم لیڈی ڈاکٹر بن جائیں گے۔ جمشید پور سے بچنے کی تدبیریں کرنے لگے۔

دُوسرے دن ابھی رانچی میں ہی تھے کہ اچانک ہمیں دفتر میں طلب کیا گیا۔ جی۔ ایچ کیو دہلی سے ہمارے متعلق چٹھی آئی تھی کہ اگر یہ افسر ایجوکیشن کور میں تبادلے پر رضامند ہے

تو فی الفور بچھری میں تعلیمی کورس کے لیے حاضر ہو جائے۔ ایجوکیشن کرنل سے سیالکوٹ والی ملاقات یاد آگئی۔ اُس وقت باوجود میجری کے سبز باغ کے ہمیں سگنل کور چھوڑنا شاق نظر آتا تھا اور اب پھر سگنل سے قطع تعلق کا خیال ہمارے لیے سوہانِ رُوح تھا لیکن جب دیکائیوں کے غول اپنے نامعقول آنسوؤں اور نامولود بچوں کے ساتھ ہمارے تصور میں نمودار ہوئے تو ہم بچھری جانے کے لیے رضامند ہو گئے اور تیسرے دن وہاں پہنچ گئے۔

بچھری کا قیام مختصر تھا۔ دو ماہ کے کورس میں ہم پر فوجی تعلیم کے اسرار و رموز فاش کیے گئے اور کورس کے خاتمے پر ہمیں ایک مستند ایجوکیشن افسر کے طور پر جی۔ ایچ۔ کیو دہلی کے حوالے کر دیا کہ جہاں جی چاہے استعمال کر کے دیکھ لو۔ جی۔ ایچ۔ کیو نے ہماری آزمائش کے لیے برما انتخاب کیا اور ۲۱ جون ۱۹۴۵ء کو ہم کلکتہ سے پرواز کر کے مکٹیلا کے ہوائی اڈے پر اُترے۔

۲۰

برما۔ بربادی و بحالی میں ہمارا حصّہ

برما کی زرخیزی کے متعلق ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ زمین کو گدگداؤ تو ہنس کر موتی بکھیر دیتی ہے○ جب ہم مکٹیلا کے ہوائی اڈے پر اُترے اور گردوپیش پر نگاہ ڈالی تو ظاہر تھا کہ اس سرزمین کو ایک مدت سے ہنسنا نصیب نہیں ہوا ___ تین سال کی دردناک جنگ سے اس کی کھیتیاں ویران اور بستیاں سنسان ہو گئی تھیں اور دردناک تر یہ کہ اہلِ برما کے دل ویران ہو گئے تھے۔ اگر کسی لب پر خندہ تھا یا کسی آنکھ میں چمک تھی تو یہ برمی لب و چشم نہ تھے۔ کوئی امریکی، انگریزی یا ہندوستانی فوج کا فاتح سپاہی ہوگا۔ رہے جاپانی تو وہ برما میں آخری مرتبہ مسکرا چکے تھے اور اب جنگ ہار کر شبِ غم گزارنے کے لیے سیام کو پسپا ہو رہے تھے۔

مضافاتِ مکٹیلا سے گزرتے ہوئے جا بجا کاسۂ سر نظر آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ یہ چند روز پیشتر زندہ جاپانی دلیروں کے سر پر غرور تھے لیکن اس وقت برما میں زندہ جاپانی صرف دو قسم کے تھے۔ وہ جو اسیرانِ جنگ تھے یا وہ جو اس حالت یاس میں بھی کسی کمین گاہ میں

○ "TICKLE THE EARTH IT LAUGHS IN HARVEST"

(GEORGE WEST)

اپنے فاتحین کی خاطر اپنی آخری گولی محفوظ رکھے بیٹھے تھے۔

چنانچہ جس وقت ہم برما پہنچے، ہماری فوج کشت و خون سے تقریباً فارغ ہو چکی تھی۔ ہمارا کام اب برباد برما اور برمیوں کو آباد کرنا تھا۔ گویا خالص تعمیری کام تھا اور یہ تعمیر ہم نے دل و جان سے کی۔ اگرچہ گاہے گاہے وسائل برما کی تعمیر کے ساتھ ساتھ مسائل نفس کی تسخیر میں بھی اُلجھ گئے لیکن دل ہی تو تھا۔ چنانچہ دوسروں کے حسن کارکردگی کے صدقے خطاکاروں کو بھی معاف کر دیا گیا۔ خود غالب نے بھی ان لوگوں کی معافی کی سفارش کی ہے:

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے ؟

اور اہلِ دل کا ازل سے فتویٰ ہے کہ کچھ نہ کہیے چھوڑ دیجیے۔ چنانچہ چھوڑ دیے گئے یہی خطا پوشی کی پالیسی تھی جس نے برما کے شکستہ و ریختہ نظام کو مہینوں میں چالو کر دیا اور ساتھ ساتھ ہمارا اپنا نظام بھی چالو رہا کہ مزدورِ خوش دل کند کار بیش۔

ہمارا تقرر ۵۰۵ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں ہوا اور پہلی مرتبہ ہم شاف افسر یعنی جی۔ تھری (G-3) مقرر ہوئے۔ ہمیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس اسامی میں رہ کر ہمارا مقابلہ جاپانیوں سے بھی قوی تر غنیم سے ہے۔ یعنی دفتر کی کرسی سے جو مسلسل بیٹھک سے ہمارا جزوِ بدن بننے لگی تھی۔ ہم آج تک رجمنٹ کی کھلی فضا میں رواں دواں زندگی کے عادی تھے جہاں آبلہ پائی بھی ایک طرح کی رحمت تھی۔ اب آبلوں کی تو یہاں بھی کمی نہ تھی لیکن غلط جگہ پر تھے اور یہ ایک ایسی زحمت تھی جس سے مجنوں جیسا ستم رسیدہ بھی محفوظ رہا تھا۔ آخر تنگ آکر اپنے جی۔ ون (G-1) لفٹیننٹ کرنل اِنگل بی (INGLEBY) سے التجا کی کہ ہمیں کوئی برونِ در کا کام دیا جائے۔ کرنل صاحب ایک دلنواز سے بزرگ تھے۔ بولے "شمالی برما کا دورہ کرو کہ مختلف یونٹوں کے مسائل سے آشنا ہو جاؤ" اور ایک جیپ ہمارے حوالے کر دی۔

ہم نے مہینہ بھر میں مانڈلے، میمیو، لاشیو، بھامو، مچینا الغرض آدھا برما چھان مارا۔

بُرمانوردی کی کُچھ یادیں باقی ہیں :

——— وہ پہاڑوں پر پگوڈوں کی قطاریں کہ جب تک برما یا پہاڑ ختم نہ ہوں پگوڈے ختم نہیں ہوتے۔ برما کے پہاڑوں نے جہاں کہیں کہنی نکالی ہے یا سر اُبھارا ہے مہاتما بُدھ کے شیدائیوں نے اِسے پگوڈے کی ٹوپی پہنا دی ہے۔

——— وہ سڑک پر جا بجا بدھ کے سیرین (SERENE) اور سکون بخش مجسمے کہ ہم بُت شکن بھی پاس سے گزرتے تو شانتی محسوس کرتے۔

——— وہ مانڈلے میمیو کی سڑک کے دونوں طرف گھنا جنگل کہ جس سے رینگ کر سانپ بھی سڑک پر آ نکلتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے ہم جیپ سواروں سے اپنی حشراتوں کے لیے ڈھول مانگ رہا ہے۔

——— وہ سیلپا کے دیوداروں کے سلسلے گویا دیوؤں کے دیار میں جا نکلے تھے۔

——— وہ برما روڈ کے ناگہانی موڑ جن کی گولائیوں سے خبردار کرنے کے لیے امریکی انجینئروں نے عام نشانوں کی بجائے بے لباس حسیناؤں کی تصویریں بنا دی تھیں۔

——— وہ لاشیو میں ایک چینی رئیس کے ہاں دعوتِ چائے کہ جس کی لطافت نے تمام ترغبارِ خاطر دھوڈالا اور وہ کیف و سرور بخشا کہ قلعہ احمد نگر کے اسیروں کو بھی رشک آئے۔

——— اور آخر میں ہمارے یونٹوں کے مسائل جن کی خاطر یہ سفر اختیار کیا تھا۔ ہم جہاں بھی گئے جوانوں کو شاداں پایا اور کیسے نہ پاتے ؟ راشن کی فراوانی، پلٹیوں کی بیکرانی اور سب سے بڑھ کر آٹھ پہر کی حکمرانی۔ تعمیرِ مُلک جو کر رہے تھے۔ چنانچہ واپس آ کر ہم نے "سب اچھا" کی رپورٹ دی تو ہمارے انگریز سینئر نے ہمیں شاباش دے کر ہماری ترقی کی سفارش کردی۔ گویا شمالی برما میں خیر و عافیت ہمارے دم قدم سے ہی تھی۔

اُدھر اچانک حکم شائع ہوا جس کی رُو سے ہمارا تبادلہ مکٹیلا سے مانڈلے کر دیا گیا۔

یوں سمجھیں جیسے جہلم سے راولپنڈی۔ مانڈلے کے متعلق اپنے گاؤں کے ایک جہاں گرد تاجر سے سن رکھا تھا کہ دلی کی طرح ایک شہر ہے عالم میں انتخاب۔ اور یہ کہ رہتے ہیں منتخب ہی وہاں روزگار کے لیکن جا کر دیکھا، خصوصاً اس کے قلعہ معلّٰی کو تو محسوس ہوا کہ انتخاب ضرور رہا ہوگا لیکن شاہ مندان کے زمانے میں ہی۔ اب تو فلک کے علاوہ جاپانیوں اور انگریزوں نے اُسے اس تفصیل سے ویران کیا تھا کہ اِس اُجڑے دیار میں گھاس کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا اور اب اِس کے مکینوں یعنی ہم لوگوں کا مدار اس گھاس کے کھودنے پر ہی تھا کیونکہ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق یہ گھاس ٹائفس بردار جراثیم سے اَٹی پڑی تھی۔ چنانچہ پہلے چند ماہ ہمارا شغل گھاس کھودنا ہی رہا اور ظاہر ہے کہ اس رُوپ میں ہمیں کوئی بے کلیم ساجر ہی منتخب روزگار سمجھ سکتا تھا۔ بہر حال جب چھ ماہ کی مسلسل کھدائی کے بعد مانڈلے کی صحت بحال ہو گئی اور ہمارے حُلیے میں منتخبانِ روزگار کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں تو یکایک ہمارے ہیڈ کوارٹر کو مانڈلے سے میمیو جانے کا حکم ملا۔ مانڈلے سے میمیو جانا بالکل ایسا ہی تھا جیسا راولپنڈی سے مری جانا۔

مری کی طرح میمیو بھی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک خوش مزاج سا شہر ہے۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ایک برطانوی بٹالین رنگون سے میمیو منتقل ہوئی تھی تو اُن کے خون کو گرمانے کے لیے ہماری فوج کے انگریزی روزنامے SEAC○ نے اپنے مخصوص مغربی بے حیائی کے انداز میں یہ سُرخی جمائی تھی:

"مژدہ جوانو۔ میمیو کی چھ سو دوشیزائیں تمہارے لیے چشم براہ ہیں۔"

اِس بات کو دو مہینے ہو چکے تھے اور ہر چند کہ اب منتظر آنکھوں کی تعداد اور شوق میں خاصی کمی کا امکان تھا تاہم ایک موہوم سی توقع تھی کہ میمیو کے در و بام سے کوئی بچی کھچی آنکھ ہمارے انتظار میں بھی وا ہو گی اور کسی نہ کسی دریچے سے ہمارے مقدم میں بھی کسی رُومال کو جنبش

○ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ

آئے گی لیکن میمیو پہنچے تو کسی آنکھ کو یہ کہتے نہ سُنا کہ تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ۔ بلیسیوں دریچے کھُلے پائے ۔۔۔ لیکن کسی ایک میں بھی ساکن یا متحرک رُومال دکھائی نہ دیا جس کا رُوئے سخن ہماری طرف ہو۔ اور آخر جب ایک کھڑکی میں سچ مچ ایک رُومال ہلتا نظر آیا تو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ کسی معصوم کا دُھلا ہُوا نیپکن سُوکھ رہا ہے۔ گویا اس گھر میں بھی عشق و محبت کی داستان بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ ظاہر تھا کہ میمیو میں زندگی کی رفتار زندہ رہنے کے لیے کافی نہیں۔

بات یہ تھی کہ برما کے باقی شہروں سے کچھ زیادہ میمیو کا حسن اور شباب جنگ کی نذر ہُوا تھا۔ میمیو کی خوشگوار ہوا نے جاپانی فوج کے تمام تر ہوس پرستوں کو کھینچ لیا تھا چنانچہ اب حُسن میں رنگ تھا نہ شباب میں اُمنگ۔ اگر اس وقت غالب میمیو آ نکلتے تو دیکھتے کہ ابرو نے ہاتھ سے کمان رکھ دی ہے اور غمزے نے کمر سے خنجر کھول دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہاں نہ گناہ میں لذت ہے نہ ثواب میں سُرور۔ یہاں دوکانداری سے لے کر عشق بازی تک نقطۂ انجماد سے نیچے کے ماحول میں ہو رہی تھی۔ چنانچہ پہلے دن میمیو میں داخل ہوئے تو ہمارے دلوں پر اُوس کے علاوہ کچھ اولے بھی پڑے اور ہم دن بھر سر کو زانو پر دھر کر بیٹھے سوچتے رہے۔

لیکن ہمارا ہیڈ کوارٹر جس میں پچاس سے زیادہ افسر اور سینکڑوں متعلقین تھے بے فکر اور زندہ دل فاتحین کا ٹولہ تھا۔ انہوں نے اولے اُٹھا کر فلک کو دے مارے۔ اِدھر میمیو کے حزن خانے میں بھی کئی سدا بہار قسم کے لوگ تھے جو عارضی طور پر خواب سرما میں مدہوش پڑے تھے۔ وہ جاگے اور ہر دو عناصر کا اتصال ہُوا تو میمیو میں زندگی نے آنکھ کھول لی۔ پہلے برف پگھلنا شروع ہُوئی۔ پھر بہار نے کروٹ لی اور دنوں میں سنسان کُلّے چہچہانے لگے۔ دفعتاً میمیو نے تیغِ نگاہ کو آب دینا شروع کیا اور اس کے گلی کوچوں میں فتنہ ساماں جیپیں تانے بُننے لگیں۔ ہارکورٹ بٹلر جھیل کی مچلتی سطح پر حشر ماجرا کشتیاں کھیلنے لگیں۔ ریس کورس کا رنگا رنگ

ہجوم واضح طور پر جوڑوں میں تقسیم ہونے لگا۔ ہمارے ہیڈ کوارٹر کے مرد کلرک غائب ہونے لگے ان کی جگہ دھان پان برمی اور اینگلو برمی لڑکیاں لینے لگیں اور ہمارے کائی آلود دفاتر کشتِ زعفران میں تبدیل ہونے لگے ـــــ حوالدار کلرک بنتا سنگھ کی جگہ مس پرل کا آنا گویا ایک بٹنے کی جگہ گوہر کا آنا تھا۔ یہ گوہر کیپٹن گرین (GREEN) ویلفیئر افسر کے حصے میں آیا اور جن جذبات سے کیپٹن صاحب نے دوستوں میں مس پرل کی آمد کا ذکر کیا وہ انگریزی الفاظ میں تھے لیکن فیض انہیں اُردو کا لباس بھی پہنا چکے ہیں یعنی

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

کیپٹن گرین اِس اینگلو برمی حسینہ کے سحر میں ایسے کھوئے کہ کچھ عرصہ بعد خداوندانِ فوج کو انہیں حکماً جدا کرنا پڑا۔ کیونکہ کیپٹن صاحب کے سوا باقی تمام فوج کے ویلفیئر کا کام دھک سے رُک گیا تھا۔

ہماری اپنی کلرک ایک نرم و نازک خالص برمی لڑکی تھی، ماکن چی۔ جتنا پیارا نام تھا اتنی ہی نازک اندام تھی۔ ٹائپ کرنے کو ایک ڈرافٹ دیا تو ٹائپ کرنے کے علاوہ اصلاح بھی کر لائی۔ تعلیم پوچھی تو معلوم ہوا انگریزی میں ایم۔ اے ہے۔ جی چاہا اپنی کرسی خالی کر دیں لیکن ماکن چی بہت سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ بولی: "آپ کو کرسی مبارک۔ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی کھلنے والی ہے۔ میں جلد ہی اپنی کرسی پر چلی جاؤں گی۔ یعنی بطور لیکچرار۔ جنگ کے دنوں میں بیکاری کی بجائے نوکری کر لی کہ اس میں پیسوں سے زیادہ عافیت کا پہلو تھا" ـــــ

ماکن چی کو بھی ہماری طرح ٹوجو ○ سے کوئی عناد نہ تھا۔ محض حالات کا ساتھ دے رہی تھی۔

میمیو کے ویرانے میں بہار آئی تو ہمارے لیے پھولوں کی بجائے تاج لائی۔ یعنی ہماری موعودہ پروموشن کا حکم آگیا اور ہم میجر بن گئے۔ کندھوں پر میجری لگا کر دیکھی تو محسوس ہوا

○ زمانۂ جنگ میں جاپان کے مشہور وزیر اعظم۔

کا وزن بڑھ گیا ہے۔ آپ کسی تازہ میجر سے پُوچھیں۔ پرموشن کی آج کل بھی یہی تاثیر ہے اور ہمیں میجری کا نشہ کچھ اس لیے بھی گہرا محسوس ہُوا کہ ہمارے تین ماتحت کپتانوں میں سے دو انگریز تھے۔ وہی انگریز جن کی مُلازمت کرتے کرتے ہم نے لاکھوں کے بول سہے تھے۔ یُوں تو جنگ انگریز کی تھی۔ ہم دیسی اُن کے سینئر ہو کر لڑتے یا جونیئر ہو کر، بہرحال اُن کی خاطر ہی لڑ رہے تھے لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ انگریز افسروں کو چاروں شانے ماتحت پایا اور اُنہیں سیلوٹ کرتے اور یَس سر کہتے سُنا تو وطن کی غلامی کا کچھ غم ہلکا ہو گیا۔ جی تو چاہتا کہ ان سے کوئی ٹھوس سا قصور سرزد ہو تو انہیں سزا دے کر تھوڑا سا جلیانوالا کا بدلہ بھی لیا جائے لیکن انگریز کم بخت اتنا اچھا حاکم نہیں جتنا اچھا ماتحت ہے۔ ایسی بے عیبی سے ماتحتی کرتا ہے کہ انتقام لینے کی بجائے انعام دینے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ انگریز ماتحتوں سے ہمارے تعلقات چار و ناچار دوستانہ ہی رہے۔

ہمارا تیسرا ماتحت ایک دیسی کپتان تھا لیکن اس قدر پیارا رفیق ثابت ہوا کہ ہمارے باہمی رشتے سے افسری ماتحتی خارج ہو گئی۔ یہ تھا رام لعل گڈھوک ○۔ خوش طبع۔ وجیہہ۔ رنگین آفریں اور شریر۔ مجھ سے پہلی مرتبہ برماہی میں ملا۔ ایک کپتان میں اتنے اوصاف کا جمگھٹا دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ آخر یہ کہاں کی مٹی ہے اور پُوچھا تو وہیں کا نکلا جہاں کا ہونا چاہیے تھا یعنی چکوال کا۔ یُوں بھی خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا تھا۔ رام لعل ایک بالکل رنگین دیوتا نکل پڑا۔ میس کی زندگی پہلے ہی پھُولوں سے عبارت تھی، رام لعل کی زندہ دلی نے اسے مسلسل پھلجھڑی بنا دیا۔ کبھی کبھی یہ پھلجھڑی پوری آتشبازی کی شکل اختیار کر لیتی مثلاً جب کبھی تمام ہندوستانی افسر میس میں مل کر انگریزوں کو سُنانے اور ستانے کے لیے "بُرا کی لونڈیا" کا کورس گاتے تو کیپٹن ◒

○ تقسیمِ مُلک کے بعد اِن سے رشتہ کٹ گیا۔ معلوم نہیں آج کل کیا اور کہاں ہیں۔

◒ آج کل لفٹیننٹ کرنل محمد امین آرمی سروس کور۔

مُٹھا ایمن کی سربراہی میں وہ اُودھم مچاتے کہ انگریزوں کو اپنی ہندوستانی ایمپائر کی بُنیادیں ہلتی نظر آتیں اور وہ چار و ناچار ہمارے کورس میں شامل ہو کر چلّانے لگتے :

”گلٹی ہے چہرے پر مٹی تالاب کی“

یا جب کبھی میجر شنگھارا سنگھ○ پنجابی میں گوندھی ہوئی انگریزی میں حالاتِ حاضرہ پر لیکچر دیتے۔ اُن دنوں کیبنٹ مشن دلی آیا ہوا تھا۔ اِس سلسلے کے ایک لیکچر میں آپ نے راجہ غضنفر علی خاں اور لارڈ پیتھک لارنس کا ذکر کرنا تھا۔ اِن ناموں کے تلفظ کے متعلق لیکچر سے پہلے اس خاکسار سے مشورہ کرنے آئے۔ آپ غضنفر کو خنفر بر وزنِ تنفر ادا کرتے تھے۔ مَیں نے اِسی تلفظ کی پُر زور تائید کر دی اور کہا کہ اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں۔ پیتھک لارنس وہ صحیح طور پر ادا کرتے تھے لیکن مَیں نے مشورہ دیا کہ آپ پتھیٹک⊝ لارنس کہیں تو گرامر کی رُو سے زیادہ صحیح ہوگا۔

سردار صاحب دام میں آگئے۔ سینکڑوں دیسی اور انگریز افسروں کے سامنے نہایت خود اعتمادی سے غلط تلفظ دُہرانے لگے۔ پہلی مرتبہ سامعین ذرا مُسکرائے لیکن سمجھے کہ شاید سردار صاحب کی زبان کی لغزش ہے مگر جب فاضل مقرر نے خنفر علی خاں اور پتھیٹک لارنس کی بوچھاڑ شروع کر دی تو پتہ چلا کہ سردار صاحب کی زبان نہیں، دماغ لغزش کر رہا ہے۔ پھر شنگھارا سنگھ کا اندازِ خطابت! معلوم ہوتا تھا انگریزی میں بانی پڑھ رہے ہیں۔ سُننے والے ہنس ہنس کر بے حال ہونے لگے۔ چند ایک نے ہمت کر کے سردار جی کے تلفظ کی اصلاح کی کوشش کی لیکن شنگھارا سنگھ نے اپنے اصلاح کنندوں پر حقارت سے ہنستے ہُوئے ہمیں آنکھ ماری اور اپنے معترضین کو ڈپٹ کر کہا:

○ یہ نام ہم لوگوں کا دیا ہُوا تھا۔ آپ کا اصلی نام کچھ اور تھا۔

⊝ PATHETIC بمعنی قابلِ رحم

"پسترو۔ پہلے گرامر پڑھ کر آؤ۔ پھر غلطی نکالنا۔"

اور اپنا لیکچر جاری رکھا۔

لیکن میمیو اور مانڈلے کی گیتوں بھری کہانی میں گڈھوک۔ ایمن اور شنگھارا سنگھ کے علاوہ چند اور مشاہیر کا حصّہ بھی تھا۔ مثلاً

——— لفٹیننٹ ریاض احمد خاں ○ افسر کمانڈنگ سپلائی ڈپو مانڈلے جو برمی بادشاہوں کے بعد قلعہ مانڈلے کے پہلے شاہی قسم کے مکین تھے۔ آپ کے دربار میں اور دسترخوان پر صلائے عام تھی لیکن آپ کی نازک مزاج جیپ مسمّاۃ رانی (جو برما کی جیپوں میں فسٹ لیڈی سمجھی جاتی تھی) آپ کے سوا صرف ایک اور بارِ لطیف کی متحمل ہو سکتی تھی۔ وہ بارِ لطیف بتدریج بیگم ریاض کی شکل اختیار کر گیا۔

——— لفٹیننٹ عصمت اللہ ⊖ چوہدری جن کی موجودگی میں کسی محفل، گاؤں یا قریے کا بے رونق رہنا ناممکن تھا۔ آپ کو بیوقوف ڈھونڈنے اور بیوقوف بنانے میں الہامی دسترس تھی۔ حتیٰ کہ آپ نے شوخ و شنگ گڈھوک کے دل پر بھی چرکہ لگا کے چھوڑا لیکن ان چرکوں ہی سے تو برما کی محفلیں رنگین تھیں۔

——— میجر چندرا (وٹرنری کور) میرے شریف رُوم میٹ تھے مگر ایک اوباش کتے مستی پیٹر کے مالک تھے۔ چندرا خود ہُوبہُو بیٹی قسم کے آدمی تھے لیکن پیٹر کے معاشقے زبان زدِ میمیو تھے۔ پیٹر صبح و شام رفیقۂ حیات کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور دُوسرے کُتّوں اور ان کے مالکوں کے امن میں مخل ہوتا۔ لیکن جب ہمسایوں کے گلوں سے تنگ آ کر چندرا پیٹر کو سرزنش کرتا تو بے چارا خاموشی سے سر جھکائے مالک کی تلخ ترش باتیں سُنتا رہتا۔ آخر جھاڑ ختم ہو چکتی تو

○ بعد میں میجر ریاض احمد خان اے سی ایس۔

⊖ اب لفٹیننٹ کرنل عصمت اللہ چوہدری اے۔ ایس۔ سی

آنکھ کھولتا اور صبر و رضا کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھتا۔ گویا کہتا ہو:

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

اور پھر اوّلین فرصت میں چند راسے آنکھ بچا کر شہر میں عشق کرنے نکل جاتا۔

اور آخر میں قبلہ و کعبہ لفٹیننٹ کرنل سید حیدر علی گردیزی ⊙ کمان افسر فیلڈ ایمبولنس کلاء جو برما کمانڈ کے ہر ہندوستانی افسر کو تعارف سے پہلے ہی دل میں جگہ دے دیتے تھے۔ یونٹ کے لوگ آپ کو کمان افسر سے زیادہ پیرو مرشد سمجھتے تھے۔ آپ اکثر ملتانی زبان میں کلام کرتے جو ہمیں انگریزی کی طرح مشکل لگتی اور کبھی انگریزی برتتے تو اس کی ملتانی بنا دیتے اور اپنے انگریز سامعین کو مستقل طور پر ہراساں رکھتے۔ آپ کی ہر بات اور ہر حرکت میں تفریح کا پہلو تھا لیکن بھولے پن کا یہ عالم کہ ہنسی کی بجائے پیار آتا۔ دل کے اتنے صاف جیسے معصوم بچہ اور مزاج کے ایسے شیریں جیسے نادار دوشیزہ۔ جو دیسی یا بدیسی افسر ایک مرتبہ آپ سے مل لیتا آپ کا مدح سرا ہو جاتا۔ لیکن

کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوسِ بریں

ہمارا برما کا قیام ڈیڑھ سال کا تھا جو گویا ڈیڑھ لمحے میں گزر گیا اور اچانک ہمارا تبادلہ فرنٹیر کور میں پشاور ہو گیا۔ پارٹیوں کے ایک ناگزیر سلسلے سے گراں شکم مگر سرخرو نکلے اور آخر میمیو کو الوداع کہی۔ میمیو سے رنگون تک جیپ میں سفر کیا اور دیکھا کہ ہمارے قیام کے دوران برما کے بیشتار زخم بھر آئے ہیں۔ سر راہ برمی بچوں کو دیکھا تو ان کے گالوں میں انگارے تھے۔ جوان مٹیاروں کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں تارے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف لہلہاتے دھانوں کے کھیت دھوپ میں یوں جھلملا رہے تھے جیسے بزازِ فطرت نے حدِ نگاہ تک سبز ساٹن کے تھان کھول رکھے ہوں۔ ہم نے دل ہی دل میں رو بصحت برما سے کہا کہ شاید تجھے احساس ہو یا نہیں مگر

ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

⊙ آج کل کموڈور (بریگیڈیئر) سرجن جنرل پاکستان نیوی۔

۲۱

برما سے پاکستان براہِ مدراس

رنگون سے بحری جہاز میں سوار ہوئے اور ایک مختصر سے سفر کے بعد مدراس کے ساحل پر اُترے۔ بظاہر تو ایک غیر ملک سے وطن کو لوٹے تھے لیکن وطن کا یہ حصہ برما سے کم اجنبی نہ تھا۔ برما کی زبان کا صوتی حلیہ "چوہ۔ پوہ۔ اُدئی۔ توُئی۔ کھ۔ پھ" تھا اور تامل کا "گرگرم۔ ینگلم۔ ٹنگا۔ پٹنگا۔ اِتے۔ پلے۔" گویا دونوں زبانیں ہماری اُردو یا پنجابی آوازوں سے تقریباً دو ہزار کالے کوس دُور تھیں لیکن غنیمت تھا کہ مدراس اور بنگلور کے ہفت روزہ قیام میں جن لوگوں سے واسطہ پڑا یعنی ہوٹل کے بیرے وغیرہ سب انگریزی بولتے تھے، اگرچہ عجیب غیر جانبدارانہ انداز میں۔ مثلاً ہوٹل سے باہر جانے لگے تو بیرا بولا:

"ماسٹر، کس وقت آئے گا؟"

ہم نے کہا: "کونسا ماسٹر؟"

بولا: "ماسٹر" اور "ماس" پر ادب سے زور دیا۔

ہم سمجھے خدا جانے کس بلا کا ذکر کر رہا ہے۔ ہم نے لاپرواہی سے کہہ دیا "ماسٹر واسٹر نہیں آئے گا۔"

سلام کر کے چلا گیا۔ جب واپس آئے تو بیرا غیر حاضر پایا۔ اگلی صبح غیر حاضری کی وجہ

پُوچھی تو بولا:

"ماسٹر نے خود ہی تو کہا تھا کہ نہیں آئے گا!"

ہمیں اب معلوم ہُوا کہ کمبخت مارے ادب کے ہمارے لیے صیغۂ حاضر کی بجائے غائب اِستعمال کر رہا ہے اور یہ کہ ماسٹر سے مُراد ہم خود ہی ہیں لیکن وہ سکول والے ماسٹر نہیں بلکہ آقائے ولی نعمت قسم کے۔ ہمیں انگریزی زبان کی کم مائیگی پر رحم آیا کہ بڑی مہذّب اور شائستہ بنی پھرتی ہے لیکن کسی کو تعظیم سے مخاطب ہی نہیں کیا جا سکتا اور اپنی اُردو پر پیار آیا۔ جس نے لفظ 'آپ' ایجاد کر کے بے ادبی کا قلع قمع کر دیا ہے۔ خواہ ظلِّ سبحانی ہی کیوں نہ مخاطب ہوں، بالمشافہ گفتگو ہو سکتی ہے۔ غالباً مغربی زبانوں میں 'آپ' کے مقابلے میں کچھ نہیں۔

چنانچہ ہمارا مدراس کا قیام نہ تو گرامر کی رُو سے خوشگوار تھا نہ عام بود و باش کے اعتبار سے۔ مثلاً راہ چلتے ہُوئے آپ کو ایک معزز آدمی سُوٹ ٹائی پہنے ہُوئے مِلتا ہے لیکن نیچے پاؤں سے ننگا ہے۔ آپ اِس بے ربطی پر حیران ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ مسخرہ کون ہو سکتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ موصوف مسخرے نہیں ہائی کورٹ کے جج ہیں اور اگر آپ بڑھ کر اُن سے اسمِ گرامی پُوچھتے ہیں تو حضور فرماتے ہیں:

"یم۔ یَف۔ یندرم"۔ اگرچہ حقیقت میں ہز لارڈ شپ کا مطلب ہے ایم۔ الف۔ اِندرم!" ع

تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اور اندازِ گفتگو یہ ہے کہ مدراس میں الف اگر کسی لفظ کے شروع میں آنے کی گستاخی کرے تو اُسے ی بنا دیا جاتا ہے۔ ہمیں مدراس اور بنگلور میں کوئی ہفتہ بھر ہنس کر یا رو کر گزارنا تھا وہ گزارا اور آخر ۳۰ مارچ ۱۹۴۷ء کو پشاور کے اسٹیشن پر فرنٹیئر میل سے اُترے۔ معاً ہمیں چھ سال پہلے کا پشاور آنا یاد آیا۔ اُس وقت ہم کچی کلی کی مانند دو دن کے

نرم و نازک سے نیم لفٹین تھے اور اپنے انگریز استقبال کنندوں کی سرد مہری سے کُملا سے گئے تھے لیکن اب ہم میجر تھے اور خیال تھا کہ ذرا فرانٹ بھی ہیں۔ آخر دو محاذوں پر جنگ لڑ کر آئے تھے۔ چھاتی پر اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے تمغوں کی پُوری ڈیڑھ قطار تھی۔ انگریزوں میں رہ کر انگریزی عادات اور خرافات پر بھی اب خاصا عبور تھا۔ استقبال کے لیے اِس دفعہ بھی ایک انگریز میجر آیا لیکن ہمیں محسوس تک نہ ہُوا کہ گورا ہے یا کالا۔ منٹوں میں ہیلو اولڈ بوائے سے گزر کر چند ناقابلِ تحریر کلمات سے تعارف کی منزلیں طے کر ڈالیں اور جب سروز ہوٹل میں ایک کمرے میں اپنا سامان اُتارا تو میجر مور ہمارے بے تکلف یار تھے۔

دُوسرے روز یُونٹ میں جانے کا ہمارا پہلا دن تھا۔ ہمارے ایما پر دھوبی نے ہماری وردی کو اکڑایا، بیرے نے بٹنوں کو چمکایا، ہم نے سینے کو پُھلایا، ٹھوڑی کو اُٹھایا، جسم کو چمکایا اور اپنے نئے یُونٹ کو روانہ ہُوئے۔ ہمیں خیال تھا کہ یُونٹ کے دروازے پر کوارٹر گارڈ ہوگی۔ ہم بحیثیت فیلڈ افسر اس کی سلامی لیں گے اور کور کمانڈر صاحب سے ملاقات ہوگی لیکن جہاں ہمارے رہنما نے کار روکی وہاں کوارٹر گارڈ کا نشان تک نہ تھا بلکہ مجلسِ قانون ساز کی عمارت تھی۔ اتنے میں ایک مزری پوش جوان آگے بڑھا اور کار کا دروازہ کھول کر بولا:

"پہ خیر راغلے": (خوش آمدید)

ہم نے کہا: "ہم یہاں نہیں آئے۔ ہمیں فرنٹیئر کور جانا ہے۔"

بولا: "ہُم دغہ دے": (وہ یہی تو ہے)

حیرت ہُوئی کہ اتنے بڑے ہیڈ کوارٹر کے لوازمات کیا ہُوئے؟ نہ کوارٹر گارڈ ہے، نہ سنتری، نہ اٹین شن، نہ سلیوٹ، یہ کیسی فرنٹیئر کور ہے؟ آگے دفتر کے اندر گئے تو سب فوجی افسر سُوٹ پہنے، ٹائیاں لگائے بیٹھے تھے۔ گویا اسمبلی کے ممبر ہیں۔ ہمیں دیکھا تو سب نے ایک متحدہ قہقہہ لگایا اور میجر مور جو اُن میں سے ایک تھے، ہمیں مخاطب کرتے ہُوئے پریڈ گراؤنڈ کے

انداز میں بلند آواز سے بولے:

"سٹینڈ ایٹ ایز۔ سٹینڈ ایزی۔"

جواباً ہم نے صبح کا رُکا ہُوا سانس خارج کیا۔ ٹھوڑی کو حسبِ منشا لٹکنے کی اجازت دی۔ شکم کو حدِ امکان تک پھیلنے کی رُخصت دی اور اُن کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔ معلوم ہُوا کہ فرنٹیئر کور کا ہیڈ کوارٹر سفید پوشوں کا ادارہ ہے۔ وردی صرف قبائلی علاقے میں سکاؤٹ اور ملیشیا کے یونٹوں میں پہنی جاتی ہے۔ ہیڈ کوارٹر فقط چار پانچ افسروں پر مشتمل تھا جن کے دفتر کے لیے صوبائی ○ اسمبلی کی عمارت سے تین چار کمرے اُدھار پر لیے گئے تھے۔

اُس زمانے میں فرنٹیئر کور پر انگریز افسر قابض تھے۔ دیسی افسر کوئی ایک آدھ ہی لیا جاتا تھا اور بہزار مشکل سے۔ بلکہ انگریز بھی خاندانی واسطوں اور پُرانے افسروں کی سفارش پر لیے جاتے تھے لیکن ایک دفعہ لیے جانے کے بعد بقول شخصے لاٹ کے بچے بن جاتے تھے اور باقی افسروں کو عوام سمجھنے لگتے تھے۔ اس کی وجہ محض یہی نہیں تھی کہ یہاں آ کر تنخواہ میں تین چار سو روپے کا اضافہ ہو جاتا تھا بلکہ قبائلی معرکوں کے انگریز نامہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے سکاؤٹ اور ملیشیا کی زندگی کو ایک گہرا افسانوی رنگ دے رکھا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ جب پیچھے ہوم کو کھائبر پاس (درّہ خیبر) شہوزنگی، فقیر ایپی اور دُوسری قبائلی جنگوں کے اصلی اور فرضی قصّے لکھ کر بھیجتے تو انگریز مائیں اور معشوقائیں سمجھتیں کہ بیٹا یا محبوب لارنس آف فرنٹیئر ہو گیا ہے اور یہ مغالطہ خود انگریز افسروں کو بھی خاصا موافق آتا۔

ویسے قبائلی سنگستانوں کی زندگی میں کسی قدر رُومان اور افسانے کا شائبہ بھی تھا۔ چنانچہ جب ہم نے اپنے تقرر کے کاغذات پیش کیے تو ہمیں اپنی خوش نصیبی سے بالتفصیل آگاہ کیا

○ یہ دو سال بعد کی بات ہے کہ فرنٹیئر کور کا دفتر بالا حصار میں منتقل ہوا جہاں ہم پہلے آبادکاروں میں سے تھے۔

گیا۔ یُوں جیسے ٹونی آرمسٹرانگ کی طرح ہمارا بھی شاہی خاندان میں رشتہ ہو گیا ہو۔

کرنل ہیریسن کو تو یقین ہی نہ آتا تھا کہ کسی اُدھر کے اشارے کے بغیر ہمیں فرنٹیئر کور کے قابل سمجھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ رہ نہ سکا تو ہم سے رازدارانہ لہجے میں پُوچھنے لگا۔

"یہ گھپلا کیسے لگا؟"

اب ہم فرنٹیئر کور میں آئے تو اس وجہ سے تھے کہ اس اسامی پر بہر طور کسی دیسی کو ہی آنا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دیسی ہم نکلے لیکن کرنل ہیریسن کے جواب میں ہمارے سامنے گپ لگانے کے لیئے لامحدود میدان تھا۔ ہم نے سنجیدگی سے کہا:

"مجھے خود سمجھ نہیں آتی سوائے اِس کے کہ برما میں لارڈ مونٹ بیٹن سے ایک ملاقات میں فرنٹیئر کور کا ذِکر آیا تھا۔"

ہمارا یہ کہنا تھا کہ کرنل صاحب جھٹ بول اُٹھے:

○

"THAT IS IT"

بھولے کرنل صاحب! مونٹ بیٹن سے ملنا تو درکنار، ساری جنگ میں ہمارا اور مونٹ بیٹن کا درمیانی فاصلہ کبھی تین سو میل سے کم ہی نہ رہا تھا لیکن اب حکایت شروع ہو چکی تھی اور ہم سے ملاقات کی تفصیل کے لیے اصرار کیا جا رہا تھا چنانچہ ہم نے مناسب کسرِ نفسی مگر خاصے نامناسب مبالغے کے ساتھ ایک دلکش سا افسانہ پیش کیا۔ مونٹ بیٹن کے ساتھ بے تکلفی کا قصّہ سُنا تو انگریز سامعین سہم سے گئے۔ گویا کہہ رہے ہوں:

کہ یہ ٹوٹا ہُوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

قصّہ مختصر دفتر بند ہونے سے پہلے ہمیں نہ صرف فرنٹیئر کور کی برادری میں لے لیا گیا بلکہ ہماری اچھّی خاصی دستار بندی بھی کر دی گئی۔

○ یہی تو بات ہے۔

دوسرے روز بریگیڈیئر ایبروز (انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کور) سے ملاقات ہوئی۔ انگریز دورے کو کامیابی کی کنجی سمجھتا ہے۔ حسبِ توقع ہمیں حکم ملا کہ کام شروع کرنے سے پہلے تمام ملیشیا اور سکاؤٹ یونٹوں کا دورہ کرلو، پھر کام شروع کرنا۔

اِس چھوٹے سے حکم کی تعمیل خاصی طویل اور ثقیل تھی یعنی قبائلی علاقے کے طول و عرض میں کوئی تین ہزار میل کا جالا بننا تھا۔ اِس وقت فرنٹیئر کور میں آٹھ دس یونٹ تھے جو شمال میں گلگت سے لے کر جنوب میں چمن تک بکھرے پڑے تھے۔ اگر پی آئی اے کے نقشہ ساز ہمارے سفر کا نقشہ دیکھ لیں تو رشک کے مارے اپنے ڈیسک پر ہی کریش (CRASH) ہو جائیں

اِس سفر میں چند روایتی صعوبتیں ضرور تھیں لیکن قبائلی تواضع اور کیپٹن مومن شاہ کی رفاقت نے انہیں سر نہ اٹھانے دیا۔ مومن شاہ ہمارے نائب تھے۔ قد کے چھوٹے ہونے کے بعد ذرا اور بھی چھوٹے تھے۔ یہی کوئی پانچ فٹ صفر انچ۔ لیکن دل کے بڑے ڈبل پٹھان تھے۔ یعنی وہ چند خوبیاں جو اور پٹھانوں میں فرداً فرداً ملتی ہیں ان میں یکجا تھیں۔ شریف مگر غصیل، مہمان نواز مگر تشنۂ انتقام، جاں نثار مگر زود رنج۔ اِن خالص پختون علامات کے علاوہ ایک عادت بہادر سکھ دوستوں سے بھی مستعار لی تھی۔ یعنی کوئی کام ہو مستعدی سے کر ڈالتے تھے اور پھر آرام سے سوچتے رہتے تھے کہ کیسے کرنا چاہیے تھا۔

ایک دفعہ آپ سلیکشن بورڈ کے سامنے گئے۔ آپ کو دیوار "الف" سے دیوار "ب" پر دو زینوں کی مدد سے زمین کو چھوئے بغیر پہنچنا تھا۔ کوئی سترہ فٹ کا فاصلہ تھا اور زینوں کے استعمال میں تھوڑی سی چالاکی درکار تھی۔ اب سیدھے سادے پٹھان کو چالاکیوں سے کیا واسطہ؟ آپ نے اللہ کا نام لیا اور دیوار "الف" سے براہِ راست دیوار "ب" کے لیے چھلانگ لگا دی۔ بعد میں اگر آپ کی ٹانگوں کو کوئی آنچ نہ آئی تو یہ آپ کا قصور نہ تھا۔ یہ پٹھان ٹانگوں کا عدم تعاون تھا۔ ہفتہ گزر چکا تو کہنے لگے:

"یارا، وہ زینہ دُوسرے زینے میں پھنسا لیتا تو سیڑھی سیڑھی دیوار "ب" تک پہنچ سکتا تھا۔"

آپ کا ہفتے کے بعد بھی اِتنا سوچنا غنیمت تھا۔ کیونکہ عام حالات میں آپ کی دو سوچوں کے درمیان خاصا طویل وقفہ ہوتا تھا ___ لیکن کیپٹن مومن شاہ کی یہی سادگی اور صاف باطنی ہی تو تھی جس نے ہمارا دل موہ لیا۔ وہ نہ صرف اپنی خوبیوں بلکہ خامیوں کی وجہ سے بھی پیارے لگتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ہمارے خانۂ دل کے مکین تھے اور آج تک وہیں رہتے ہیں۔

دَورے کی اِبتداء لنڈی کوتل سے کی۔ جاتے ہُوئے درّۂ خیبر سے گزرے جس سے ہمارا پہلے بھی تعارف تھا لیکن گزشتہ چھ سالوں میں درۂ خیبر نے جنگ کی اِس قدر تیاری کر لی تھی کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ سڑک پر جا بجا روڈ بلاک رکھے تھے۔ نیچے نالے میں ٹینکوں کی رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ یوں جیسے کنکریٹ کی کھمبیاں اُگ آئی ہوں۔ اب تو سچ مچ درۂ خیبر سے گھٹا چھن کر نکلتی تھی اور ہوا ٹھر ّا کے چلتی تھی۔ لیکن ہمارا مُعاملہ ہوا سے ذرا مختلف تھا۔ ہم فرنٹیئر کور کے افسر تھے اور درۂ خیبر کے سگے رکھوالے، سو بے باکانہ سینہ اُبھار کر چلے۔

لنڈی کوتل پہنچے تو جس کوارٹر گارڈ کے معائنے اور سلامی کا انتظار یا اشتیاق تھا، موجود پائی۔ فارغ ہوئے تو انگریز کرنل سے تبادلۂ خیالات ہُوا اور محسوس ہُوا کہ جب اُس نے ہمیں چائے پیش کی تو خود خُون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ کیونکہ فرنٹیئر کور میں دو دیسی افسروں کے آنے کا یہ مطلب تھا کہ سلطنتِ برطانیہ کے کم از کم دو سو مربع میل پر سُورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہے ○۔ کیپٹن مومن شاہ نے تو کرنل صاحب سے یہ سوال بھی پُوچھ لیا کہ "کرنیل صاحب آپ اپنا فیملی ولایت کب نیچے (بھیجے) گا۔ اِدھر تو اب گرمی آنے والا ہے" ___ اُس

○ انگریزوں کا خوف بالکل بجا تھا۔ پانچ ماہ بعد ہی پاکستان وجود میں آگیا اور انگریز افسر یا تو رخصت ہو گئے یا ہمارے خانہ زادوں میں شمار ہونے لگے۔

وقت اگر کوئی کرنل صاحب کو تھرمامیٹر لگاتا تو تھرمامیٹر کھول اُٹھتا۔ کرنل صاحب کی گرمیاں آچکی تھیں!

لنڈی کوتل سے پاراچنار گئے۔ کوہاٹ اور ٹھل کے سنگستان سے گزر کر دریائے کُرم کی وادی میں داخل ہوئے تو ہم پر اس مقام کا راز کھلا جہاں اقبال حسنِ بے پروا کو بے حجاب دیکھ کر اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ ہوں اگر شہروں سے بَن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟ پاراچنار کا حسن کشمیر سے بھی زیادہ بے آلائش ہے۔ ہم نے پورے تین دن کُرم ملیشیا اور اس کے کاروبار کا جائزہ لیا۔ آخر دورے کا بھی کچھ مقصد تھا۔ لیکن وہاں سے رخصت ہوئے تو حاصلِ دورہ کُرم ملیشیا کے اعداد و شمار نہ تھے بلکہ رُخِ پاراچنار کے نقش و نگار، جو آج تک ذہن سے محو نہیں ہو سکے۔

پاراچنار سے سنگینوں کے سائے میں بنّوں اور میر علی کے راستے میراں شاہ پہنچے۔ یہ وہی میراں شاہ تھا جہاں سے ہم نے چھ سال پہلے جنگی زندگی کی ابتداء کی تھی یا انگریزوں نے کرائی تھی کہ ایک دُوسرا انگریز پشاور جا کر برج کھیل سکے۔ اُس وقت ہم نیم لفٹین تھے اور عالی دماغ میراں شاہ کو ہماری آمد و رفت کا احساس تک نہ تھا۔ اب میراں شاہ کے قلعے میں قدم رکھا تو ٹوچی سکاؤٹس کے کمان افسر کرنل سینڈیمن خود خیر مقدم کو آئے اور میراں شاہ نے تو گویا اپنا اعمال نامہ کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور ہم نے بکمال فیاضی اُس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے۔

قبائلی سرداروں کو ہماری آمد کا علم ہوا تو ہم تواضع کے ہاتھوں محصور سے ہو گئے۔ وہ صوبیدار میجر سے لے کر سپاہیوں تک کی طرف سے دعوتیں وہ پیٹ بھر جانے پر ہمارا مزید کھانے سے انکار اور میزبان کا فقط ایک سالم دُنبہ اور کھلانے پر اصرار وہ رات کو جوانوں کا بلبلہ○

○ بلبلہ پشتو میں رقص و سرود کی محفل کو کہتے ہیں۔

اور دن کو زبانوں کا زلزلہ۔○

______ دُوسرے روز دفتر میں کرنل صاحب سے تعلیمی معاملات پر بحث ہُوئی تو ہمارے علم و فن سے بہت مرعوب ہوئے۔ لنچ کے وقت مَیس میں شکار کا ذکر چل نکلا تو مختلف پرندوں کے نام لیے جانے لگے۔ اس ضمن میں کرنل سینڈلین ایک پرندے کا اُردو نام پوچھ بیٹھے جسے انگریزی میں بسٹرڈ (BUSTARD) کہتے ہیں۔ اس خاکسار کا علم و فن جواب دے گیا اور لاعلمی کا اظہار کرنے والا ہی تھا کہ مومن شاہ نہایت آرام سے کسی قدر عالمانہ انداز میں بولے:

"اُردو میں اسے ناجائز اولاد کہتے ہیں۔"

کرنل سینڈلین اُردُو سے خاصے آشنا تھے۔ ہماری سخن فہمی اُن پر آشکارا ہُوئی تو مضمون بدل کر موسم کی بات کرنے لگے۔ حسبِ معمول کوئی مہینہ بھر بعد کیپٹن مومن شاہ ہنس کر کہنے لگے۔

"یارا، وہ بسٹرڈ کے معنی ٹھیک (ٹھیک) نہیں تھے۔ یہ داؤس تو پرندہ ہوتا ہے۔"

میراں شاہ کے بعد ہماری منزل جنڈولہ تھی۔ پہنچے تو شام کا وقت تھا۔ شام کے دھندلکے میں جنوبی وزیرستان کے کوہ و دمن خیبر سے بھی زیادہ دلکش نظر آتے ہیں۔ وہی عظمت اور وہی شانِ دلآویزی، لیکن بہت بڑے پیمانے پر۔ ہمارے دل نے اس کشش کی شدّت محسوس کی۔ جنڈولہ کے قلعے میں داخل ہُوئے تو اس کے وسیع صحن میں سبز گھاس پر دس بارہ انگریز افسر بلیس بائیس مختلف النسل کُتّوں کے دائرے میں آرام کرسیوں پر بیٹھے پی رہے تھے۔ ہمیں داخل ہوتے دیکھا تو خیر مقدم کے لیے ہماری طرف بڑھے۔ انگریز نہیں کُتّے! اور گرم جوشی مگر خاموشی سے ہمیں خوش آمدید کہا ______ اچھے انگریز اپنے کُتّوں کو بھونکتا دیکھیں تو انہیں جنگلی

○ ہمارے کان پیشتر سے تازہ تازہ آشنا ہو رہے تھے۔

سکتے ہیں اور اچھے کُتّے اِس نکتے سے آشنا ہیں۔ لہٰذا اوّل تو بھونکتے ہی نہیں اور ایمرجنسی میں کچھ کرنا ہی پڑے تو بقولِ پطرس ہلکی سی بُخ بُخ کر دیتے ہیں۔

انگریزوں کے قریب پہنچے تو انہیں اپنے کُتّوں سے بھی زیادہ کم گو پایا لیکن اُن کی کم گوئی تہذیب کا تقاضا نہ تھا بلکہ جلاپے کا اظہار تھا۔ اس قلعے میں آج تک کوئی غیر انگریز داخل نہیں ہُوا تھا سوائے اس کے کہ بیرا ہو یا اردلی۔ اور آج یہ مقدس روایت جنڈولہ کی نرم و نازک گھاس کے ساتھ پامال ہو رہی تھی۔ ایک انگریز میجر نے بعد مُشکل کیپٹن مومن شاہ کو پشتو میں کچھ کہنے کی زحمت گوارا کی کہ اپنے بیروں خانساموں سے بولنے کا یہی انگریزی دستور تھا۔ کیپٹن مومن شاہ نے نہایت شُستہ انگریزی میں جواب دیا:

○ "WOULD YOU MIND SAYING THE SAMETHING IN ENGLISH?

YOUR PUSHTO IS A LITTLE TOO GOOD FOR ME"

طوطے اُڑنے کا محاورہ سُن رکھا تھا۔ آج ہم نے سچ مُچ طوطے اُڑتے دیکھے۔ انگریزی طوطے! اس کے بعد انگریزوں نے ہم پر حسبِ توقع دانت تو پیسے لیکن ادب اور قرینے سے۔

جنوبی وزیرستان کے قبائلی جوانوں کو جب علم ہُوا کہ دیسی مسلمان افسر آئے ہُوئے ہیں تو ہمیں مِلنے کے لیے بے تاب ہونے لگے۔ ہم نے یہ تقریب دُوسرے روز نمازِ جُمعہ تک اٹھا رکھی اور جب سکاؤٹوں کی مسجد میں گئے تو سینکڑوں صحت مند اور کسرتی سکاؤٹوں کی شوخیٔ معانقہ کے بعد پسلیاں نقشِ فریادی بن کر رہ گئیں۔ اور "جوڑ تکڑا۔ ڈیر تکڑا" کی تکرار سے زبان بَل کھا کر سپیرا کیل کی شکل اختیار کر گئی۔ قبائلی علاقے میں اخوتِ اسلامی کا اظہار اچھا خاصا جسمانی بلکہ پہلوانی معاملہ ہے۔ ملاقات کے جوش و خروش کے بعد جب ان لوگوں کی تعلیم کے متعلق

○ کیا آپ یہی بات انگریزی میں کہنے کی زحمت گوارا کریں گے؟ آپ کی پشتو میری فہم سے ذرا بالاتر ہے۔

اِستفسار کیا تو پتہ چلا کہ وزیرستان کی بارش کی طرح یہاں کی تعلیم کی اوسط بھی کوئی ایک انچ سالانہ کے لگ بھگ ہی ہے۔

الغرض یہی کیفیت ٹروب ملیشیا (فورٹ سنڈے مین) اور پشین سکاؤٹس (ژوب) میں نظر آئی۔ انگریز افسر ناخوش، پٹھان سپاہی خوش۔ علم کی قلت، حِلم کی کثرت، معانقوں کی شدت اور پسلیوں کی شامت لیکن دوسری طرف چترال اور گلگت گئے تو ان لوگوں کا مزاج کسی قدر مختلف پایا۔ یہاں کا درجۂ حرارت اور درجۂ اخوت دونوں مقابلتاً ملائم تھے۔ لوگ بامروّت تھے لیکن مروّت کے اظہار سے ہڈی پسلی پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ چائے یہ بھی پلاتے تھے لیکن بڑی حلیم سی، جو بیشتر زرد رنگ کا بے ضرر سا شیر گرم پانی ہوتا تھا جسے بڑی تواضع سے پیش کرتے تھے۔ وہ درّہ کوہاٹ والا اُبلتا ہُوا سیاہ لاوا نہ تھا جو جناب میزبان ہزار ہیونڈ پالیوں میں کم و بیش ڈنڈے کے زور سے پلاتے تھے۔ ان لوگوں کے چہروں سے خونخواری کی بجائے خاکساری ٹپکتی تھی۔ رہی تعلیم تو وہ یہاں بھی اتنی ہی جو رُتنگڑی تھی جتنی خیبر اور وزیرستان میں۔

آخر سرحد پیمائی ختم ہُوئی تو کوئی مہینہ بھر بعد ہم پشاور لَوٹے۔ اب ہمارا کام فرنٹیئر کور کے ہمہ تن کورے جوانوں کے لیے ایک تعلیمی منصوبہ تیار کرنا تھا۔ حقیقت میں ایسے اہم کام کے لیے تو لارڈ میکالے یا مسٹر شریف کی ضرورت تھی۔ بھلا ہم خاک نشین سپاہیوں کو تعلیمی اصلاحات سے کیا رشتہ؟ لیکن حُکم حاکم تھا اور ہمیں یہ بھی محسوس ہُوا کہ ہماری قابلیت کے مقابلے میں کام اگرچہ مشکل ہے لیکن ہے کرنے کے قابل۔ لہٰذا ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ اُس محنت سے کام لیا جسے شاقہ کہتے ہیں اور قبائلی جوانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اپنا تمام تر زورِ قلم بلکہ خونِ جگر صرف کر کے ایک سکیم بنا ڈالی۔ پھر پُورے جوش اور داجبی خروش کے ساتھ اسے عملی جامہ پہنانا شروع کیا اور نتیجہ یہ رہا کہ تھوڑے ہی دنوں میں ہم خود جامے سے

باہر تھے۔ خوشی سے نہیں، پسینے سے! بالغ کو پڑھانا یوں بھی مشکل کام ہے۔ لیکن بالغ بھی ہو اور پٹھان بھی تو پھر یہ کام کسی مشکل کشا کے بس کا ہی ہوتا ہے۔ ہم یوں تو کچھ نہ تھے لیکن غلام مشکل کشا ضرور تھے۔ اللہ کا نام لیا اور خیبر سے لے کر چمن تک قبائلی سپاہیوں پر درِ علم وا کر دیا۔

یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ہمارے تیار کردہ زیورِ تعلیم نے قبائلی زندگی میں کیا آرائش پیدا کی، ہمارے لیے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن ہماری سکیم آج تک رائج ہے اور کیپٹن مومن شاہ اور ہم کبھی کبھی چپکے سے ایک ناروا سا فخر بھی کر لیتے ہیں کہ شاید

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یہ اور بات ہے کہ جریدۂ عالم کا قبائلی صفحہ کسی کی نظر سے گزرے گا یا نہیں۔ لیکن قاری محترم، اس فخر پر تعلّی کا گمان زنہار نہ کیجیے گا۔ ہم نے زندگی میں اگر کوئی جاندار کارِ خیر کیا ہے تو وہ یہی ہے اور عاقبت میں ہمارے پاس کچھ اثاثہ ہوگا تو یہی سکیم ہوگی۔ گویا یہی ہماری مسدسِ حالی ہے ——— ہاں ایک اجر ہمیں اسی دُنیا میں فوری طور پر بھی مل گیا یعنی پشتو سیکھ لی اور ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہُوا کہ پشتو بولنا بھی کس قدر مقوی ٹانک (TONIC) ہے۔ ھوکنہ؟

اُن دنوں مُلک میں ایک سیاسی انقلاب کروٹ لے رہا تھا۔ قائدِ اعظمؒ اور پنڈت نہرو دِلّی میں لارڈ مونٹ بیٹن سے مِل کر انگریزی راج کا قصّہ تمام کر رہے تھے اور اُڑتی سی خبر تھی کہ مُلک آزاد ہونے والا ہے۔ ادھر اچانک ہمیں حکم ملا کہ ۶ جُون ۱۹۴۷ء کو ریگولر کمیشن کے اِمتحان کے لیے سلیکشن بورڈ میرٹھ کے سامنے حاضر ہو۔ ۳ جُون ۱۹۴۷ء کو رات کی گاڑی سے جانا تھا لیکن معلوم ہوا کہ اُسی روز ہمارے سیاسی رہنما آل انڈیا ریڈیو دلّی سے ایک اہم اعلان کرنے والے ہیں۔ چنانچہ دوپہر سے ہی ریڈیو سے لگ کر بیٹھ گئے۔ پہلے مونٹ بیٹن بولے، پھر پنڈت نہرو اور اُن کے بعد قائدِ اعظمؒ۔ ہم نے ابھی تک قائدِ اعظمؒ کی تقریریں صرف اخباروں میں ہی پڑھی تھیں لیکن آج پہلی مرتبہ اُن کی پُرشکوہ آواز سُنی تو ہمارے سینوں میں توانائی

آنے لگی اور اپنے قائد پر بے حساب فخر محسوس ہُوا۔ لیکن قائد کی آواز سے بھی زیادہ نشاط انگیز وہ مژدہ تھا جو اُن کی تقریر کا موضوع تھا۔ یعنی یہ کہ دو ماہ بعد ۱۴ اگست کو پاکستان قائم ہونے والا تھا۔

اِس ایک پیام سے ہماری تو دُنیا ہی بدل گئی اور فوراً اپنے آپ سے پہلا سوال یہ کیا کہ اب میرٹھ جا کر یعنی ایک غیر ملک میں ریگولر کمیشن لینے کے کیا معنی؟ کیوں نہ پاکستان بن لے اور خالص پاکستانی امتحان میں شرکت کریں، لیکن ہمیں بتایا گیا کہ ابھی دو ماہ تک انگریز کا راج ہے لہٰذا انگریزی امتحان ہی دینا پڑے گا۔ چنانچہ ناچار اسی رات میرٹھ روانہ ہوئے میرٹھ میں امتحان سے فارغ ہو کر پشاور لَوٹے تو اپنے ساتھ ریگولر کمیشن کے علاوہ اپنا پُرانا دوست ٹانسلائٹیس بھی لے آئے۔ دو ہفتے بعد پشاور کے ملٹری ہسپتال سے رُخصت ہونے لگے تو انگریز نرس نے (جس نے چوری چھپے ہمارے خطوط پڑھنے کے علاوہ یاد بھی کر لیے تھے) ہمیں مری میں گرمیاں گزارنے کا مشورہ، حکم اور دھمکی ملا جلا کر دیے اور سٹاف سرجن کے کان میں ایک ایسی چھبتی سی سرگوشی کی کہ غریب نے فی الفور ہمارے لیے چھٹی کی سفارش کر دی اور خود ہفتہ بھر کان میں گلیسرین ڈلواتا رہا ——— چند روز بعد ہم مری میں تھے۔

سیسل ہوٹل مری کا کمرہ نمبر ۲۶ ایک منکسر مزاج سا سنگل کمرہ ہے لیکن ہمارے لیے عظیم تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کمرے میں ہم پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی صبح طلوع ہوئی۔ اِسی کمرے میں ریڈیو پاکستان کا پہلا نشریہ سُنا۔ گویا اسی کمرے میں وطنِ عزیز کی آزادی کی ابتداء ہوئی۔ مگر اسی کمرے میں اپنی آزادی کا خاتمہ بھی ہُوا۔ یعنی وہ خاتون جو اُس شب ہمارے ساتھ شریکِ بزم تھی دُوسرے روز شریکِ حیات بن گئی اور وہ آزادہ رَوِ لفٹین کہ قاہرہ سے لے کر مانڈلے تک عشق کی دسترس سے محفوظ رہا تھا، مری پہنچ کر

اسیرِ اُلفت ہوگیا۔

بڑی مُدّت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا
اور یہاں سے ایک دُوسری داستان کا آغاز ہوتا ہے۔
